نظامِ ربوبیت

پرویز

ادارۂ طلوعِ اسلام کراچی

قرآنک سوشل آرڈر

نظامِ ربوبیت

جو نوعِ انسانی کی مشکلات کا واحد حل ہے

پرویز

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام - کراچی

کتبہ سعید

تعداد ـــ تین ہزار | پرمٹ نمبر ۶۷۱۵ | مورخہ ۱۸ر نومبر سنہ ۱۹۵۴ء

قرآن کی ابتدا

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

سے ہوتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ خدا اس لئے حمد و ستائش کا سزاوار ہے کہ وہ نوعِ انسانی کی پرورش کا ذمہ دار ہے۔ اور

اُس کی انتہا

رَبِّ النَّاسِ۔ مَلِكِ النَّاسِ۔ اِلٰهِ النَّاسِ

پر ہوتی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ قوت و اقتدار بھی اسی خدا کے شایانِ شان ہے جو نوعِ انسانی کی ربوبیت کا ذمہ دار ہے۔

لہٰذا

جو معاشرہ

اپنی نسبت خدا کی طرف کرتا ہے وہ اسی صورت میں درخورِ حمد و ستائش اور سزاوارِ قوت و اقتدار ہو سکتا ہے کہ وہ نوعِ انسانی کی عالمگیر ربوبیت کا کفیل ہو۔

یہ ہے اسلام کی ساری تعلیم کا خلاصہ

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مشمولات

باب چہارم
قرآنی نظریۂ حیات

باب نہم
کشمکش

باب دہم
پس چہ باید کرد

باب یازدہم
حرفِ آخر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر　　سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر
وحیِ حق بینندۂ سودِ ہمہ　　در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ

آپ کسی مسجد کے منبر سے سنیئے یا جلسہ گاہ کی اسٹیج سے۔ ہر مقام اور ہر گوشہ سے یہ آواز آپ کے کانوں میں آئے گی کہ اسلام ایک ایسی تعلیم پیش کرتا ہے جس کی مثال اور نظیر دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ یہ وہ ضابطۂ حیات ہے کہ اگر ساری دُنیا کے مفکرین، سیاسئین اور مصلحین اکٹھے ہو جائیں تو بھی اس جیسا مکمل ضابطۂ حیات مرتب کرنا تو ایک طرف، اس کی کسی ایک شق کی مثال بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ یہ نوعِ انسانی کی تمدنی، معاشرتی، معاشی، سیاسی، اجتماعی اور انفرادی تمام مشکلات کا واحد اور عدیم النظیر حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ (یہ دعویٰ جس کی صداقت میں کوئی کلام نہیں) آپ کو ہر گوشہ سے سنائی دے گا۔ لیکن جب آپ ان حضرات سے پوچھیں گے کہ اسلام کی وہ کونسی تعلیم ہے جو بے مثل و بے نظیر ہے اور جس کی مثال دُنیا بھر کے مفکرین اکٹھے ہو کر بھی پیدا نہیں کر سکتے تو آپ حیران ہوں گے کہ اُن کے ہاں سے اس سوال کا کوئی اطمینان بخش جواب نہیں ملے گا۔ وہ اگر کہیں گے تو زیادہ سے زیادہ یہ کہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جھوٹ نہ بولو۔ چوری نہ کرو۔ بددیانتی نہ کرو۔ بے انصافی نہ کرو۔ کسی پر ظلم نہ کرو۔ کسی کو ستاؤ نہیں۔ ہر ایک سے حسنِ معاملہ اور حسنِ سلوک سے پیش آؤ۔ سب کو بھائی بھائی سمجھو۔ ہر ایک سے ایک جیسا برتاؤ کرو۔ وغیرہ وغیرہ۔ یا دوسری طرف وہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ احکام کے مصالح اور منافع کو سامنے لے آئیں گے۔ سوال یہ ہے کہ جہاں تک اس اخلاقی تعلیم کا تعلق ہے وہ کونسی چیز ہے جو اسلام کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتی؟ یہ اخلاقی تعلیم دُنیا کے تمام مذاہب میں مشترکہ طور پر پائی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ جو لوگ کسی مذہب میں اعتقاد نہیں رکھتے اور خدا کی ہستی تک سے منکر ہیں وہ بھی اس اخلاقی تعلیم کے قائل ہیں۔ وہ بھی یہ نہیں کہتے کہ جھوٹ بولنا اچھا ہے، چوری ضرور کرنی چاہیئے۔ لوگوں کو ستانا اور اُن پر ظلم کرنا قابلِ ستائش ہے۔ بددیانتی قابلِ فخر ہے۔ لہٰذا اگر اسلام کی مابہ الامتیاز تعلیم یہی ضابطۂ اخلاق ہے تو اس سے اس دعوے کی صداقت تو ثابت نہیں ہو سکتی کہ اس کی تعلیم

بے شک و شبہ بے نظیر ہے۔ باقی رہا نماز روزہ وغیرہ کا سوال تو آپ انہیں زیادہ سے زیادہ باقی مذاہب کے طریقِ عبادت اور رسومِ پرستش سے بہتر ثابت کر دیں گے۔ لیکن جب فریقِ مقابل آپ پر یہ اعتراض کریگا کہ ان تمام شعائر کی پابندیوں کے باوجود خود مسلمانوں کی جو حالت ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، تو اس کا آپکے پاس کوئی جواب نہیں ہوگا۔ اگر آپ کچھ کہیں گے تو فقط اتنا کہ انکی دُنیاوی حالت تو بیشک خراب ہے لیکن اس سے اُن کی روحانی ترقی ہوتی ہے اور عاقبت سنورتی ہے۔ اور یہ چیزیں دوسرے مذاہب میں حاصل نہیں ہو سکتیں۔ لیکن یہ وہ دعویٰ ہے جس کا آپ کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکتے۔ روحانی ترقی کسی خارجی معیار سے ماپی نہیں جا سکتی۔ نہ کسی محسوس ترازو سے اس کا وزن کیا جا سکتا ہے۔ دنیا میں ہر مذہب روحانی ترقی کا مدعی ہے اور آپ کے پاس کوئی معیار ایسا نہیں جس سے آپ علیٰ وجہ البصیرت ثابت کر سکیں کہ آپ کے مسلک و مشرب کے مطابق تو روحانی ترقی ہو سکتی ہے اور دیگر مذاہب کی روش پر چلنے سے ایسا نہیں ہو سکتا۔ باقی رہا آخرت کی نجات کا سوال تو اس کا ثابت کرنا روحانی ترقی سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ ہر مذہب اس کا یکساں مدعی ہے اور کوئی مذہب بھی اس کا مرئی اور محسوس ثبوت پیش نہیں کر سکتا۔

(۲)۔ آپ نے غور کیا کہ وہ دعویٰ جسے ہم تمام عمر سُنتے اور دُہراتے رہتے ہیں، ذرا سے غور و فکر کے بعد کس طرح بلا دلیل نظر آنے لگ جاتا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ دعویٰ غلط ہے۔ یہ دعویٰ تو اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے اور اس کے سچا ہونے میں ذرا بھی شک و شبہ نہیں۔ لیکن ہم جن گوشوں میں اسکی صداقت کی دلیل تلاش کرتے ہیں، وہ اسکی دلیل ہم نہیں پہنچا سکتے۔ اسکی دلیل ہمیں کسی دوسرے گوشے سے ملے گی۔

قرآن سے پہلے دُنیا کے تمام مذاہب نے مذہب کا منتہیٰ "روحانی ترقی" اور "اُخروی نجات" قرار دے رکھا تھا۔ دُنیاوی معاملات سے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ انہوں نے زمین کی بادشاہت "قیصر" کے سپرد کر رکھی تھی اور اپنے لئے آسمان کی بادشاہت مخصوص کر لی تھی۔ دنیا اور دنیا والوں کے معاملات ان کی نگاہوں میں اس قدر قابلِ نفرت تھے کہ وہ انکے متعلق بات تک نہیں کرنا چاہتے تھے۔ دنیوی چیزوں کی کشش و جاذبیت اُن کے نزدیک روحانی ترقی کے مانع اور اُخروی نجات کے راستہ میں سنگِ گراں تھی۔ چونکہ روحانی ترقی اور اُخروی نجات کا دعویٰ ایسا تھا جس کیلئے کسی ثبوت کی ضرورت نہ تھی اسلئے ہر مذہب کے پیرو اپنی اپنی جگہ پر مطمئن تھے کہ وہ حق پر ہیں اور باقی سب باطل پر۔ قرآن نے آکر اس تصور میں کیا تبدیلی پیدا کی، اسکا ذکر فوراً بعد میں آئے گا۔ لیکن مسلمانوں نے قرآن کو عملاً چھوڑ دینے کے بعد بعینہٖ وہی مسلک اختیار کر لیا جو دیگر اہلِ مذاہب نے اختیار کر رکھا تھا۔ اُنہوں نے بھی دنیا اور اس کے دھندے سلاطین کے سپرد کر دیئے اور مذہب کا دائرہ روحانی ترقی اور آخرت کی نجات قرار دے لیا۔ لہٰذا اگر آپ چاہیں کہ آپ اس معیار کے

مطابق اسلام کو مذاہبِ عالم کے مقابلہ میں بے مثل و بے نظیر ثابت کردیں تو یہ ناممکن ہے۔ اس کیلئے نہ اُن کے پاس بیّن ثبوت ہے نہ آپ کے پاس۔

(۳) قرآن نے پہلے ہی پارہ کے شروع میں "قصۂ آدم"[1] کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ (۲/۳۶) تمہیں ایک مدت تک کے لیے اِس دنیا میں قیام کرنا اور متاعِ ارض سے بہرہ یاب ہونا ہے۔ اس کیلئے یاد رکھو کہ فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ جو قوم ہمارے دیئے ہوئے ضابطۂ حیات (وحی) کے مطابق زندگی بسر کرے گی اسے نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔ لیکن جو قوم اپنے خودساختہ نظریوں کے مطابق زندگی کے مسائل حل کرنے کی کوشش کرے گی اور مذکورہ بالا ضابطۂ حیات کے خلاف چلے گی۔ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (۲/۳۹) ان کی کشتِ حیات جل کر راکھ کا ڈھیر ہو جائے گی۔ لہٰذا قرآن نے انسان کو وہ راہ نمائی عطا کی ہے جو اُسے اس دُنیا میں رہنے کے طور طریق سکھاتی ہے اور اسکی حیاتِ ارضی کے اس بنیادی مسئلہ کا حل بتاتی ہے جس کا حل تنہا عقلِ انسانی آج تک دریافت نہیں کرسکی اور نوعِ انسانی کی ساری تاریخ جس کے حل کی تلاش کی مضطربانہ کوشش اور خونیں داستان ہے اور حل بھی ایسا بتاتی ہے کہ اس سے اس زندگی کی سرفرازیاں بھی حاصل ہو جاتی ہیں اور اس کے بعد کی زندگی کی خوشگواریاں بھی۔ یہ ہے وہ مقام جہاں اسلام کے بے مثل و بے نظیر ہونے کی حقیقت اُبھر کر سامنے آجاتی ہے اور انسان دیکھ لیتا ہے کہ اس کے بتائے ہوئے عقائد اور احکام کس طرح اس حل کے لاینفک اجزا ہیں۔

(۴) وہ بنیادی مسئلہ کیا ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے اور عقلِ انسانی اُس کے حل میں کس طرح ناکام رہی ہے اس کے متعلق میں نے تفصیل سے اپنی اُس کتاب میں لکھا ہے جس کا موضوع، انسانی فکر کی تاریخ ہے اور جس کا عنوان ہے "انسان نے کیا سوچا اور خدا نے کیا کہا؟" (یہ کتاب عنقریب شائع ہو جائے گی۔) اس کتاب کی تدوین کے بعد میرے سامنے ڈاکٹر (REINHOLD NIEBUHR) کی کتاب (Moral Man and Immoral Society) کا ۱۹۵۳ء کا اڈیشن آیا۔ اس کتاب کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے۔

> اگرچہ انسانی معاشرہ کی جڑیں ایسی ہیں جو تاریخ (کی زمین) میں خود انسانی زندگی کے آغاز سے بھی زیادہ گہرائی تک پہنچی ہوئی ہیں لیکن نوعِ انسانی نے اپنی اجتماعی زندگی کے بنیادی مسئلہ کے حل میں مقابلۃً بہت ہی کم ترقی کی ہے ..... یہ مسئلہ یہ ہے کہ وہ طبعی اور ثقافتی اسباب و ذرائع جو انسانی زندگی کے قیام اور نشوونما کے لئے ضروری ہیں اُن کی عادلانہ تقسیم کس طرح سے کی جائے۔

یعنی انسان کی حیاتِ ارضی کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ وہ سامانِ نشوونما جو فطرت کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ عطا ہوا ہے، اسکی تقسیم کس طرح سے کی جائے کہ وہ تمام افرادِ انسانیہ کی نشوونما کا ذریعہ بن سکے ——— ایسی نشوونما کا ذریعہ کہ ان کی طبعی ضروریات بھی

[1] قصۂ آدم کا صحیح مفہوم کیا ہے، اس کی تفصیل میری کتاب "ابلیس و آدم" میں ملے گی۔

پوری ہوتی رہیں اوران کی مضمر صلاحیتیں بھی اُبھرتی چلی آئیں۔ یہ ہے وہ بنیادی مسئلہ جس کا صحیح حل نہ ملنے کی وجہ سے انسان اس قدر جگر سوز مشقتوں میں مبتلا چلا آتا ہے۔ قرآن نے اس مسئلہ کو تین لفظوں میں بیان کردیا ہے۔ اس نے جب آدم سے کہا کہ تم نے زمین میں رہنا ہے تو ساتھ ہی یہ بھی کہدیا کہ بَعۡضُکُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ (۲/۳۶) تمہارے مفاد میں ٹکراؤ ہوگا۔ تم میں سے ہر ایک چاہے گا کہ اپنے لئے زیادہ سے زیادہ سمیٹ لے، خواہ دوسروں کے لئے کچھ بھی نہ بچے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ کچھ لوگ اتنا کچھ سمیٹ لیں گے کہ اس کے رکھنے کے لئے بھی جگہ نہیں ہوگی اور دوسرے لوگ زندگی کی بنیادی ضرورتوں تک کے محتاج ہوجائیں گے۔ جو لوگ اس طرح رزق کے سرچشموں پر قابض ہوجائیں گے وہ دوسروں سے اپنی مرضی منوائیں گے اوران پر اپنا حکم چلائیں گے۔ اس سے انسانی معاشرہ میں فساد برپا ہوگا اور خونریزیاں ہوں گی یُّفۡسِدُ فِیۡهَا وَیَسۡفِکُ الدِّمَآءَ۔

یہ ہے انسان کی تمدنی زندگی کی بنیادی کشمکش جس کے اطمینان بخش حل کے لئے عقلِ انسانی تمام عمر سرگرداں رہی ہے اور اسے قدم قدم پر اپنی شکست کا اعتراف کرنا پڑا ہے (JEREMY BENTHAM) انیسویں صدی کا ایک مشہور ریفارمر گزرا ہے۔ اس نے عمر بھر کوشش کی کہ مختلف افراد اور طبقات کی خود غرضی کا کوئی کامیاب حل تلاش کرسکے۔ اس کے لئے اس نے مختلف تحریکیں چلائیں لیکن وہ ایک ایک کرکے ناکام ہوتی چلی گئیں۔ آخر الامر اس نے انتہائی مایوسی کے عالم میں اس کا اعتراف کیا کہ

> اب میں کسی فریب میں نہیں رہا۔ اب میری نگاہوں کے سامنے سے خوش آیند خوابوں کے تمام پردے اٹھ چکے ہیں۔ اب میں نے اپنی ناکامیوں کا راز پالیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ انسان کی خلقت ہی ایسی واقع ہوئی ہے کہ اگر تمام نوع انسانی کی مسرت ایک طرف ہو اور ایک فرد کی اپنی مسرت ایک طرف تو وہ تمام نوع انسانی کی مسرت پر اپنی مسرت کو ترجیح دے گا۔ (WORKS, Vol. X)

ڈاکٹر (NIEBUHR) اس کی تائید کرتا ہوا اس پر اضافہ کرتا ہے کہ انسانی تہذیب نے جو کچھ کیا ہے وہ صرف اتنا ہے کہ جو خرابی ایک فرد کے اندر تھی اسے ایک قوم کو تفویض کردیا ہے۔ یعنی اب قوموں کی وہی حالت ہے جو بنیتھم کے الفاظ میں افراد کی حالت تھی۔ اس شکل کی وجہ یہ ہے کہ مختلف افراد میں اکتساب رزق کی استعداد مختلف ہوتی ہے۔ حیوانوں میں یہ بات نہیں ہوتی۔ ان کی کسی ایک جنس میں (مثلاً ہرنوں کا گلہ) اس استعداد کا فرق نہیں ہوتا۔ اس لئے ان میں مفاد کا تصادم بھی نہیں ہوتا۔ اسی طرح غیر مہذب قبائل میں یہ اختلاف جسمانی قوت تک محدود رہتا ہے اور مختلف افراد کی دماغی

استعداد میں کچھ زیادہ تفاوت نہیں ہوتا۔ اس لئے وہاں بھی طبقاتی تقسیم نہیں ہوتی۔ لیکن جوں جوں انسان ذہنی ترقی کرتا جاتا ہے مختلف افراد میں اکتسابی استعداد کا فرق نمایاں ہوتا چلا جاتا ہے اور اسی نسبت سے باہمی مفاد میں تصادم بڑھتا جاتا ہے (JAMES MABISON) لکھتا ہے کہ

ذاتی ملکیت یا جائیداد کے حق کا تصور انسانی استعداد کے اختلاف سے پیدا ہوتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جو مختلف افراد کے مفاد میں مساوات پیدا نہیں ہونے دیتی۔ گورنمنٹ کا اولین مقصد اس استعداد کا تحفظ ہوتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مختلف افراد کی ملکیت کی مقدار بھی مختلف ہوتی ہے۔ اس سے معاشرہ میں مختلف معاشی گروہ اور پارٹیاں بن جاتی ہیں۔

یہ ہے تفسیر قرآن کے ان تین الفاظ کی جنہیں اوپر درج کیا جا چکا ہے یعنی بَعْضُکُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ کی حالت۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا تنہا عقل کی رُو سے اس تصادم کا کوئی کامیاب حل دریافت کیا جا سکتا ہے؟ ہم دیکھ چکے ہیں کہ بینتھم نے اس سے یہ کہہ کر پیچھا چھڑا لیا کہ یہ بات انسان کی فطرت کے اندر ہے لہٰذا اسے دور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر (NIEBUHR) اس کے متعلق لکھتا ہے:

اگر عقل انسانی معجزانہ طور پر ترقی کر جائے تو اور بات ہے ورنہ اس کے ذریعہ اس تصادم کا مٹانا ناممکن ہے جو مختلف طبقوں اور قوموں میں اپنے اپنے مفاد کے تحفظ کے خیال سے پیدا ہوتا ہے۔ عقل کو کتنی ہی وسعت اور ثبات کیوں نہ حاصل ہو جائے اس کے لئے یہ ناممکن ہے کہ یہ اس فرد کے علاوہ جس کی یہ عقل ہے کسی اور کی زندگی کے لئے اثبات میں جواب دے سکے ...... لہٰذا یہ پیش گوئی نہایت آسانی سے کی جا سکتی ہے کہ مستقل امن اور نوع انسانی کی اخوت کا خواب اپنی مکمل شکل میں کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے گا...... ہمیں اس کی کوئی امید نہیں رکھنی چاہیئے کہ علم و عقل کی ترقی اور رسل و رسائل کی زیادتی سے بین الاقوامی اخلاق میں کوئی نمایاں ترقی ہو جائے گی۔

یہ ہے وہ نتیجہ جس تک اس باب میں ہمارے دور کے مفکرین پہنچے ہیں۔ یعنی یہ عقل کے بس کی بات ہی نہیں کہ وہ انسان کی حیات ارضی کے اس بنیادی مسئلہ کا حل دریافت کر سکے۔ تنہا عقل نے اس مسئلہ کا جو حل دریافت کیا ہے وہ ہمارے دور میں کمیونزم کی شکل میں سامنے آیا ہے۔ کمیونزم کوئی نیا تصور نہیں۔ ذہن انسانی نے صدیوں پہلے اس کو محسوس کیا تھا کہ اس ساری کشمکش کی جڑ "ذاتی ملکیت" کا وجود ہے۔ اگر ذاتی ملکیت کو مٹا دیا جائے تو یہ مسئلہ خود بخود حل ہو جاتا ہے۔ یہ تصور بڑا خوش آیند تھا۔ لیکن یہ ایک وسیع پیمانے پر (بہ حیثیت ایک عام نظام زندگی کے) کبھی عمل میں نہ آ سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ وہ کتنی ہی محنت کیوں نہ کریں فالتو روپیہ (SURPLUS MONEY)

ان کے پاس نہیں رہ سکتا تو ان کے دل میں زیادہ محنت کرنے کا جذبہ باقی نہیں رہتا۔ اور اگر ان کے اس جذبۂ محرکہ کی بقا کے لئے ذاتی ملکیت کی اجازت دی جاتی ہے تو پھر وہی معاشی اور معاشرتی ناہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہی حل مارکس نے پیش کیا اور قریب تیس سال سے اس کا عملی تجربہ روس میں ہو رہا ہے۔ اس وقت تک اس کا نتیجہ کیا نکلا ہے، اس کے متعلق موافق اور مخالف لٹریچر کا ایک طومار آپ کو دکھائی دے گا۔ لیکن یہ ایک واقعہ ہے جس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ اس مملکت نے اپنے چاروں طرف سخت آہنی پردے لٹکا رکھے ہیں جن کے اندر جھانک کر دیکھنے کی کسی کو اجازت نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جس نظام کے نظریات کو عام کرنے کے لئے کمیونزم کے مدعی دنیا کے ہر گوشہ میں اپنا خون پسینہ ایک کر رہے ہوں اور اسے آدم کی فردوسِ گم گشتہ قرار دے رہے ہوں، اس نظریہ کی عملی تجربہ گاہ کو باہر کی دُنیا سے اِس طرح آہنی پردوں میں رکھنا، اس حقیقت کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ وہاں یقیناً ایسا نقشہ نہیں ہے جسے دُنیا کے سامنے فخر کے ساتھ پیش کیا جا سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ کمیونزم کے پاس کوئی ایسی محکم اساس نہیں جس پر وہ ایسے بلند نظام کی عمارت قائم کر سکے کہ لوگ اکتسابِ رزق کے لئے نہ دن کا چین دیکھیں نہ رات کا آرام اور اس کے بعد سب کچھ دوسروں کی بہبودی اور مرفہ الحالی کے لئے عام کر دیں۔ اس صورت میں اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں کہ کام کرنیوالوں سے مار مار کر کام لیا جائے اور انہیں حیوانوں کی طرح اتنا ہی دیا جائے جس سے ان کے جسم کی پرورش ہوتی رہے تاکہ وہ کام کرنے کے قابل رہیں۔ کمیونزم کا یہ تجربہ جو روس میں ہو رہا ہے نوعِ انسانی کے لئے بدترین تجربہ ہے جس میں اول تو انسانی زندگی اور حیوانی زندگی میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ دونوں کی زندگی محض طبعی زندگی سمجھی جاتی ہے جس کا خاتمہ موت کر دیتی ہے۔ لہٰذا اس میں انسانیت کے تقاضے، طبعی تقاضوں سے زیادہ کچھ نہیں سمجھے جاتے۔ اور دوسرے یہ کہ جن انسانوں کے یہ طبعی تقاضے پورے کئے جاتے ہیں ان کی انفرادیت یکسر ختم کر دی جاتی ہے۔ میں نے ایک مدت تک اس تحریک کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا۔ اس لئے کہ جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے، مجھے ہمیشہ اس کی تلاش رہی کہ معلوم کر سکوں کہ کیا تنہا عقلِ انسانی، انسان کے اس بنیادی مسئلہ کا حل پیش کر سکتی ہے یا نہیں، اور اس مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ تحریک انسانیت کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ اس تصور سے میری روح کانپ اٹھتی ہے کہ اگر یہ نظام کہیں ساری دُنیا پر مسلط ہو گیا تو اس سے وہ کس عذاب الیم میں مبتلا ہو جائیگی۔ یہ تھا وہ شدید احساس جس کے ماتحت میں نے انسان کے اس بنیادی مسئلہ کے حل کے لئے قرآن کی طرف

رجوع کیا۔ میں قرآن کا ایک ادنیٰ سا طالب علم ہوں، میری عمر کا بیشتر حصہ اس پر غور و فکر میں گزرا ہے۔ قرآن سے راہ نمائی حاصل کرنے کے لئے میرا ہمیشہ یہ انداز رہا ہے کہ میں پہلے سے کوئی خیال قائم کر کے قرآن کے اندر نہیں جاتا۔ میں ایک سوال کو سامنے رکھتا ہوں اور خالی الذہن ہو کر کوشش کرتا ہوں کہ مجھے قرآن سے اس کا کوئی حل مل جائے۔ جو حل مجھے قرآن سے ملتا ہے، اسے قبول کرتا ہوں خواہ وہ ساری دنیا کے مسلمات کے خلاف ہی کیوں نہ جائے، حتیٰ کہ خود میرے اپنے معتقدات اور تصورات کے بھی خلاف کیوں نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ میں اپنوں اور بیگانوں، قریب قریب سب کی نگاہوں میں، ہدفِ ملامت بنا رہتا ہوں۔ میں نے اس مسئلہ کے حل کے لئے بھی اسی انداز سے قرآن پر غور کیا، اور میری اس کوشش نے مجھے جس نتیجہ تک پہنچایا ہے اسے میں نے آئندہ صفحات میں آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ قرآن تو وحی الٰہی ہے۔ جس میں غلطی کا کوئی امکان نہیں۔ لیکن میں اپنی قرآنی بصیرت کو کبھی وحی الٰہی قرار نہیں دیتا اس لئے اس میں صواب و خطا دونوں کا امکان ہوتا ہے۔ بنا بریں میں اس پر اصرار نہیں کرتا کہ جو کچھ میں نے سمجھا ہے وہ اس باب میں حرفِ آخر ہے اور وحی الٰہی کی طرح منزہ عن الخطاء۔ البتہ مجھے اس پر ضرور اصرار ہے کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے اس پر آپ صرف قرآن کی روشنی میں غور کریں۔ اور آپ کو جہاں کوئی سقم نظر آئے تو اسے مجھ پر صرف قرآن ہی کی تائید سے واضح کریں، یہ سمجھ لینے کے بعد کہ میں اس باب میں کسی قسم کی بحث میں نہیں الجھوں گا۔

(۵) اس مسئلہ کے حل کے لئے جو کچھ قرآن سے میں سمجھا ہوں وہ یہی ہے کہ قرآن کسی کے پاس فاضلہ دولت کو رہنے نہیں دیتا اور وسائل پیداوار پر (خواہ وہ فطری ہوں یا مصنوعی) کسی کی ذاتی ملکیت کے اصول کو تسلیم نہیں کرتا۔ یہ بات دیکھ کر اکثر سطح بیں حضرات فوراً کہہ اٹھیں گے کہ یہ تو وہی بات ہے جو کمیونزم کہتی ہے۔ اس کے بعد وہ کہیں گے کہ یہ عجیب بات ہے کہ میں ایک طرف کمیونزم کو انسانیت کا بدترین دشمن قرار دیتا ہوں اور دوسری طرف، اسلام کو، جو وہی چیز پیش کرتا ہے جسے اشتراکیت پیش کرتی ہے، نوعِ انسانی کے حق میں آبِ حیات تصور کرتا ہوں۔ بعض لوگ شاید اس سے بھی آگے بڑھیں اور کہہ دیں کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے یہ اشتراکیت ہی ہے جسے اسلام کا لیبل لگا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ جیسا کہ آپ متنِ کتاب سے دیکھیں گے، اس قسم کی باتیں ان لوگوں کی طرف سے کی جاتی ہیں جو نہ یہ جانتے ہیں کہ کمیونزم کیا ہے اور نہ یہ کہ اسلام کیا ہے۔ اسی قسم کے وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے آجکل "اسلامی اشتراکیت" کی عجیب و غریب اصطلاح وضع کر رکھی ہے۔ یہ اصطلاح ایسی ہے جیسے کوئی "قرآنی دہریت" کہہ دے۔ اس میں شبہ نہیں کہ

کمیونزم میں بھی ذاتی ملکیت کی نفی ہوتی ہے لیکن صرف اتنی سی بات سے کمیونزم جیسا خلافِ اسلام تصورِ حیات، اسلام تو نہیں بن سکتا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہدے کہ آریہ سماجی بھی بُت شکنی کی تعلیم دیتے ہیں اور اسلام بھی بتوں کی پرستش سے روکتا ہے۔ اس لئے اسلام اور آریہ سماجی مذہب دونوں ایک ہی ہیں۔ کمیونزم ایک معاشی نظام ہی نہیں بلکہ ایک فلسفۂ حیات ہے جو ان بنیادوں پر قائم ہے جو قرآنی تصورِ حیات سے یکسر متضاد ہیں۔ قرآنی تصورِ حیات کی رو سے یہ تمام کائنات ایک حکیم و خبیر ہستی کی پیدا کردہ ہے اور اسی کے غیر متبدل قوانین کے تابع چل رہی ہے۔ اس کی تخلیق ایک عظیم مقصد کو لئے ہوئے ہے۔ انسانوں کی تخلیق بھی اُسی خدا کے پروگرام کے مطابق عمل میں آئی ہے۔ اُس نے انسانی زندگی کو اُس کی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے اپنی طرف سے راہ نمائی عطا کی ہے، جسے وحی کہا جاتا ہے۔ یہ وحی اُن مستقل اقدار اور غیر متبدل قوانین پر مشتمل ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے بطور ضابطۂ حیات کام کرتے ہیں۔ اس ضابطۂ حیات کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کو اس زندگی کی خوشگواریاں بھی نصیب ہوتی ہیں اور وہ اس قابل بھی ہو جاتا ہے کہ مرنے کے بعد زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا جائے۔ جو معاشرہ اس ضابطۂ حیات کے مطابق متشکل ہوتا ہے اسے قرآنی نظام کا حامل کہا جاتا ہے۔ اس نظام کا مقصد یہ ہے کہ دنیا میں کوئی انسان بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے اور تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما ہوتی چلی جائے۔ اسی کا نام تکمیلِ ذات یا استحکامِ خودی ہے۔ یعنی ہر فرد کی انفرادیت کا اثبات اور اس کی تکمیل۔ اس نظام میں یہ کچھ نہ میکانکی طور پر رونما ہوتا ہے اور نہ ہی کسی قسم کے جبر و تشدد سے پیدا کیا جاتا ہے۔ یہ چیز اس معاشرہ کے افراد کے دل کی گہرائیوں سے اُبھرتی، اُن کے ذہن کی کاوشوں سے نشوونما پاتی اور اُن کے بازوؤں کی قوت سے پروان چڑھتی ہے۔ اس لئے کہ ان افراد کا ایمان ہوتا ہے کہ دنیا میں کوئی عمل حتیٰ کہ کوئی خیال تک بھی بلا نتیجہ نہیں رہتا۔ انسانوں کا ہر عمل اور ارادہ جو وحی خداوندی (یعنی مستقل اقدار) سے ہم آہنگ ہوتا ہے وہ فرد اور معاشرہ دونوں کے لئے خوشگوار نتائج پیدا کرتا ہے اور اسی میں شرفِ انسانیت کی تکمیل کا راز پوشیدہ ہوتا ہے۔ اور ہر وہ کام جو ان اقدار کے خلاف سرزد ہو، اُس سے مقامِ انسانیت چھین لینے کا موجب بنتا ہے۔ اس نظام میں ہر فرد پوری محنت سے کام کرتا ہے اور اپنے لئے صرف اتنا لیتا ہے جو اس کی ضروریات کے لئے کافی ہو۔ باقی سب کچھ اپنے دل کی پوری رضامندی کے ساتھ نوعِ انسانی کی ربوبیتِ عامہ کے لئے کھلا چھوڑ دیتا ہے۔ کیونکہ اس کا ایمان ہوتا ہے کہ اس سے اسکی اپنی ذات کی نشوونما

ہوتی ہے اور وہ ابدی مسرتوں کا مستحق بن جاتا ہے۔ اس طرح اس معاشرہ میں نہ فاضلہ دولت کسی کے پاس رہتی ہے اور نہ ہی پیداوار کے ذرائع پر ذاتی ملکیت کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

ان حقائق کو سامنے رکھئے اور پھر سوچیے کہ ان میں اور کمیونزم میں کوئی قدر بھی مشترک ہے؟ کمیونزم نہ خدا کی قائل ہے، نہ کائنات اور انسانی زندگی کے کسی مقصد کی، نہ وہ وحی کو مانتی ہے نہ مستقل اقدار کو، نہ وہ انسانی ذات کی قائل ہے، نہ مرنے کے بعد زندگی کے تسلسل کی۔ نہ وہ قانونِ مکافات کو تسلیم کرتی ہے اور نہ اس کے غیر متبدل اصولوں کو۔ آپ سوچیے کہ ایک ایسے نظامِ زندگی کو جو ان تمام اقدار کے انکار پر مبنی ہو، اسلام سے کوئی تعلق بھی ہو سکتا ہے؟۔ کمیونزم اور اسلام دو متضاد عناصر ہیں جو کبھی ایک جگہ اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ قرآن کی رُو سے کوئی مسلمان، کمیونسٹ ہو ہی نہیں سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تحریک جو ایک "دین" (نظامِ زندگی) کی حیثیت سے سب سے پہلی بار اسلام کے مقابلہ میں آئی ہے کمیونزم ہے۔ اسلام اس وقت ایک بہت بڑی جنگاہ میں کھڑا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ کمیونزم کو شکست دے کر اپنی صداقت کی نمود کرے۔ لیکن یہ اُس نظامِ ربوبیت کی رُو سے ہو سکتا ہے جسے قرآن پیش کرتا ہے۔

(۶) جہاں تک میرا مطالعہ میری راہنمائی کرتا ہے۔ قرنِ اوّل کے بعد (کہ جس میں یہ نظام اُس زمانے کے حالات کے مطابق اپنی عملی شکل میں قائم ہوا تھا) اسلام کی تاریخ میں میری یہ کوشش پہلی کوشش ہے جس میں اس نظام کو سامنے لایا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہمارے "مذہب پرست" طبقہ کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہو گی۔ اس لئے کہ ان کا ایمان یہ ہے کہ جو کچھ اسلاف سے ہوتا چلا آ رہا ہے وہی مسلک حقہ ہے اور اس میں کسی قسم کا ردوبدل الحاد اور بے دینی ہے۔ ہمارے ہاں وسائل پیداوار پر ذاتی ملکیت کا تصور صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔ اس لئے یہ تصور ان حضرات کے نزدیک بڑا مقدس اور عین اسلام بن چکا ہے۔ بنا بریں وہ کسی ایسی بات کو سننے تک کے لئے بھی تیار نہیں ہوں گے جس میں یہ کہا گیا ہو کہ وسائل پیداوار ذاتی ملکیت میں نہیں رہنے چاہئیں۔ ان سے اگر کہا جائے گا کہ یہ دیکھئے کہ اس باب میں قرآن کیا کہتا ہے تو ان کا پہلا جواب تو یہ ہو گا کہ ہمارے بزرگ قرآن کو ہم سے بہتر سمجھتے تھے اور دوسرا جواب یہ کہ اگر کسی معاملہ میں قرآن میں اور اسلاف کے مسلک میں اختلاف نظر آئے تو ہمیں قرآن کی ایسی تاویل کرنی چاہیئے جس سے وہ اسلاف کے مسلک کے مطابق ہو جائے۔ لیکن میرے نزدیک یہ کوئی دلیل نہیں۔

میرے عقیدہ کے مطابق دین کی سند اللہ کی کتاب ہے اور ہر دور کے مسلمانوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ دیکھیں کہ ان کے ہاں جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے وہ قرآن کے مطابق ہے یا نہیں۔ جہاں وہ دیکھیں کہ کوئی بات قرآن کے خلاف ہے اُسے فوراً قرآن کے مطابق کر لینا چاہیئے۔ باقی رہا یہ کہ ہمارے اسلاف بھی قرآن کو سمجھتے تھے۔ سو اس ضمن میں اتنا عرض کروں گا کہ زمانہ من حیث الکل اس طرح آگے بڑھتا چلا آرہا ہے کہ ہر دور میں نئے نئے تقاضے اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ جس دور میں جو تقاضا زیادہ نمایاں طور پر سامنے آتا ہے اُس دور کے انسان لامحالہ اس پر زیادہ غور و فکر کرتے ہیں۔ رزق کے سرچشموں کی تقسیم کا تقاضا جس شدت سے ہمارے دور میں اُبھر کر سامنے آیا ہے گذشتہ تیرہ سو سال میں ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس لئے ہمیں یہ نہیں دیکھنا چاہیئے کہ ہمارے ہاں ہوتا کیا چلا آرہا ہے۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ اس تقاضے کا حل قرآن کیا پیش کرتا ہے۔

لیکن اتنا کچھ کہنے کے بعد میں اسے پھر دُہرا دوں کہ ہمارا "مذہب پرست" طبقہ ان میں سے کسی بات پر بھی کان نہیں دھریگا۔ وہ برابر یہی کہتے چلے جائیں گے کہ یہ ایک بالکل نیا اسلام ہے جسے ہم نے اسلاف میں سے کسی کے ہاں نہیں سُنا۔ لہٰذا یہ الحاد ہے بیدینی ہے۔ ان لوگوں کے ہاں اسلاف کی اندھی تقلید کا جذبہ کس حد تک پہنچ چکا ہے اس کا اندازہ ایک تاریخی واقعہ سے لگائیے۔ عہد اموی کی جامعہ دمشق بہت مشہور ہے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ اس مسجد کا رُخ، قبلہ سے ذرا ہٹا ہوا بن گیا۔ اس کے بعد جتنی مسجدیں بنیں وہ سب اسی جامعہ دمشق کی سمت کے مطابق تھیں۔ نتیجہ یہ کہ اُن تمام مساجد کا رُخ قبلہ سے ہٹ گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد اس فن کے ماہرین نے اس غلطی کو محسوس کیا۔ بات بالکل صاف تھی کہ اُن کے پیش کردہ علمی نظریہ کی رُو سے دیکھ لیا جائے کہ سمت غلط ہے یا صحیح۔ اور اگر سمت غلط نکلے تو اسے درست کر لیا جائے۔ لیکن تقلید اس کی اجازت کب دیتی ہے۔ چنانچہ اس کے متعلق ائمہ فقہ نے فتویٰ صادر فرما دیا کہ

> اگر کوئی فلکیات کا عالم یا معتمد آدمی یہ کہتا ہے کہ ان مساجد کا رُخ غلط ہے تو اس کی اس بات پر قطعاً اعتماد نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی اسے درخور توجہ سمجھا جائے گا۔ اس لئے کہ اموی مسجد کا قبلہ صحابہؓ کے وقت سے چلا آرہا ہے اور انہوں نے اور ان کے بعد آنے والوں نے اسی قبلہ کی طرف منہ کر کے نمازیں پڑھی ہیں۔ وہ لوگ اس فلکی کی نسبت زیادہ عالم اور زیادہ قابلِ اعتماد تھے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ

کہ یہ فلکیات کا ماہر درست کہہ رہا ہے یا غلط لیکن یہ حقیقت کہ اسلاف نے اسی رُخ پر نمازیں پڑھی ہیں خود اس امر کی دلیل ہے کہ اس فلکی کا قول غلط ہے۔ لہٰذا ہمیں اس کی بات نہیں ماننی چاہیئے۔ یاد رکھو کل خیر فی اتباع من سلف اسلاف کی اتباع ہی میں تمام بھلائی ہے۔

(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو فقہ کی مشہور کتاب شامی - جلد اوّل صفحہ ۴۴۷)

چنانچہ نمازیں اُسی رخ پر پڑھی گئیں اور پڑھی جارہی ہیں۔ جو قوم تقلید میں اس حد تک پہنچ چکی ہو اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ کسی ایسی بات کو سننا تک گوارا کرے گی جس کی تائید اُسے اسلاف کے ہاں سے نہ ملے امید موہوم ہے۔

باقی رہا ذاتی ملکیت کا "تقدس"، سو اس کے متعلق اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ یہ تصور یورپ کے ان مفکرین اور معاشی رہنماؤں کا پیدا کردہ ہے جو نظام سرمایہ داری کے بنیادی ستون ہیں۔ بوڈن (BODIN) ہابز (HOBBES) لاک (LOCKE) والٹیر (VOLTAIRE) ہیوم (HUME) سب اسی زمرہ کے لوگ ہیں۔ انہوں نے ذاتی ملکیت کو انسان کے فطری حقوق (Natural Rights) کی فہرست میں شامل کیا اور اس کا تحفظ حکومت کا اولین فریضہ قرار دیا۔ ان کے برعکس قرآن کو دیکھئے۔ وہ حضراتِ انبیاء کرامؑ کے مسلک کو نوعِ انسانی کے لئے بطور دلیل راہ پیش کرتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ قرآن نے کسی رسول کی ذاتی ملکیت کا ذکر نہیں کیا خود حضور خاتم النبیین صلعم کے متعلق یہ حقیقت سب کو تسلیم ہے کہ (روزمرہ کی اشیاء مستعملہ کے سوا) نہ حضورؐ کی کوئی ذاتی ملکیت تھی نہ فاضلہ دولت۔ بلکہ ایک حدیث کے مطابق (جو قرآن کے مطابق ہے اور اس لئے قابلِ قبول) حضورؐ نے فرمایا کہ انا لا نورث۔ ہمارا کوئی وارث نہیں۔ مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ۔ ہم جو کچھ چھوڑ رہے ہیں وہ سب مفاد عامہ کے لئے ہے (بخاری جلد ۲ صفحہ ۹۹۶) چنانچہ اس اصول کے مطابق، باغِ فدک، جو حضور کے ذاتی گزارے کے لئے تھا، بطور ترکہ تقسیم نہیں ہوا۔ بلکہ اُمت کی مشترکہ تحویل میں آگیا۔

اب رہا یہ سوال کہ اگر اسلام میں ذاتی ملکیت نہیں تو پھر قرآن میں وراثت وغیرہ کے احکام کس لئے دیئے گئے ہیں۔ سو اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن انسانی معاشرہ کو اپنے متعین کردہ پروگرام کی آخری منزل تک آہستہ آہستہ بتدریج پہنچاتا ہے۔ اس لئے وہ جہاں اُس پروگرام کی آخری منزل کے متعلق اصول اور احکام متعین کرتا ہے

عبوری دور کے لیے بھی ساتھ کے ساتھ راہنمائی دیتا چلا جاتا ہے۔ وراثت، قرضہ، لین دین۔ صدقہ و خیرات وغیرہ سے متعلق احکام اس عبوری دور سے متعلق ہیں جس میں سے معاشرہ گزر کر انتہائی منزل تک پہنچتا ہے۔ جس طرح کوئی ایک معاشرہ جو قرآنی پروگرام پر عمل پیرا ہوتا ہے، بتدریج آخری نقطہ تک پہنچتا ہے اسی طرح تمام نوع انسانی بھی رفتہ رفتہ اس انتہائی نقطہ کی طرف جا رہی ہے جس کی نشاندہی قرآن نے کی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانی معاشرے کے تقاضے اب کچھ ایسے شدید ہو چکے ہیں کہ ان کا حل ان قوانین کے بغیر ممکن نہیں جو قرآن نے انتہائی منزل کے لیے تجویز کئے تھے اور جس کا نمونہ نبی اکرم صلعم نے اپنی ذات میں دکھا دیا تھا۔ تمام نوع انسانی کی فلاح و بہبود کے لیے مسلسل محنت اور کاوش لیکن فاضلہ دولت اور ذاتی ملکیت کی نفی، یہی ہے وہ نظام ربوبیت جسے قرآن انسانی معاشرہ کی آخری شکل قرار دیتا ہے۔ اور جسے آئندہ اوراق میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ذاتی ملکیت کا تصور انسان کی "فطرت" میں داخل ہے۔ ان کی خدمت میں عرض ہے کہ جسے وہ انسان کی "فطرت" سمجھتے ہیں وہ اس کی آبائی روایات، موروثی اثرات، تعلیم و تربیت کے نقوش اور گرد و پیش کی فضا کے مجموعہ سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔

(ان امور کو میں "سلیم کے نام خطوط" کے مجموعہ میں وضاحت سے بیان کر چکا ہوں)

قرآن کے تجویز کردہ نظام تک پہنچنے سے پہلے جس طرح یہ بتانا ضروری ہے کہ کمیونزم کا پیش کردہ نظام کس طرح انسانیت کش ہے اسی طرح یہ دکھانا بھی ضروری ہے کہ مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام جو اس مفروضہ پر قائم ہے کہ ملکیت کا جذبہ انسان کی فطرت کے اندر ہے اس لیے جو نظام پیداوار کے ذرائع کو افراد کی ذاتی ملکیت میں رکھتا ہے وہ عین فطرت انسانی کے مطابق ہے، وہ بھی کتنے بڑے فریب نفس اور ابلہ فریبی میں مبتلا ہے۔ جب تک ان غلط مفروضوں کی اصلیت کو بے نقاب نہ کیا جائے، ہم حقیقت تک کبھی نہیں پہنچ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ایمان باللہ سے پہلے کفر بالطاغوت کو ضروری قرار دیا ہے۔ برفاٹ (Robert Briffault) کے الفاظ میں۔

آپ استبداد کے مقابلہ کے لیے کبھی نہیں اٹھ سکتے، نہ ہی اس کی قوت کو توڑ سکتے ہیں جب تک آپ ان جھوٹی سندوں کو سچا سمجھتے رہیں جو اس استبداد کے لیے وجہ جواز بہم پہنچاتی ہیں۔ جب تک آپ اس (مقدس)

جھوٹ کو اچھی طرح بے نقاب نہیں کر دیتے اور واضح طور پر نہیں بتا دیتے کہ اس کا صحیح مقام کیا ہے، اس وقت تک آپ اس استبداد، اس ظلم اور بے انصافی کا کبھی مقابلہ نہیں کر سکتے۔

(Rational Evolution)

قرآن کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں اپنا فریضہ سمجھتا ہوں کہ وہ تمام مخترعات و مکذوبات جو کسی نہ کسی طرح حقائق کا نقاب اوڑھ چکے ہیں، ان کی پردہ دری کی جائے تاکہ قرآنی حقیقت نکھر کر سامنے آجائے۔ یہی وہ طریق ہے جس سے ہمارے قلب و نگاہ کی تطہیر ہو سکے گی جو قرآنی انقلاب کے لئے اولیں مرحلہ ہے۔ اقبالؔ کے الفاظ میں۔

زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ (پیامِ مشرق)

قرآنی انقلاب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہنگامی شورشیں برپا کرنا نہیں سکھاتا۔ وہ اپنی اساس فکری تبدیلی پر رکھتا ہے جسے وہ علیٰ وجہ البصیرت پیدا کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ان جذبات کی بھی حسن کارانہ انداز سے پرورش اور تربیت کرتا ہے جو انقلاب کی قوتِ محرکہ ہوتے ہیں۔ وہ قلب اور دماغ، عقل اور عشق، جنون اور خرد، ذکر اور فکر، خبر اور نظر، دلائل اور جذبات کے صحیح امتزاج سے داخلی اور خارجی دنیا میں ایسی تبدیلی پیدا کرتا ہے جس میں ہر قدم تعمیر کے لئے اٹھتا ہے اور جو چیزیں بظاہر تخریبی نظر آتی ہیں، وہ بھی درحقیقت تعمیر ہی کی تمہید ہوتی ہیں۔ "جنون اور خرد" جیسے متضاد عناصر میں ہم آہنگی پیدا کر کے انہیں ایک بے پناہ قوت کا امین بنا دینا، قرآن کی بنیادی خصوصیت ہے۔ ڈاکٹر (NIEBUHR) اپنی (محولہ بالا) کتاب کے آخری صفحہ پر لکھتا ہے:۔

نوعِ انسانی کی نجات ان افراد کے ہاتھوں ممکن ہے جنہوں نے قدیم "خوابوں" کو جدید "خوابوں" سے بدل دیا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ اہم "خواب" یہ ہے کہ نوعِ انسانی کی اجتماعی زندگی میں مکمل عدل پیدا کر دینا ممکن ہے۔ یہ "خواب" بڑا ہی بیش بہا ہے۔ اس لئے کہ انسان، عدل سے قریب تر مقام کو بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ جب تک مکمل عدل کی امید اس کے دل میں ایک بلند قسم کا جنون پیدا نہ کر دے

اس جنون کے علاوہ کوئی اور قوت ایسی نہیں جو اربابِ اقتدار کے استبداد اور بلند مسندوں پر متمکن شدہ روحانی پیشوائیت کی ابلیسانہ کارستانیوں کے خلاف جہاد کر سکے۔

لیکن یہ جنون خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ اس سے مذہبی دیوانگی (Fanaticism) کے حوصلے بڑھ جاتے ہیں۔ لہٰذا اس جنون کو عقل کے کنٹرول کے تابع رکھنا ضروری ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ دعا بھی کرتے رہنا چاہیئے کہ قبل اس کے کہ یہ جنون اپنا کام مکمل کرے کہیں عقل اس کا خاتمہ ہی نہ کر دے۔

اس قسم کا عقل اور جنون کا امتزاج، جس میں نہ تو جنون، مذہبی دیوانگی سکھاوے اور نہ ہی عقل اس جنون کی چنگاری کو اپنی خاکستر کے نیچے دبا کر بجھا دے، قرآن کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔ یہی ہیں وہ اربابِ "خرد و جنون" جنہیں وہ اُولِی الْاَلْبَابِ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِہِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۳/۱۹۰) سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی وہ اربابِ عقل و بصیرت جو زندگی کی ہر ساعت اور ہر گوشے میں وحی کی راہ نمائی کو بھی پیشِ نظر رکھتے ہیں اور کائنات کی گہرائیوں اور بلندیوں پر بھی غور و فکر کرتے ہیں۔ یہی ہیں وہ "مکمل عدل کا خواب" دیکھنے والے جو اس خواب کو ایک زندہ حقیقت بنا کر رکھ دینے کے اہل ہیں۔ اور اس کا زمانہ کچھ زیادہ دور نہیں۔ علامہ اقبالؒ نے ۱۹۲۳ء کے قریب لکھا تھا کہ "فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے۔" اس سے قریب دس بارہ برس بعد انہوں نے کہا تھا کہ

جو حرفِ قُلِ العَفو میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار (ضربِ کلیم)

اور اس کے بعد انہوں نے اپنی آخری تصنیف "ارمغانِ حجاز" میں ابلیس کی زبان سے کہلوایا تھا کہ

مزدکیت "فتنۂ فردا" نہیں اسلام ہے

میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کے جس آسمانی انقلاب کی طرف حکیم الامتؒ نے یہ اشارات کئے تھے اس کیلئے فضا بڑی تیزی سے تیار ہو رہی ہے۔ بنا بریں میں نے ضروری سمجھا ہے کہ اس باب میں جو کچھ میں نے قرآن سے سمجھا ہے اسے اپنے رفقائے

کارواں کے سامنے واضح الفاظ میں پیش کردوں۔ اس کی ضرورت صرف اس لئے نہیں کہ وہ خود اس قرآنی معاشرہ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس کی زیادہ ضرورت اس لئے بھی ہے کہ اس وقت انسانیت ایک بڑے نازک دور سے گزر رہی ہے اور وہ دوراہہ بہت جلد سامنے آجائے گا جب اُسے آخری فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ کس سمت کی طرف مُڑے۔ اگر اُس وقت اس کا قدم پھر غلط راستہ کی طرف اُٹھ گیا تو نہ معلوم اُسے صحیح راستہ کی طرف آنے کے لئے کتنی صدیوں تک انتظار کرنا پڑے اور کتنے خون کے دریا پیرنے اور آگ کی خندقیں پھاندنی پڑیں۔ اس وقت نوعِ انسانی سرمایہ داری کے اس نظام سے تنگ آچکی ہے جس نے اتنا عرصہ اس کا گلا گھونٹے رکھا ہے۔ اگر اس وقت اسے صحیح راستہ نہ ملا تو وہ ناچار کمیونزم کو قبول کرلے گی اور یہ اقدام اس کے لئے خودکشی کے مرادف ہوگا۔ لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ جو قوم وراثتِ قرآن کی مدعی ہے یہ ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے کہ ایسے نازک وقت میں وہ کاروانِ انسانیت کی راہ نمائی صحیح راستہ کی طرف کرے۔ صحیح راستے سے مُراد ہے ایسا راستہ جس پر چل کر انسان کی معاشی زندگی کا وہ مسئلہ بھی حل ہو جائے جس کے حل کرنے سے تنہا عقلِ انسانی اس بُری طرح سے ناکام رہی ہے اور انسان اس زندگی کے بعد کی زندگی کی خوشگواریاں بھی حاصل کرلے۔ ایسا نظریۂ زندگی جو انسانی زندگی کے مسئلہ کو محض معاشی مسئلہ قرار دے کر حیاتِ آخرت سے انکار کردے۔ یا اس کے معاشی مسئلہ کو حقارت سے ٹھکرا کر صرف "روحانی ترقی" کو مقصدِ زندگی قرار دیدے قرآنی نظریۂ حیات نہیں ہو سکتا۔ قرآن، ایک ہی کنجی سے انسان کی دنیا اور آخرت دونوں کے دروازے کھولتا ہے۔ اور اسی جہت سے اسکی تعلیم بے مثل و بے نظیر ہے۔ اخلاقی ضابطہ اور دین کے شعائر و مناسک اسی بے مثل و بے نظیر پروگرام کے اجزا ہیں۔

(۸) آخر میں میری درخواست ہے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے اسے سرسری نگاہ سے نہ دیکھئے اس کے ایک ایک لفظ پر غور کیجئے اور سوچئے کہ میں نے قرآن کا مفہوم صحیح طور پر سمجھا ہے یا نہیں۔ اور اگر آپ متفق ہوں کہ یہ قرآن کی صحیح تعبیر ہے تو پھر سوچئے کہ نوعِ انسانی کو سرمایہ داری کے جذام اور کمیونزم کے سرسام سے بچانے کے لئے آپ پر کیا فریضہ عائد ہوتا ہے؟

ایک معذرت | میں نے چاہا تھا کہ یہ کتاب نہایت صاف اور صحیح چھپے۔ اسی لئے اس کی کاپیاں بڑی محنت سے لکھوائی گئی تھیں۔ لیکن پریس میں جاکر جو کچھ ان کاپیوں پر بیتی وہ ناقابلِ بیان ہے۔ اب دو ہی صورتیں باقی تھیں۔ یا تو جس طرح کتاب چھپ سکتی تھی جوں توں کرکے چھاپ دی جائے اور یا اس کی دوبارہ کتابت کرائی جائے۔ چونکہ کتاب کی اشاعت میں پہلے ہی بہت تاخیر ہو رہی تھی اس لئے یہی مناسب سمجھا گیا کہ جیسے طرح بھی چھپ سکتی ہے چھاپ دی جائے۔ اس مجبوری کے ماتحت کتاب میں وہ صحت اور صفائی نہیں ہے جو میں چاہتا تھا۔ اس کیلئے میں قارئین کے ذوقِ سلیم سے معذرت خواہ ہوں

پرویز
مارچ ۱۹۵۵ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآنی نظامِ ربوبیت

باب اوّل

اسلام کیا ہے؟

اشیائے کائنات پر غور کیجئے یہ شروع ہی سے ایسی نہیں تھیں جیسی آج نظر آرہی ہیں۔ سورج، چاند ستارے، زمین، خشکی، تری، پہاڑ، صحرا، شروع میں کچھ اور تھے اور اس کے بعد معلوم کتنے ارتقائی منازل طے کرتے کرتے اپنی موجود شکل تک پہنچے ہیں۔ ان جامد اور غیر ذی حیات اشیاء سے آگے بڑھئے اور اس دنیا میں پہنچئے جہاں زندگی مشہود انداز میں سامنے آتی ہے۔ وہاں بھی یہی کیفیت نظر آئے گی۔ علمائے نظریۂ ارتقاء (Evolution Theory) کا کہنا ہے کہ صفحۂ ارض پر ابتدا پانی سے ہوئی۔ پانی اور مٹی کے امتزاج سے زندگی کے جو تودۂ اولیں کو پیکر عطا ہوا۔ زندگی کے یہ جراثیم مختلف نوعوں میں تقسیم ہو کر ایک درخت کی شاخ کی طرح مختلف سمتوں میں بڑھنے اور پھیلنے لگے۔ جراثیم حیات کے ان اولیں پیکروں میں ہزار ہا سال کے مراحل کے بعد، مختلف تبدیلیاں واقع ہوتی رہیں۔ ان طویل المیعاد مراحل کو طے کر کے سلسلۂ تخلیق حیوانی منزل تک پہنچا اور اس کے بعد لاتعداد مدارج نشو و ارتقاء طے کرتے کرتے کاروانِ حیات مقامِ انسانیت میں داخل ہوا۔

سکوتِ شام سے تا نغمۂ سحر گاہی　　ہزار مرحلہ ہائے فغانِ نیم شبی
کشاکشِ زم و گرما، تپ و تراش و خراش　　زخاکِ تیرہ دروں تا بہ شیشۂ حلبی
مقامِ بست و کشاد و فشار و سوز و کشید　　میانِ قطرۂ نیسان و آتشِ عنبی

ہماں کہ دانۂ انگور آب می سازند
ستارہ می شکنند آفتاب می سازند

کائنات کی ہر چیز کو اپنے نقطۂ آغاز سے مقامِ تکمیل تک پہنچنے کے لیے ہزاروں کروٹیں بدلنی پڑتی ہیں، اور یہ مراحل اس قدر طویل المیعاد ہوتے ہیں کہ کہیں ہزار ہزار سال میں ایک ایک مرحلہ طے ہوتا ہے اور کہیں پچاس پچاس ہزار سال میں۔

يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ ۝ ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ۝ (۳۲/۵-۶)

اللہ اپنے امر (اسکیم) کی ابتدا آسمان سے زمین کی طرف کرتا ہے۔ پھر وہ اسکیم (اپنے تدریجی مراحل طے کرتی ہوئی) اس کی طرف بلند ہو جاتی ہے۔ ایک دن (منزل) میں جس کی مقدار تمہاری گنتی کے اعتبار سے ہزار سال ہوتی ہے[1]۔ یہ سلسلۂ نشوو ارتقاء اس خدا کی طرف سے جاری (و ساری) ہے جو ہر شے کی موجودہ حالت سے بھی واقف ہے (شہادۃ) اور اس مقام سے بھی جہاں اس نے آخر الامر پہنچنا ہے اور جو ہنوز عام نگاہوں سے اوجھل ہے (غیب)۔ اس کا قانونِ تبدل و تحوّل بڑی قوتوں کا مالک ہے (العزیز) اور ہر شے کو وہ قالب (Pattern) عطا کرتا ہے جس میں وہ اس طرح نشوو نما پاتی ہے جس طرح بچہ رحمِ مادر میں پرورش پاتا ہے۔ (الرحیم)۔

بیج کو درخت، قطرے کو گوہر، اور خاک کے ذرّے کو انسان بننے کے لئے ان تدریجی مراحل میں سے گزرنا پڑتا ہے لیکن غور کیجئے ان تدریجی مراحل میں ہوتا کیا ہے؟ اگر کسی بیج کو گھن کھا جائے تو اسے ہزار تدریجی مراحل میں سے گزاریئے

---

[1] دوسرے مقام پر ان تدریجی مراحلِ ارتقاء کو پچاس پچاس ہزار سال بھی بتایا گیا ہے۔ (۷۰/۴)

وہ کبھی درخت نہیں بنے گا۔ یا ببول کے بیج کو لاکھ مراحل طے کرائیے اس کے درخت میں کبھی انگور نہیں لگ سکتے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس بیج میں درخت بننے (بالیدگی اور نشوونما) کی صلاحیت نہیں وہ کبھی درخت نہیں بن سکتا جس درخت میں پھل لانے کی صلاحیت نہیں وہ کبھی بارآور نہیں ہوسکتا اور جس شاخ میں جس قسم کا پھل لانے کی صلاحیت ہے اس میں اسی قسم کا پھل لگے گا۔

سلسلۂ ارتقاء سے مقصود

اب سوچئے کہ سلسلۂ ارتقاء (یا نشوونما) کے تدریجی مراحل (جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے) کرتے کیا ہیں؟ فقط اس قدر کہ یہ ان صلاحیتوں کو جو بیج کے اندر پوشیدہ ہوتی ہیں نشوونما دے کر اس کی آخری شکل میں مشہود کر دیتے ہیں۔ لہٰذا سلسلۂ ارتقا کی تمام تگ و تاز سے مقصود یہ ہے کہ اشیائے کائنات کی مضمر صلاحیتیں (Potentialitics) نشوونما (Development) پاکر اپنے نقطۂ تکمیل آخری منزل (Destination) تک پہنچ جائیں۔ بالفاظِ دیگر سلسلۂ کائنات کی تمام ہنگامہ آرائیاں اشیائے کائنات کی مضمر صلاحیتوں کو مشہود کرنے کے لئے ہیں۔[ل]

ربوبیت کے معنی

عربی زبان میں اس پورے طریق عمل (Process) کے لئے ایک جامع لفظ ہے ربوبیت۔ یعنی کسی شے کا اپنے نقطۂ آغاز سے بتدریج، آہستہ آہستہ نشوونما پاکر نقطۂ تکمیل تک پہنچ جانا۔ اسی کو تربیت کہتے ہیں اور ایسا کرنے والے کو رب۔ لہٰذا اگر ہم سابقہ بحث کو ایک فقرے میں سمٹانا چاہیں تو اسے یوں کہا جائے گا کہ کائنات کی ساری تگ و تاز اور سعی و کاوش کا مقصود ہے ربوبیت چونکہ قرآن کی رو سے یہ سب کچھ قانونِ خداوندی کے مطابق ہو رہا ہے اس لئے اللہ کا قانون، ربوبیتِ عامہ (تمام اشیائے کائنات کی ربوبیت) کا کفیل ہے۔ رب العالمین کے یہی معانی ہیں اور اسی کی وجہ سے وہ درخورِ ہزار حمد و ستائش ہے۔ (اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ) یعنی مستحق ہزار حمد و ستائش ہے اللہ کا وہ قانون جو تمام اشیائے کائنات کی ربوبیت کا کفیل ہے۔ ربوبیت کے لئے ضروری ہے کہ اس نظام کی ہر حرکت ٹھوس تعمیری نتیجہ پیدا کرے۔ اس بات کا ثبوت کہ بیج کی ربوبیت شروع ہو گئی ہے صرف یہ ہے کہ بیج سے کونپل پھوٹ نکلے۔ کونپل ایک تعمیری

ل For the development and manifestation of their latent faculties.

نتیجہ ہے جس سے اس امر کی شہادت بہم پہنچی ہے کہ نظام ربوبیت نے اپنا عمل شروع (Constructive) کر دیا ہے۔ لیکن اگر بیج سے کونپل نہ پھوٹے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس عملِ تخم ریزی کا نتیجہ تعمیری کے بجائے تخریبی (Destructive) رہا۔ یعنی بیج کی ربوبیت شروع نہیں ہوئی اور اس طرح (بیج کا درخت بننا تو ایک طرف) خود بیج بھی ضائع ہو گیا (اسے قرآن میں "خبیث" کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کی ضد "طیب" ہے)۔

حق اور باطل کا مفہوم

قرآن کی زبان میں ٹھوس تعمیری نتائج کو حق کہتے ہیں اور تخریبی نتائج کو باطل۔ چونکہ نظام ربوبیت کا قیام (و بقا) اس محکم اصول پر ہے کہ اس میں ہر حرکت کا رخ تعمیری نتائج (حق) کی طرف ہو، اس لئے قرآن نے کہا ہے کہ کائنات کو بالحق پیدا کیا گیا ہے۔

خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ (۲۹/۴۴)

اللہ نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو تعمیری نتائج کا حامل بنایا ہے۔ یقیناً اس میں ان لوگوں کے لئے (بڑی اہم) نشانیاں ہیں جو (قانون ربوبیت) پر ایمان لاتے ہیں۔

پروفیسر وہائٹ ہیڈ کہتا ہے کہ

"باطل کے غیر محکم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ کائنات میں ایسا نظم پایا جاتا ہے جو حق پر مبنی ہے۔"

(Quoted by Huxley in "Ends and Means"

لیکن ربوبیت کے ان مثبت اور تعمیری نتائج (حق کے مشہود ہونے) کے لئے دو باتیں ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ ان تمام عناصر (Elements) اور عوامل (Factors) میں جو کسی شے کی ربوبیت کا ذریعہ بنتے ہیں باہمی تعاون ہو۔ مثلاً بیج کی بالیدگی کے لئے مٹی۔ پانی۔ سورج کی روشنی اور ہوا کی ضرورت ہے۔ لیکن آپ کسی بیج کو جو بالکل صحیح و سلامت ہو اور اس میں بالیدگی اور برومندی کی تمام صلاحیتیں موجود ہوں کسی میز پر رکھ چھوڑیے اس کے پاس ہی اِدھر اُدھر (ایک دوسرے سے الگ) تھوڑی سی مٹی اور کچھ پانی رکھ دیجئے۔ ان سب کو دھوپ میں کھلا چھوڑ دیجئے اور ہوا بھی لگنے دیجئے۔ لیکن ان تمام اشیاء کی موجودگی کے بعد بھی اس بیج سے کونپل نہیں پھوٹے گی۔ بیج کی بالیدگی کے لئے ضروری ہے کہ بیج کے ساتھ مٹی۔ پانی۔ روشنی حرارت ہوا اس طرح تعاون کریں کہ وہ ایک دوسرے میں جذب و مدغم ہو جائیں۔ ان اجزا کے اس قسم کے باہمی تعاون Co-operation

بلکہ ائتلاف (Absorption) سے بیج کی مضمر صلاحیتوں کی ربوبیت ہو سکے گی۔ لہٰذا کائنات کے نظام ربوبیت میں مختلف اجزائے متعلقہ کا باہمی تعاون وائتلاف لاینفک ہے۔

اس کے ساتھ ہی دوسری چیز بھی نہایت ضروری ہے۔ بیج کو مٹی میں دبانے کے بعد، بہت زیادہ پانی دیدیجئے یا تھوڑا سا پانی دے کر بہت زیادہ حرارت پہنچائیے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس طرح بھی ربوبیت کے تعمیری نتائج پیدا نہیں ہوں گے۔ وہ بیج کبھی کونپل بن کر بے نقاب نہیں ہوگا۔ بلکہ گل سڑ کر ضائع ہو جائے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ تعمیری نتائج کی ترتیب وظہور کے لئے ضروری ہے کہ مختلف اجزائے متعلقہ میں خاص تناسب وتوازن (Proportion and balance) قائم رہے۔ جہاں یہ تناسب بگڑا، تعمیری کی جگہ تخریبی، مثبت کی جگہ منفی نتائج برآمد ہونے شروع ہو گئے اور سلسلۂ ربوبیت رک گیا۔ قرآن نے اس توازن وتناسب کو کہیں حسنات سے تعبیر کیا ہے (حسن صحیح تناسب Just proportion ہی کا نام ہے) اس کے

توازن وتناسب

مقابلے میں عدم توازن کے لئے سیّات کا لفظ آیا ہے۔ کہیں اسے اعمال صالحہ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یعنی ایسے کام جن سے ہمواریاں پیدا ہوں اور صلاحیتیں اُبھریں۔ اس کے مقابلے میں فساد کا لفظ آیا ہے جس کے معنی ناہمواری ہیں۔ کہیں اسے قوام سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے معنی توازن کا صحیح ہونا اور قائم رہنا ہے۔ اسی سے دین قیّم ہے یعنی وہ نظام جو خود بھی تناسب وتوازن کی صحت پر استوار ہو اور افرادِ معاشرہ کی صلاحیتوں میں بھی صحیح صحیح توازن قائم کر سکے اسی سے صراطِ مستقیم ہے یعنی توازن (Equilibrium) قائم رکھنے والی راہ۔ چونکہ ربوبیت کیلئے توازن کا قائم رہنا ضروری ہے، اس لئے قرآن میں ہے

اِنَّ رَبِّیۡ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ (۱۱/۵۶)

یعنی اللہ کا قانونِ ربوبیت توازن بدوش راہ پر جارہا ہے[1] اور جو معاشرہ اس قانون کی اتباع کرے گا اس میں بھی توازن قائم ہو جائے گا۔

یونانی مفکرین کا خیال تھا کہ کائنات کی حرکت دوری (Cyclic) ہے۔ یعنی اس میں حرکت تو ہے

---

[1] قرآن میں "قسطاس مستقیم" ترازو کو کہا گیا ہے جو ٹھیک ٹھیک وزن قائم رکھتی ہے۔ اس لئے صراط مستقیم کے معنی "توازن بردوش" راہ ہیں

لیکن اس حرکت سے کائنات آگے نہیں بڑھ رہی بلکہ ایک ہی حالت میں گردش کرتی رہتی ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ کائنات نے جو کچھ بننا تھا بن چکی۔ اب اس میں نہ کسی قسم کا اضافہ ہو سکتا ہے نہ نکھار۔ اس لئے اب اس کی حرکت محض محوری حرکت ہے جس میں آگے بڑھنے کا امکان ہی نہیں ہوتا، ایک ہی جگہ گھومنے کا تصور ہوتا ہے۔ یہ تصور ارتقاء کے تصور کے خلاف تھا۔ قرآن نے کائنات کی حرکت کو صراطِ مستقیم قرار دے کر یہ بتا دیا کہ اس کی حرکت دوری نہیں بلکہ آگے بڑھنے والی (Linear) ہے اس لئے کائنات کی ہر شے ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی آگے بڑھے جا رہی ہے۔

کائنات میں ارتقاء

اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ کائنات صرف ایک ہموار راستہ پر ہی نہیں جا رہی بلکہ وہ راستہ سیدھی بھی ہے اور بلندیوں کی طرف لیجانے والی بھی۔ اسی لئے اللہ کو ذِی الْمَعَارِجِ (۷۰/۳) کہا گیا ہے (معارج کے معنی ہیں بلندی کی طرف لے جانے والی سیڑھیاں)۔ لہٰذا قانونِ ربوبیت کی رو سے کائنات کی ہر شے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی اور بلندیوں کی طرف اُبھرتی چلی جاتی ہے اس میں جو تخلیقی اعادے ہوتے ہیں وہ بھی آخر الامر اس کی تکمیل کے لئے ہوتے ہیں۔ سورۂ سجدہ کی اُس آیت کو پھر سامنے لائیے جو پہلے درج کی جا چکی ہے۔ حقیقت واضح ہو جائے گی۔ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ۔ اللہ اپنی اسکیم کی تدبیر آسمان سے زمین کی طرف کرتا ہے۔ یعنی اس شے کا آغاز خدا کے مرتب کردہ نقشے کے مطابق سب سے پست نقطہ سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ قانونِ ربوبیت کے مطابق اوپر ابھرنی شروع ہوتی ہے۔ "ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْهِ" اس کا عروج اس کی طرف ہوتا ہے۔ اسی حقیقت کو سورۂ فاطر میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ۔ ہر خوشگوار نقشہ (یا نظریہ) قانون ربوبیت کے مطابق اس کی طرف بلند ہوتا چلا جاتا ہے۔ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُهٗ (۳۵/۱۰) اور اس کی یہ بلند پروازی عملِ صالح کے سہارے پر ہوتی ہے۔ یعنی قانونِ ربوبیت کے مطابق ہر شے ہمواریاں اور توازن پیدا کرنے والے پروگرام کے مطابق ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی اپنے نقطۂ تکمیل کی طرف عروج کرتی چلی جاتی ہے۔ اس طریق (Process) کو صراطِ مستقیم پر چلنا کہتے ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ جب کوئی چیز اپنے نقطۂ آغاز سے نقطۂ تکمیل تک پہنچے گی تو وہ نقطۂ تکمیل اس کے سفرِ زندگی کی منزلِ مقصود یا منتہیٰ (Destination) کہلائے گا۔ لہٰذا قانونِ ربوبیت کی رو سے ہر شے کے لئے ایک منزلِ مقصود

یا منتہا کا ہونا ضروری ہے[1]۔ اور چونکہ (جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں) پوری کی پوری کائنات نظامِ ربوبیت کے تابع چل رہی ہے، اس لئے ساری کائنات کا ایک مقصد یا منتہیٰ ہے۔ بالفاظِ دیگر کائنات بلا مقصود و منتہیٰ پیدا نہیں کی گئی۔ یہ حقیقت کہ کائنات بلا مقصد نہیں پیدا کی گئی بلکہ یہ ایک بلند مقصد کی طرف بڑھے جا رہی ہے، اب دورِ حاضر کے مفکرین کے نزدیک بھی ایک مسلمہ کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ مثلاً (Lesli Paul) اپنی کتاب (The Meaning Of Human Existence) میں لکھتا ہے کہ

> یہ بات بڑی غیر معقول دکھائی دیتی ہے کہ ایک طرف تو یہ تسلیم کر لیا جائے کہ زندگی (Dynamic) ہے اور ایک خاص سمت میں حرکت کر رہی ہے تاکہ وہ باقی رہے اور آگے بڑھے اور اس کے ساتھ ہی یہ کہا جائے کہ زندگی کے پیشِ نظر کوئی مقصد نہیں۔ اگر مقصد نہیں تو پھر زندگی کی حرکت کا کوئی تصور ہی باقی نہیں رہتا۔

اور مانچسٹر یونیورسٹی کا اناٹومی کا پروفیسر (F.W. Jones) رقمطراز ہے کہ

> اسے تسلیم کرنا پڑے گا کہ تمام ذی حیات اشیاء اور غیر ذی حیات اشیاء غرضیکہ پوری کی پوری کائنات بامقصد پیدا کی گئی ہے...... تاریخ کے جس دور میں سے ہم گزر رہے ہیں اس میں یہ احساس اور بھی تند ہو گیا ہے کہ کائنات کا یہ تمام عظیم القدر سلسلہ ایک مقصد کا ثبوت پیش کر رہا ہے۔
>
> (Design And Purpose)

[1] آپ غور کیجئے۔ ترقی (Progress) کے لئے کون کون سے عناصر ضروری ہیں۔

(i) کسی شے کا نقطۂ آغاز۔

(ii) ایک متعین راہ جس پر اسے چلنا ہے۔

(iii) وہ منزلِ مقصود جس تک اسے پہنچنا ہے۔ ترقی کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ شے قدم قدم اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھے جا رہی ہے لیکن اگر کسی راہرو کے سامنے منزلِ مقصود ہی نہ ہو تو (خواہ وہ دن بھر چلتا رہے) ہم یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ وہ ترقی کر رہا ہے۔ ترقی کا لفظ بےمعنی ہوتا ہے جب تک مقصود (Object) سامنے نہ ہو۔ ہم اپنے زمانے کو (Progressive Age) کہتے ہیں لیکن کسی کو یہ معلوم نہیں کہ وہ منزلِ مقصود کون سی ہے جس کی طرف ہمارا زمانہ (Our Age) ترقی کرتے ہوئے جا رہا ہے۔ ترقی (Progress) بغیر متعین مقصود (Without object in view) بےمعنی لفظ ہے۔

قرآن نے ایک طرف تو مثبت انداز میں یہ کہا کہ کائنات بالمقصد پیدا کی گئی ہے اور اس کے ساتھ ہی دوسری طرف منفی انداز میں یہ کہا کہ اسے یونہی بطور لہو ولعب پیدا نہیں کیا گیا۔ جو چیز حرکت تو کرے لیکن کسی منزلِ مقصود کی طرف نہ بڑھے (جیسے گرداب میں پھنسی ہوئی لکڑی) عربی زبان میں اس کے اس انداز کو لعب کہتے ہیں۔ چنانچہ جب دریا کی موجیں کسی کشتی کو حرکت میں رکھیں لیکن اسے ساحلِ مقصود کی طرف بڑھنے نہ دیں تو ایسی حالت کے لئے کہتے ہیں لعب بنا الموج۔ چونکہ کائنات بلا مقصود و منتہٰی پیدا نہیں کی گئی اس لئے

لہو ولعب قرآن میں ہے کہ۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ○ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ
وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ (۴۴: ۳۸-۳۹)

اور ہم نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے (یعنی پوری کی پوری کائنات) کو بلا مقصد و منزل (لٰعِبِیْن) نہیں پیدا کیا۔ کائنات کو بالحق (یعنی تعمیری نتائج کے ساتھ ایک منزل تک پہنچنے کے لئے) پیدا کیا گیا ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کا علم نہیں رکھتے (اور بلا علم و دلیل سمجھتے ہیں کہ کائنات یونہی بلا مقصد و منزل ظہور میں آگئی ہے)

ماحصل بحث سابقہ تصریحات سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ قرآن کی رو سے

(۱) کائنات کی ہر شے اپنے اندر کچھ صلاحیتیں رکھتی ہے۔

(۲) ہر شے کا مقصدِ زندگی یہ ہے کہ اس کی مضمر صلاحیتیں نشوونما پاکر تکمیل تک پہنچ جائیں۔

(۳) جس نہج و اسلوب یا نظام و قانون کے مطابق کسی شے کی مضمر صلاحیتیں نشوونما پاکر آہستہ آہستہ بتدریج، اپنے نقطۂ تکمیل تک پہنچ جائیں، اسے نظامِ ربوبیت کہتے ہیں اور ایسا کرنے والے کو رب۔

(۴) ربوبیت کے لئے ضروری ہے کہ اس شے کی ہر حرکت کا رُخ تعمیری نتائج مرتب کرنے کی طرف ہو کیونکہ تعمیری نتائج کے بغیر ربوبیت ناممکن ہے۔ تعمیری نتائج کو حق کہا جاتا ہے۔ اس لئے کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے۔

(۵) نظامِ ربوبیت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ مختلف اجزائے کائنات، باہمی تعاون و ائتلافات

ایک دوسرے کی ربوبیت کا ذریعہ نہیں۔ نیز یہ بھی ضروری ہے کہ ان اجزا میں ایک خاص تناسب اور توازن ہو۔ ان اجزا کے الگ الگ رہنے (انفرادی زندگی بسر کرنے) یا اُن کا توازن بگڑ جانے سے ربوبیت نہیں ہو سکتی۔ وہ توازن بدوش راہ جس پر چل کر اشیائے کائنات ربوبیت کی منازل طے کرتی ہیں، صراطِ مستقیم کہلاتی ہے۔ اور جس طریق کار سے انہیں ربوبیت حاصل ہوتی ہے اسے حسنِ عمل یا عملِ صالح کہا جاتا ہے۔

(۶) ربوبیت کی راہ (یعنی اشیائے کائنات کے ارتقائی منازل کی راہ) سیدھی بھی ہے اور بلندیوں کی طرف چڑھتی ہوئی بھی۔ اس لئے حسنِ عمل کا نتیجہ آگے بڑھنا اور سربلند ہونا ہے۔

(۷) ربوبیت میں ہر شے کے لئے ایک نقطۂ تکمیل کا ہونا ضروری ہے۔ یعنی وہ منزل جس میں پہنچ کر اس چیز کی تمام مضمر صلاحیتوں کی کامل نشو و نما ہو جائے یہی اس شے کا مقصود و منتہیٰ ہوگا۔ چونکہ ساری کائنات نظامِ ربوبیت کے تابع سرگرمِ عمل ہے اس لئے کائنات بلا مقصد و منزل نہیں پیدا کی گئی۔ اس کی ایک منزل ہے اور ایک منتہیٰ۔

ہم نے یہ دیکھ لیا ہے کہ ساری کائنات کی سعی و عمل اور تگ و تاز کا مقصد یہ ہے کہ اشیائے کائنات کی مضمر صلاحیتوں کی نشو و نما ہوتی جائے تاکہ یہ چیزیں (اس طرح) اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی، اپنے نقطۂ تکمیل تک پہنچ جائیں۔ کائنات کی ہر شے اسی تگ و تاز میں سرگرمِ عمل دکھائی دیتی ہے۔ یہ ہمارا مشاہدہ ہے اور سائنس کے اکتشافات اس کی شہادت بہم پہنچاتے ہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اپنی اپنی منزل تک پہنچنے کے لئے ان چیزوں کی راہ نمائی کون کرتا ہے؟ وہ کس ذریعے سے پہچانتی ہیں کہ ان کی منزل کا رُخ کس طرف ہے اور اس کے حصول کے لئے انہیں کیا کرنا چاہیئے؟ اس سوال کے جواب کے لئے آپ بڑی بڑی چیزوں (اجرام سماوی وغیرہ) کو چھوڑیئے اور اپنے گرد و پیش کی چھوٹی چھوٹی چیزوں پر غور کیجئے، بات اُبھر کر سامنے آجائے گی۔ آپ بط اور مرغی کے ملے جلے انڈے کسی مرغی کے نیچے سینے کے لئے رکھ دیجئے۔ جب وقتِ معینہ پر ان انڈوں سے بچے نکلیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ انڈے کا خول توڑتے ہی بط کا بچہ پانی کی طرف لپکے گا لیکن مرغی کا چوزہ خشکی پر رہے گا۔ یہ زمین سے دانا دنکا چننے لگ جائے گا۔ اور وہ اپنا سامانِ پرورش

حیوانی جبلت

پانی سے تلاش کرے گا۔ بلی کا بچہ پیدا ہوتے ہی ماں کے تھنوں کی طرف جائے گا۔ بکری کے سامنے ڈھیروں گوشت رکھا رہے وہ اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھے گی۔ اس کے برعکس شیر بھوکوں مرجائے گا، لیکن گھاس کا ایک تنکا بھی نہیں چبائے گا۔ مرغی کا چُوزہ چیل کی پرچھائیں سے سہم کر ماں کے پروں کے نیچے چھپ جائے گا اور بلی کا بچہ اُچھل کر چوہیا دبوچنے کی کوشش کرے گا۔ آپ غور کیجئے کہ وہ کون ہے جو ان پرندوں اور جانوروں کی راہنمائی اُن کے سامان و اندازِ ربوبیت و پرورش کی طرف کرتا ہے؟ انہیں اس کی تعلیم کون دیتا ہے؟ آپ اس کا ایک ہی جواب دیں گے کہ یہ سب کچھ ان کی فطرت میں داخل ہے۔ سائنس کی دنیا میں اس کا نام جبلت (Instinct) ہے۔ ان پرندوں اور جانوروں سے یہ کارساز خود جبلّی طور پر (Instinctively) ہوتے ہیں۔ اسی طرح حیوانات سے ہٹ کر دوسری چیزوں کو دیکھئے۔ پانی جب تک سیّال ہے نشیب کی طرف بہتا ہے۔ ایک خاص درجۂ برودت پر پہنچ کر منجمد ہو جاتا ہے۔ اور ایک خاص درجۂ حرارت پر بھاپ بن کر اُڑنے لگتا ہے۔ آگ ہمیشہ حرارت پہنچاتی ہے۔ آم کی گٹھلی سے ہمیشہ آم ہی پیدا ہوتا ہے۔ اشیائے کائنات کی ان خاصیتوں کو دنیائے سائنس میں قوانین فطرت (Laws of Nature) کہا جاتا ہے۔ لیکن جبلت (Instinct) ہو یا قوانین فطرت (Laws of Nature) یہ سب الفاظ ہیں جو ہم نے باہمی سمجھوتے سے وضع کر رکھے ہیں تاکہ ایک دوسرے کا مفہوم سمجھنے میں آسانی رہے۔ ورنہ یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم ہے کہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان اشیاء کے اندر یہ خاصیتیں کیوں ہیں۔ اور کون ہے جو ان پرندوں اور جانوروں پر ان کی پرورش کی راہیں کشادہ کرتا ہے؟ ہم صرف

تخلیق و ہدایت خدا کی طرف سے

اسی قدر کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب کچھ ان کے اندر (Inherent) از خود موجود ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جس قوت نے ان چیزوں کو پیدا کیا ہے وہی اُن کے سامانِ ربوبیت کی طرف اُن کی راہنمائی کرتی ہے۔ تخلیق[1] اور ہدایت (پیدا کرنا اور راہنمائی کرنا) دونوں

---

[1] ہمارے ہاں اور انگریزی میں بھی پیدا کرنے (Cneation) کے لئے ایک ہی لفظ ہے۔ لیکن قرآن میں دو الگ الگ الفاظ ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ پیدا کرنے کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ کسی شے کو عدم (Non-existenee) سے وجود (Lxistence) میں لایا جائے وہ اسے ابداع (To Originate) کہتا ہے اور اس کے لئے بدیع اور فاطر کے الفاظ استعمال کرتا ہے (بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اور فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ) لیکن پیدا کرنے کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ مختلف عناصر میں ایسی ترتیب پیدا کر دی جائے جس سے ایک نئی چیز مشہود ہو کر سامنے آجائے۔ اس کیلئے اس نے تخلیق کا لفظ استعمال کیا ہے۔ خلق کے معنی ہیں صحیح ترتیب و تناسب پیدا کرنا۔ خُلق کے معنی ہیں قوتوں میں اعتدال۔ اور خلیق اسے کہتے ہیں جسکی قوتوں میں اعتدال ہو۔ اسی سے اخلاقیات کا مفہوم سمجھ میں آسکتا ہے

خدا کی طرف سے ہیں

رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ۔　(۲۰/۵۰)

خدا کا قانون ربوبیت ہے جو ہر شے کو اس کی خلقت عطا کرتا ہے اور اس کے بعد اس کی راہ نمائی کرتا ہے۔

دوسری جگہ ہے

اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ۝ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی ۝ (۸۷/۲-۳)

وہ خدا جس نے پیدا کیا اور ہر طرح کی موزونیت عطا کر دی۔ پھر (اس کی مضمر صلاحیتوں کے) پیمانے مقرر کر دیئے (کہ وہ کس حد تک بار آور ہو سکتی ہیں) اور پھر (ان کی ربوبیت کی) راہ نمائی کر دی۔

نظریہ نجائی ارتقاء (Emergent Evolution) کا مؤید (بلکہ ایک معنی میں موجد) پروفیسر لائڈ مارگن (C. Lloyd Morgan) لکھتا ہے کہ۔

میرا عقیدہ ہے کہ جانداروں میں ارتقائے نفس خدا کے عمل تخلیق اور ہدایت (Creative and Directive Power of God) کا رہین منت ہے۔

(The Great Design)

خدا کی یہ راہ نمائی (ہدایت) مختلف اشیائے کائنات میں کس طرح کار فرما ہے، قرآن نے اسے وحی کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ وحی کے معنی ہیں "نہایت خفیف لیکن بہت تیز اشارہ۔ یعنی وہی چیز جسے مارگن خدا کی (Directive Power) کہتا ہے۔ قرآن میں ہے کہ خدا کی یہ راہنمائی (وحی) تمام کائنات میں کار فرما ہے۔

کائنات میں وحی

وَاَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا　(۴۱/۱۲)

اور خدا نے ہر ایک آسمان (سماء۔ بلندی) میں اپنے امر (تدبیر) کو وحی کر دیا۔ ارض کے متعلق ہے

بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰی لَهَا　(۹۹/۵)

"یہ اس لئے کہ میرے رب نے اسے ایسا کرنے کی وحی کر رکھی ہے۔" اسی طرح شہد کی مکھی کے متعلق ہے کہ

وَ اَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِىْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا يَعْرِشُوْنَ ۝ ثُمَّ كُلِىْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِىْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ؕ يَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (۱۶/۶۸-۶۹)

اور دیکھو تمہارے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کر دی کہ پہاڑوں میں، درختوں پر اور ان ٹٹیوں پر جو اس غرض سے بلندی پر بنائی جاتی ہیں اپنا چھتہ بنائے۔ پھر ہر طرح کے پھولوں سے رس چوستی پھرے اور اپنے رب کے قانون کے مطابق پوری فرمانبرداری کے ساتھ مصروفِ عمل ہو جائے۔ (دیکھو! اس عمل کا نتیجہ یہ ہے کہ) اس کے پیٹ سے مختلف رنگتوں کا رس نکلتا ہے جس میں انسان کے لئے شفا ہے۔ بلاشبہ ان کوائف میں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں ایک دلیلِ راہ ہے

اس آیت میں وحی (خدا کی راہ نمائی کی صفت) کے علاوہ ایک اور اہم حقیقت بھی سامنے آگئی۔ کائنات کی ہر شے اس قانون (ہدایت) کے مطابق جو اس کے لئے تجویز کر دیا گیا ہے، نہایت حزم و احتیاط اور کمال مستعدی و فرماں پذیری کے ساتھ مصروفِ عمل ہے۔ آسمان کے عظیم الجثّہ اور مہیب کرّے، چاند، سورج، ستارے زمین اور اس کے آسمان بوس پہاڑ، تلاطم انگیز سمندر اور دریا، دوسری طرف چھوٹے سے چھوٹے زندگی کے خلیّات (Life Cells) اور فضا میں پھیلے ہوئے غیر مرئی جراثیم ہر ایک اپنے اپنے قانون ربوبیت کی فرمانبرداری میں منہمک ہے۔ کسی کو اس سے یارائے سرکشی نہیں کسی

کائنات میں اتباعِ قانون

کو مجالِ انکار نہیں۔ اگر سورج اپنی رفتار میں سیکنڈ کے ہزارویں حصے کے برابر بھی کمی بیشی کر دے۔ اگر زمین اپنے راستے سے ایک انچ کے کروڑویں حصے کے برابر بھی ہٹ جائے۔ اگر پانی ایک ثانیہ کے لئے بھی اپنی "فطرت" بدل لے۔ اگر ہوا ایک لمحہ کے لئے بھی اپنا رُخ آپ متعین کرلے۔ تو کائنات کی یہ تمام محیّر العقول کارگہ "نظم و ضبط" فضا کی پہنائیوں میں بھک سے اُڑ جائے۔ یہ تمام نظم و ضبط صرف اس لئے قائم ہے کہ کائنات کی ہر شے قوانین خداوندی کے سامنے سربسجود ہے۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۱۳/۱۵)

کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب خدا کے قانون کے سامنے سجدہ ریز ہے۔

ہر شے اس کے قانون کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی اور اپنے اپنے فرائض مفوضہ کی سر انجام دہی میں سرگرم عمل ہے۔

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ (۵۷/۱)

کائنات کی ہر شے قوانینِ خداوندی کے مطابق اپنے فرائض کی تکمیل میں سرگرم عمل ہے[1]۔

ہر شے اپنی تمام قوتوں کو ان مقاصد کے حصول کے لئے صرف کرتی ہے جو اس کے لئے متعین کر دیئے گئے ہیں۔ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ۔ ہر شے اس قانونِ ربوبیت کے لئے قانت ہے (سقائے قلیت اس شکیزے کو کہتے ہیں جس سے پانی یونہی نہ ٹپکتا رہے بلکہ اس کا منہ اسی جگہ کھلے جہاں پانی ڈالنا مقصود ہو۔)

اسلام کا مفہوم

قانونِ خداوندی کی اس طرح اطاعت کا نام اسلام ہے۔ آلِ عمران میں ہے:

وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ (۳/۸۲)

کائنات کی ہر شے اس کے قانون کے سامنے سرِ تسلیم خم کئے ہے۔ طوعاً و کرہاً۔ اور ان اشیاء کی تمام حرکتیں اسی محور کے گرد گردش کرتی ہیں۔

اس سے اُس "اسلام" کے معنی سامنے آگئے جو آفاقی کائنات میں نافذ العمل ہے۔ یعنی اُس قانون اور نظام کی اطاعت جس سے ہر شے کی مضمر صلاحیتیں نشوونما پا کر نقطۂ تکمیل تک پہنچ جائیں۔ بالفاظِ دیگر اسلام کے معنی ہیں نظامِ ربوبیت کی تکمیل۔ سلام کے معنی ہیں نقائص اور نامکمیت سے بری ہونا Immunity from faults or imperfections)۔ سلّم، مکمل کو کہتے ہیں جس میں کوئی کمی نہ رہ گئی ہو۔ اَسْلَمَ الزرع کے معنی ہیں کھیتی کا اس حد تک نشوونما پا جانا کہ اس میں بال آجائیں (اس سے نشوونما کی تکمیل کا مقصد سامنے آجاتا ہے)۔ متسالم کے معنی ہیں گھوڑوں کا آپس میں اس طرح پاؤں ملا کر چلنا کہ کوئی آگے پیچھے نہ رہے اور ایک دوسرے کو مشتعل نہ کرے (اس سے باہمی تعاون اور ائتلاف کا تصور سامنے آجاتا ہے جو ربوبیت کے لئے

---

[1] سبح کے معنی ہیں کسی کام کو اپنی پوری وسعت اور قوت کے ساتھ کرنا۔ گھوڑے کا اس طرح دوڑنا کہ اس کی چاروں ٹانگیں پوری وسعت سے کھل جائیں۔ یا کسی کا اس طرح تیرنا کہ اس کے ہاتھ پوری وسعت سے پھیل جائیں اسی سے تسبیح کے معنی سمجھ میں آسکتے ہیں۔

نہایت ضروری ہے)

ان تصریحات سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ

(۱) اسلام کے معنی ہیں، اس نظام کا قیام اور تکمیل جس میں ہر شے کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہو جائے یعنی نظامِ ربوبیت کی تکمیل۔

(۲) کائنات کی تمام اشیاء اس نظام کے قیام و تکمیل کے لئے بلا چون وچرا سرگرمِ عمل ہیں۔ اسی کا نام صراطِ مستقیم پر چلنا ہے۔

ہم نے اس وقت تک صرف "اشیائے کائنات" کا ذکر کیا ہے۔ انسان کا ذکر نہیں کیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسان بھی کائنات کا ایک جزو ہے، لیکن اس میں اور دیگر اشیائے کائنات میں، ایک ایسا بنیادی

انسان اور دیگر اشیائے کائنات میں فرق

فرق ہے جس کے باعث یہ کائنات میں ہوتے ہوئے بھی کائنات سے الگ ہے۔ یہ بنیادی فرق ہے اس کا اختیار وارادہ ہم نے دیکھا ہے کہ کائنات کی ہر شے قانونِ خداوندی کی اتباع واطاعت میں بلا چون وچرا سرگرمِ عمل ہے۔ ان میں سے کسی کو اس کا اختیار نہیں کہ وہ اس قانون سے ذرا بھی سرکشی اختیار کر سکے، یا اپنے لئے کوئی دوسرا قانون تجویز کرلے۔ پانی کو یہ اختیار نہیں کہ جی چاہے تو نشیب کی طرف بہے اور جی چاہے تو فراز کی طرف رُخ کرے۔ آگ کو اس کا اختیار نہیں کہ کبھی حرارت پہنچائے اور کبھی ٹھنڈک کا موجب بن جائے۔ سورج کو اس کا اختیار نہیں کہ کسی دن جی میں آئے تو آدھا سفر کر کے پھر پیچھے لوٹ جائے۔ زمین کو یہ اختیار نہیں کہ کبھی تھوڑے سے وقت کے لئے سستانے کو ٹھہر جائے۔ مرغی کے چوزے کو یہ اختیار نہیں کہ وہ خشکی کی بجائے پانی میں جا گھسے۔ بکری کو یہ اختیار نہیں کہ وہ گھاس کی بجائے گوشت کھانا شروع کر دے۔ حتیٰ کہ شیر جیسے صاحبِ قوت و دبدبہ شاہ نیستاں کو بھی اتنا اختیار نہیں کہ وہ کچے گوشت کی بجائے سیب اور انگور کھانے لگ جائے۔ لیکن اس کے برعکس، انسان کے بچے کو دیکھئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ پیدا ہونے کے ساتھ ہی وہ بھی اپنے رزق کے سرچشموں کی طرف اسی طرح لپک کر جاتا ہے جس طرح ایک بکری کا بچہ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی

کیفیت یہ ہے کہ وہ سنکھیا کی ڈلی کو بھی اسی بے تکلفی سے منہ میں ڈال لیتا ہے، جس طرح مصری کے ٹکڑے کو۔ وہ کبھی آگ میں ہاتھ ڈال دیتا ہے۔ کبھی پانی میں کود پڑتا ہے۔ کبھی آنکھوں پر مرچیں لگا لیتا ہے۔ کبھی صابن کھا لیتا ہے۔ یہ تو اس کے بچپن کی کیفیت ہے۔ اب بڑا ہو جاتا ہے تو اس کا اختیار و ارادہ اور گُل کھلاتا ہے۔ جہاں تک اس کی جسمانی پرورش کا تعلق ہے اس کے لئے بھی وہی قوانین و ضوابط مقرر ہیں جو دوسرے حیوانات کے لئے متعین ہیں۔ بھوک کے لئے کھانا۔ پیاس کے لئے پانی۔ تکان کے بعد نیند۔ اسی سے اس کے جسم کی پرورش (ربوبیت) ہوتی ہے۔ تحفظِ ذات (Preservation of Self) کا جذبہ ہر ذی حیات کی جبلّت (Instinct) میں موجود ہے۔ یہی جذبہ انسان کے اندر بھی ہے۔ یہ بھی اپنی جان کی حفاظت کے لئے سب کچھ کر گذرتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انسان ایک ایسی چیز بھی کر سکتا ہے، جو کوئی دوسرا حیوان نہیں کر سکتا۔ یعنی خودکشی۔ یہ اس لئے کہ حیوانات، قانونِ ربوبیت پر کاربند رہنے کے لئے مجبور ہیں اور انسان صاحبِ اختیار ہے جی چاہے تو قانونِ ربوبیت کی اطاعت کرے اور جی چاہے تو اسے توڑ دے۔ شین (F. J. Sheen) کے الفاظ میں

> جمادات اور حیوانات کی زندگی کا مقصد خدا کی طرف سے عائد کردہ ہوتا ہے لہٰذا وہ ایک متعین پروگرام پر چلنے کے لئے مجبور ہوتے ہیں۔ ان کے برعکس انسان اپنے اختیار و ارادہ کی بنا پر اپنا مقصد اور نصب العین آپ متعین کرنے پر قادر ہے (Philosophy Of Religion)

اس کا یہی اختیار ہے جس نے اس مسئلہ کو جو باقی کائنات میں کوئی مسئلہ ہی نہیں اس کے لئے مشکل ترین مسئلہ (The most difficult problem) بنا دیا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل ذرا آگے چل کر بیان کی جائے گی کہ وہ سوال (یعنی مسئلہ ربوبیت)، جو باقی کائنات میں اس قدر سادہ اور آسان تھا۔ انسان کی دنیا میں اس قدر مشکل اور پیچیدہ کیسے بن گیا کہ اس کی ساری تگ و تاز اسی مسئلہ کے حل کی تلاش میں صرف ہو گئی۔ اس وقت صرف اتنا دیکھئے کہ جس مسلک و منہاج پر دیگر کائنات کا کاروبارِ ربوبیت چل رہا ہے انسان کی دنیا میں پہنچ کر وہ مسلک و منہاج بالکل بدل جاتا ہے۔ باقی کائنات میں ہر شے کے اندر وہ قانون موجود ہے جس کی رُو سے اس کی مضمر صلاحیتوں کی نشو و نما ہو سکتی ہے اور ہر شے اس قانون کی اطاعت پہ

مجبور ہے۔ اس کے برعکس انسان کا قانونِ ربوبیت (یعنی وہ قانون جس کی رو سے اس کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوگی) نہ تو خود اس کے اندر موجود ہے[1] اور نہ ہی یہ اس کی اطاعت پر مجبور پیدا کیا گیا ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب

(۱) ہر شے کی ہدایت (راہ نمائی) کا ذمہ خود خدا نے لیا تھا۔

(۲) باقی اشیائے کائنات میں یہ راہ نمائی (وحی) کے اندر رکھ دی گئی۔

(۳) اور انسان کے اندر یہ ہدایت نہیں رکھی گئی۔

تو پھر انسان کو ہدایت کیسے ملے گی؟ انسان کو یہ ہدایت (راہ نمائی) بھی خدا ہی کی طرف سے ملے گی۔ لیکن اس کا طریق مختلف ہوگا۔ باقی اشیائے کائنات کی صورت میں، ہدایت کی وحی، ہر شے کے اندر از خود رکھ دی گئی ہے۔ لیکن

انسان کے لئے ہدایت

انسان کی صورت میں، یہ وحی خدا کے فرستادہ بندوں کی وساطت سے ملتی ہے جنہیں رسول کہا جاتا ہے۔ یہی وہ ہدایت ہے جس کے متعلق اولاد آدم (نوعِ انسان) سے کہا گیا کہ

فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ (۲/۳۸)

اور یاد رکھو جب کبھی ایسا ہوگا کہ ہماری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے گی۔ سو جو لوگ اس ہدایت کی اتباع کریں گے تو انہیں نہ خوف ہوگا نہ حزن۔

دوسری جگہ ہے:

اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیْ فَمَنِ اتَّقٰی وَ اَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ

---

[1] یہ تصور کہ نیکی اور بدی کی تمیز، خیر و شر کی تفریق، حق و باطل کا امتیاز خود انسان کی فطرت کے اندر موجود ہے صحیح نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تحفظِ ذات (Preservation of Self) یا تولیدِ نسل (Procreation) کی حیوانی جبلت (Animal Instinct) سے آگے انسان کی کوئی فطرت ہی نہیں۔ اس کے اندر مختلف قسم کی صلاحیتیں ہیں جن کی نشوونما (Development) اور صحیح استعمال اس کا مقصودِ زندگی ہے۔

عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۳۸/۲)

جب ایسا ہوگا کہ تمہارے پاس تم ہیں سے پیغامبر آئیں گے جو ہمارے پیغامات تم تک پہنچائیں گے سو جو لوگ
اس ہدایت سے ہم آہنگی پیدا کریں گے اور صلاحیت بخش روش اختیار کریں گے تو انہیں نہ خوف ہوگا نہ حزن۔

لہٰذا باقی کائنات اور انسان میں پہلا فرق یہ ہے کہ دیگر اشیائے کائنات کی صورت ہیں ہدایتِ خداوندی (وحی) ہر شے کے اندر ودیعت کر کے رکھدی گئی ہے، لیکن انسان کی صورت میں یہ ہدایت (وحی) ان ہی میں سے منتخب کردہ پیغامبروں کی وساطت سے ملے گی۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ دیگر اشیائے کائنات قانونِ ربوبیت کی اطاعت پر مجبور ہیں۔ اس کے برعکس انسان کو ربوبیت کا راستہ دکھا دیا گیا ہے۔ اور اس کے بعد یہ اس کے اختیار پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو ربوبیت کی صحیح راہ اختیار کرے اور چاہے تو اس کی ضد، دوسری راہ پر چل نکلے۔

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (۱۰/۹۰)

ہم نے انسان کو دونوں راستے دکھا دیئے ہیں۔

دوسری جگہ ہے۔

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا (۳/۷۶)

ہم نے اسے (ربوبیت کا) رستہ دکھا دیا ہے۔ اب چاہے وہ اس راہ کو اختیار کرے اور چاہے اس سے انکار کر دے۔

قانونِ ربوبیت عطا کرنے والے (خدا) کی طرف سے انسان کو تعمیری نتائج پیدا کرنے والا نظام دے دیا گیا ہے۔ اس کے بعد اس پر کوئی زبردستی نہیں کی گئی۔ اگر اس کا جی چاہے تو اس نظام کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالے اور چاہے تو اُسے چھوڑ کر دوسرا نظام اختیار کرلے۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (۲۹/۱۸)

اُن سے کہدو کہ تمہاری ربوبیت کا قانون دینے والے کی طرف سے تعمیری نتائج کا ضامن نظامِ حیات آچکا ہے۔ اب جس کا جی چاہے اسے اپنی زندگی کا نصب العین بنالے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کردے۔

یہ ہے دوسرا فرق انسان اور دیگر اشیائے کائنات میں۔

تصریحات بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ

(i) جہاں تک مقصود و منتہیٰ کا تعلق ہے انسان اور دیگر اشیائے کائنات کے لئے ایک ہی نصب العین متعین کیا گیا ہے۔ یعنی ہر شے (اور انسانوں کی دنیا میں ہر فردِ انسانیہ) کی مضمر صلاحیتوں کی مکمل نشوونما۔ اسے ربوبیت کہتے ہیں۔

(ii) اس مقصد کے حصول کے لئے خدا کی طرف سے راہ نمائی ملتی ہے اشیائے کائنات میں یہ راہنمائی از خود موجود ہوتی ہے۔ اور انسانوں کو خارجی طریق (اللہ کے رسولوں کی وساطت) سے ملتی ہے

(iii) اس ہدایت کے مطابق ربوبیت کی تکمیل کا نام اسلام ہے۔

(iv) دیگر اشیائے کائنات، اسلام کو از خود (مجبوراً) اختیار کئے ہوئے ہیں۔ لیکن انسان کو یہ مسلک (نظام ربوبیت) اپنے اختیار و ارادہ سے اختیار کرنا ہوگا۔ بس یہ فرق ہے انسان اور دیگر کائنات میں۔ یعنی دونوں کے سامنے نصب العین ایک ہے اور اس نصب العین کے حصول کا ذریعہ بھی ایک۔ لیکن اشیائے کائنات اس ذریعہ کو مجبوراً اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اور انسان کو کھلا چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اس نظام کو اپنی مرضی سے اختیار کرے۔ سورۂ آل عمران میں اس حقیقت کو نہایت واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے جب کہا کہ

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ (۳/۸۲)

کیا یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اس نظام کے علاوہ جو خدا نے مقرر کیا ہے کوئی دوسرا نظام اختیار کرلیں۔ حالانکہ (یہ حقیقت ان کے سامنے بے نقاب ہے کہ) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کی ہر شے اسی نظام کو طوعاً و کرہاً اختیار کئے ہوئے ہے۔ اور ان کی ہر حرکت اسی محور کے گرد گردش کرتی ہے۔

یعنی ساری کائنات اس مسلک اور نظام (دین) کو اختیار کئے ہوئے ہے جو اسے ربوبیت کے حصول کے لئے دیا گیا ہے۔ انسان بھی اسی کائنات کا ایک جزو ہے اس لئے ظاہر ہے کہ اسے بھی وہی نظام اختیار کرنا چاہیئے۔ یہ بات بالکل واضح اور بصیرت پر مبنی ہے اس لئے عقل و دانش کا یہی تقاضا ہونا چاہیئے۔ یہ نظام وہ ہے جو حضرات انبیائے کرام

کی وساطت سے نوعِ انسانی کو دیا جاتا رہا۔ اس لئے ہر صاحبِ فہم و بصیرت انسان کو یہی نظام اختیار کرنا چاہیئے۔

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (۸۴/۳)

اُن سے کہدو کہ ہم اسی نظام کو اپنا نصب العین بناتے ہیں جو ہماری ربوبیت کے ضامن (خدا) کی طرف سے ہمیں ملا ہے اور جو اس سے پہلے ابراہیم۔ اسمٰعیل۔ اسحاق۔ یعقوب اور ان کی اولاد پر نازل کیا گیا تھا۔ اور جو موسیٰ۔ عیسیٰ اور دیگر انبیاء کی وساطت سے انسانوں کو ملا۔ یہ ایک ہی نظام تھا جو شروع سے آخر تک انسانوں کو ملتا رہا۔ اس لئے ہم) اس نظام کے لانے والوں میں باہدگر کوئی فرق نہیں کرتے۔ ہم اسی نظام کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔

اسلام | اس کا نام اسلام ہے۔ یعنی ربوبیت کی تکمیل کا وہ ضابطہ جو ساری کائنات میں جاری و ساری ہے اور جس کی اطاعت میں خود نوعِ انساں کی مضمر صلاحیتوں کی نشو و نما کا راز سربستہ ہے۔ لہٰذا اس نظام کے علاوہ کوئی اور نظام ایسا نہیں ہو سکتا جو اس مقصد کے حصول کا ذریعہ بن سکے۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (۸۴/۳)

جو شخص اس ضابطہ (اسلام) کے علاوہ کسی اور ضابطہ کو اپنا نظام بنائے گا تو قانونِ کائنات کی رُو سے وہ نظام قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ (کیونکہ وہ ربوبیت کے حصول کا ذریعہ نہیں بن سکتا)۔ جو شخص کسی دوسرے نظام کو اختیار کرے گا وہ (ابتداءً کیسا ہی خوش آیند کیوں نہ ہو) آخر الامر نظر آجائے گا کہ اس کا نتیجہ خسارہ ہی رہا۔

خلاصۂ مبحث | اس ساری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ۔ اسلام اس نظامِ زندگی کا نام ہے جس میں ہر شے کی مضمر صلاحیتیں پوری نشو و نما پا کر اپنے نقطۂ تکمیل تک جا پہنچتی ہیں۔ کائنات اس نظام کو از خود اختیار کئے ہوئے ہے۔ لیکن انسان نے یہ نظام اپنی مرضی

سے اختیار کرنا ہے۔ یعنی خدا کا ایک ہی قانون ہے جو ساری کائنات میں جاری و ساری ہے۔ انسان سے باہر خارجی کائنات میں یہ قانون از خود نافذ العمل ہے لیکن انسان نے اس قانون کو اپنی مرضی سے اختیار کرنا ہے۔ لہذا جہانتک انسان کا تعلق ہے، اسلام کے معنی ہیں "انسانی معاشرہ کو خدا کے کائناتی قانون کے مطابق متشکل کرنا"۔ انسانوں کے لئے یہ کائناتی قانون وحی کے ذریعے ملتا ہے اور آج یہ وحی قرآن کے اندر محفوظ ہے۔ بنا بریں اسلام کے معنی ہیں انسانی معاشرہ میں خدا کے نظامِ ربوبیت کو جاری کرنا۔

باب دُوم

انسان کیا ہے؟

ہم سابقہ باب میں دیکھ چکے ہیں کہ کائنات کی ہر شے کی تگ وتاز کا مقصد یہ ہے کہ اس کی مضمر صلاحیتیں پورے طور پر نشو ونما پاکر مقامِ تکمیل تک پہنچ جائیں۔ یہی مقصد انسانی زندگی کا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر ہم یہ دیکھنا چاہیں کہ انسان اس مقصد میں کامیاب ہوا ہے یا نہیں۔ اور اگر ہوا ہے تو کس حد تک۔ تو اس کے لئے ہمیں پہلے یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ انسان کی مضمر صلاحیتیں (Realisable potentialities) ہیں کیا؟ اور اس کے لئے ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ خود انسان کیا ہے؟ اس باب میں دو نظریئے ہیں جو انسانی تاریخ میں شروع سے آج تک برابر چلے آرہے ہیں۔ ایک نظریہ وہ ہے جسے میکانکی تصورِ حیات (Mechanical concept of life) کہا جاتا ہے۔ اسی نظریہ کو فلسفۂ مادیت (Materialism) بھی کہتے ہیں۔

میکانکی نظریۂ حیات

اس مقام پر اس کی ضرورت نہیں (اور نہ ہی اس کتاب کا یہ موضوع ہے) کہ یہ بتایا جائے کہ اس فلسفہ کی تاریخ کیا ہے اور اس میں یونانی مفکر دیمقریطس (Democritus - B.C. 470) کے زمانے سے (جو اس فلسفہ کا موجد تصور کیا جاتا ہے) آج تک کیا کیا تغیرات واقع ہوتے رہے ہیں[1]۔ اس وقت موضوعِ زیرِ بحث کے اعتبار سے صرف اتنا سمجھ لینا ضروری

[1] ان امور کی تفصیل معارف القرآن کی پانچویں جلد میں آئے گی جو اس وقت زیرِ ترتیب ہے۔

ہے کہ اس نظریہ کی رو سے انسان کی زندگی، فقط طبیعی زندگی (Physical Life) تک محدود ہو جاتی ہے۔ اس فلسفہ کی رو سے انسان سے مفہوم صرف اس کا جسم ہے۔ جسم کی مشین طبیعی قوانین کے مطابق چل رہی ہے۔ جب یہ مشین چلتے چلتے رُک جائے گی تو انسان کی زندگی ختم ہو جائے گی۔ اس کے بعد اس مشین کے اجزا منتشر (Disintegrate) ہو جائیں گے اور یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ نہ انسان کے جسم میں گوشت پوست۔ خون۔ ہڈیوں (وغیرہ) کے سوا کچھ اور ہے اور نہ ہی موت کے بعد اس کا کچھ باقی رہتا ہے۔

وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ۝ (۴۵/۲۴ ؛ ۶/۲۹)

اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے۔ اسی میں ہم پیدا ہوتے اور مر جاتے ہیں اور ہماری موت زمانہ کی گردش سے واقع ہو جاتی ہے۔ ان کا یہ خیال علم پر مبنی نہیں۔ محض ظن و قیاس کی اتباع ہے۔

چنانچہ فرائڈ (Freud) کا قول ہے کہ

"کاروانِ زندگی کا منتہیٰ موت ہے"

(Quoted by Slochower in "No Voice Is Wholly Lost")

اس تصور کی رُو سے نہ تو کائنات کے سامنے کوئی مقصد ہے اور نہ ہی انسان کے سامنے کوئی منزل۔

درنگاہش آدمی آب و گل است

کاروانِ زندگی بے منزل است

لہٰذا اس نظریہ کی رُو سے انسانی تگ و تاز کا مفہوم جسمِ انسانی کی پرورش (اور افزائشِ نسل) کے سوا اور کچھ نہیں۔ یعنی اُن کے نزدیک ربوبیت سے مراد جسمِ انسانی کی پرورش ہے اور بس۔ اس اعتبار سے انسان اور دیگر حیوانات میں کوئی فرق نہیں۔

اسی نظریہ کے مطابق کائنات کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ مادہ کے ذرات اور توانائی (Energy)

کسی نہ کسی طرح وجود میں آگئے۔ اس کے بعد ان ذرات اور توانائی میں اندھی نطرت کے قوانین کے ماتحت تغیرات واقع ہونے شروع ہو گئے۔ ان ہی تغیرات سے یہ سلسلۂ کائنات جاری ہے۔ جب توانائی کم ہو جائے گی تو ان ذرات کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ اور اس طرح یہ تمام سلسلۂ کائنات درہم برہم ہو کر فنا ہو جائے گا۔ لہٰذا نہ تو کائنات کے پیچھے کوئی ایسی اعلیٰ ہستی ہے جو اپنے حکیمانہ تدبر سے اس سلسلہ کو چلا رہی ہے اور نہ ہی انسانوں سے اوپر کوئی ایسی ذات ہے جو سفرِ زندگی میں ان کی راہ نمائی کر سکتی ہے۔ انسانی راہ نمائی کے لئے عقلِ انسانی کافی ہے۔ عقل کے علاوہ کوئی اور سرچشمۂ علم نہیں ہے۔ اس لئے خدائی رہنمائی (وحی) کا تصور بھی باطل ہے چنانچہ لینن کہتا ہے کہ

> مادہ پرست ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ہم تسلیم کریں کہ حقِ مطلق وہی ہے جسے ہمارے حواس ہم پر منکشف کر دیں۔ عقلِ انسانی اس قابل ہے کہ یہ حقِ مطلق کا علم بہم پہنچا دے۔ درحقیقت اس نے یہ علم بہم پہنچایا ہے۔ (ایضاً)

مختصر الفاظ میں اس نظریہ کی رُو سے

(i) انسان کی زندگی اس کے جسم کی زندگی ہے اس کے بعد انسان کا کچھ باقی نہیں رہتا۔

(ii) انسانی زندگی کا سارا مسئلہ "روٹی کا مسئلہ" ہے۔ اور

(iii) اس مسئلہ کا حل انسانی عقل سے دریافت کیا جا سکتا ہے۔

یہ میکانکی نظریۂ حیات یورپ میں انیسویں صدی میں اپنے شباب پر تھا۔ وہاں کی موجودہ تہذیب اسی نظریہ کے برگ و بار کا نام ہے لیکن بیسویں صدی میں خود یورپ کے سائنسدان اور مفکرین، کائنات اور انسانی زندگی کے متعلق مزید انکشافات اور تحقیقات کے بعد ایک اور نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ

> اب اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں کوئی دشواری نہیں رہی کہ زندگی محض طبیعیاتی اور کیمیاوی کیفیات کی پیدا کردہ نہیں۔ بلکہ یہ ان مادی کیفیات سے پہلے سے موجود تھی۔ اور ہمیشہ سے موجود تھی اور اس امر کے باور کرنے میں بھی کوئی دشواری نہیں کہ اس مادی کائنات کے پیچھے ایک اور دنیا ہے جس کی تعبیرات کی روشنی میں ہمارے حیاتیاتی اصولوں کو عملاً منطبق ہونا چاہیئے۔ لہٰذا زندگی کے مسئلہ کو

طبیعیاتی اور کیمیاوی مسئلہ سمجھنا ہی غلط ہے۔ زندگی اور انسان کی ذات (Personality)
کا وجود اس حقیقت کی دلیل ہے کہ کائنات کی محض مادی تعبیر ناممکن ہے۔"

(Prof. J.S. Haldane; in "The Philosophical Basis Of Biology")

زندگی کی ابتدا کے متعلق، اور تو اور ڈاروِن (جو مغرب میں نظریۂ ارتقاء کا امام تصور کیا جاتا ہے) اپنی کتاب (Origin Of Species) کے آخر میں لکھتا ہے کہ

زندگی کے اس تصور میں ایک عظمت ہے۔ زندگی مختلف قوتوں کی مظاہر ہے بسب سے پہلے خالقِ حیات نے زندگی کی روح متعدد پیکروں میں پھونکی ہو یا ایک ہی پیکر میں۔ یہ حقیقت اپنی جگہ پر رہتی ہے کہ اس تمام عرصہ میں جبکہ یہ کرۂ ارض فطرت کے اٹل قانون کے ماتحت اس طرح گردش کرتا رہا زندگی کی اس سادہ سی ابتدا سے اس قدر متنوع پیکر اس حسن و رعنائی کے ساتھ نمودار ہوتے گئے اور ہوتے جارہے ہیں۔

انسانی ذات (Human Personality) کے متعلق جس کی طرف پروفیسر ہالڈین نے اوپر اشارہ کیا ہے (Sorley) لکھتا ہے کہ

انسانی ذات چند خصائص و رجحانات ہی کا مجموعہ نہیں بلکہ یہ شعوری زندگی کا ایک نیا مرکز اور شعوری سرگرمیوں کا ایک نیا سرچشمہ ہے۔

(Moral Values And The Idea Of God)

نفسِ انسانی انسانی ذات۔ نفس (Self) یا آنا (Ego) کے وجود کا سرچشمہ کیا ہے۔ اس کے متعلق پروفیسر لائڈ مارگن (جس کا تعارف پہلے ہو چکا ہے) لکھتا ہے کہ

میں اپنے اس عقیدہ کا اعتراف کرتا ہوں کہ نفسِ انسانی کے ارتقاء کو ایک "نفسِ اعلیٰ" کا مظہر سمجھنا چاہیئے۔ "نفسِ اعلیٰ" جو ان تمام اشیاء کا خالق ہے جسے ہم "جدید" سے تعبیر کرتے ہیں میں اس ارتقائے نفس کے اندر یہ دیکھتا ہوں کہ اوپر سے نیچے اور اوّل سے آخر تک ایک عظیم الشان

تدبیر عمل پیرا ہے۔ میرا یہ بھی عقیدہ ہے کہ فطرت کی ہر شے میں یہ ارتقائی بالیدگی خدا کی عاملیت (Divine Agency) ہی کا مظاہرہ ہے..... یہ نفسِ اعلیٰ لامحدود ہے اور زمان و مکان کی قیود سے بے نیاز۔ اس کی ذات کے لئے اول، اور آخر اور جدت، اور اعادہ کے الفاظ ان معانی میں استعمال نہیں کئے جا سکتے جن معانی میں یہ نفسِ انسانی سے بحث کرتے وقت استعمال ہوتے ہیں۔ وہ ذاتِ قدیم اور واجب الوجود ہے۔ ارتقا کی پیداوار نہیں۔ بلکہ خود ارتقا کی بڑھتی ہوئی صورت اس کا پرتو ہے۔

(The Great Design)

نفسِ انسانی (روح۔ یا ذات یا انا) کے متعلق برگسان لکھتا ہے:

یہ ایک ایسی چیز کا نام ہے جو منتشر (Decompose) نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ یہ مرکب نہیں بسیط ہے۔ یہ (Incorruptible) ہے۔ اس لئے کہ یہ غیر منقسم (Indivisible) ہے اور اپنی ذات کے اعتبار سے ناقابلِ فنا (Immortal) ہے۔

(The Two Sources Of Morality And Religion)

اس موضوع پر مغربی مفکرین اور ائمۂ طبیعیات کے بہت سے اقوال پیش کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ عنوانِ زیرِ نظر کے لئے اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ نفسِ انسان کے خصائص۔ اس کی نشو و ارتقاء کے ذرائع و اسباب اور اس کے مستقبل کے متعلق مزید گفتگو باب چہارم (قرآنی نظریۂ حیات) میں کی جائے گی جو اس موضوع کے لئے مناسب مقام ہے۔ اس مقام پر ہم صرف اس قدر بتانا چاہتے تھے کہ مغرب کے مفکرین اور سائنس دان اب خود میکانکی نظریۂ حیات کو چھوڑ کر ایک جداگانہ نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں جس کی رُو سے

(i) انسان صرف مادی جسم کا نام نہیں جو عام قوانینِ طبعی کے ماتحت ایک مشین کی طرح چل رہا ہے اور اس کے اجزاء کے انتشار سے اس کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ بلکہ

(ii) انسان، جسم کے علاوہ ایک اور چیز بھی رکھتا ہے جسے اس کی ذات یا نفس کہا جاتا ہے اور جو ناقابلِ فنا ہے۔ اور (لائڈ مارگن کے الفاظ میں) اس نفسِ اعلیٰ کا پرتو ہے جو زمان و مکان کی حدود سے ماورا اور مادی سہارے سے مستغنی ہے۔

قرآنِ کریم اس دوسرے نظریے کا حامل ہے اور اُس نے اِس حقیقت کو اپنے بلیغ حکیمانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ زندگی اپنے مختلف تخلیقی مدارج طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی آئی ہے۔ اس کی ابتدا طین (درجۂ جمادات سے ہوئی)

قرآنی تصوّرِ حیات

بَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ (۳۲/۷)

تخلیقِ انسانی (کی اسکیم) کا نقطۂ آغاز مٹی سے ہوا۔

زندگی، جمادات کی تہوں میں جو خواب تھی کہ پانی کے چھینٹے نے اس میں حرکت پیدا کی۔

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۖ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ (۲۱/۳۰)

اور ہم نے ہر جاندار شے کو پانی سے بنایا- کیا یہ لوگ اس حقیقت پر یقین نہیں رکھتے!

یہاں سے سلسلۂ ارتقا آگے بڑھا اور نباتات تک پہنچا۔

وَاللَّهُ أَنْبَتَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ نَبَاتًا (۷۱/۱۷)

اللہ نے تمہیں زمین سے اُگایا- ایک طرح کا اُگانا۔

اس کے بعد یہ سلسلۂ ارتقا حیوانات کے درجے میں پہنچا جہاں تخلیقی کاروبار تولید و تناسل کی رو سے آگے بڑھا۔

خُلِقَ مِنْ مَاءٍ دَافِقٍ (۸۶/۶)

اسے پیدا کیا اس پانی (نطفہ) سے جو اُچھل کر رحم میں گرتا ہے۔

درجۂ حیوانات تک یہ سلسلہ اسی طرح چلا آیا- اب اس کے بعد زندگی اس مقام میں داخل ہوتی ہے جسے منزلِ انسانیت کہا جاتا ہے- یہیں سے وہ اہم فرق پیدا ہوتا ہے جو انسان کو دیگر تمام حیوانات سے ممتاز کر دیتا ہے- اس کے لئے سورۂ سجدہ کی متعلقہ آیات کو مسلسل سامنے رکھئے (جن میں سے ایک آیت اوپر دی گئی ہے)

الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ ۖ وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ (۳۲/۷)

۱؎ ہم نے اس مقام پر سلسلۂ ارتقا کے ضمن میں ایک ایک آدھ آدھ آیت پر اکتفا کیا ہے۔ قرآن اور نظریۂ ارتقا کی تفاصیل کے لئے معارف القرآن جلد دوم ملاحظہ کیجئے۔

اللہ وہ ہے جس نے ہر شے کی خلقت میں حسن کارانہ تناسب قائم کیا۔ (اور یہ سب کچھ تدریجاً ارتقائی طور پر ظہور میں لایا گیا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں) انسان کی تخلیق کی ابتدا طین سے کی گئی۔

اس کے بعد ہے:-

ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ (۳۲/۸)

پھر (اسے مختلف تخلیقی مدارج طے کراتے ہوئے اس مقام تک لے آیا) جہاں اس کی نسل کا سلسلہ حقیر سے پانی (نطفہ) کے خلاصہ سے ٹھہرایا۔

اس درجۂ حیوانی کے بعد (ثُمَّ سَوّٰىهُ ۳۲/۹) اس میں ہر طرح کا اعتدال پیدا کیا۔ اس کے بعد (وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ ۳۲/۹) "اللہ نے اس میں اپنی توانائی پھونک دی"۔ یہ ہے وہ مقام جہاں یہ دیگر حیوانات سے متمیز ہو گیا۔ یعنی اس میں الوہیاتی توانائی (Divine Energy) آ گئی جو کسی اور حیوان کے حصے میں نہیں آئی۔ اسی کا نام انسانی ذات یا نفس ہے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟

نفخ روحِ خداوندی

وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ (۳۲/۹)

اور اس نے تمہیں ذرائع علم یعنی سماعت۔ بصارت اور قلب (Mind) عطا کیا۔

یہ "روحِ خداوندی" کی کرشمہ سازیاں ہیں، جن سے ایک پیکرِ آب و گِل، دانا و بینا انسان، کائنات کا جانِ مدعا بن گیا۔ یہ نفخ روح کیا ہے؟ اور انسان پر اس کا کیا اثر پڑا؟ یہ ایک الگ داستان ہے۔ اس وقت ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ قرآن کی رُو سے انسان کا ایک حصہ تو وہ ہے جو عام حیوانات کی طرح طبیعی جسم پر مشتمل ہے اور جو ان ہی قوانین کے تابع سرگرم عمل ہے جو دوسرے حیوانات پر نافذ ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے جسے "روحِ خداوندی" کہا گیا ہے۔ قرآن اسے "نفسِ انسان" کہہ کر پکارتا ہے۔ لہٰذا انسان مشتمل ہے (۱) جسم اور (۲) نفس[1] پر (Body and Mind)۔ یعنی اس کا بدن جو طبیعیاتی قوانین کے ماتحت مصروفِ حرکت

---

[1] ہم نے نفس کے لئے (Mind) کا لفظ استعمال کیا ہے اس لئے کہ انگریزی میں عام طور پر (Body) کے مقابلہ میں (Mind) ہی آتا ہے۔ ورنہ نفسِ انسانی ذات (Personality) یا خودی (Self) کا نام ہے۔

رہتا ہے اور انسانی ذات (خودی یا آنا یا نفس) جو ان قوانین کے تابع نہیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ مغرب کے مادئیین (Materialists) نے یہ نظریہ قائم کیا کہ کائنات مادّی گردشوں کا نام ہے اور انسان عناصر کی ترتیب سے وجود میں آگیا ہے۔ جب یہ ترتیب عناصر بکھر جائے گی تو انسان ختم ہو جائے گا۔ یعنی ان کے نزدیک سب کچھ مادہ ہی مادہ (Matter) ہے۔ مادہ ہی اصلِ کائنات ہے۔ مادہ کے سوا اور کسی شے کی کوئی حقیقت نہیں۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، اس نظریہ کی ابتدا یونان کے مفکر دیمقراطیس سے ہوئی تھی۔

افلاطونی نظریہ

لیکن یونان کے ایک دوسرے مفکر افلاطون (Plato) نے ایک اور نظریہ پیش کیا جو مذکورہ صدر نظریہ کی بالکل ضد تھا۔ اس نے کہا کہ یہ تمام کائنات فریبِ تخیل ہے۔ اس کی کوئی اصل نہیں۔ اس کا وجود محض سایہ ہے، حقیقت نہیں۔ یہ نظریہ افلاطون کے زمانہ سے لیکر آج تک مختلف زمانوں میں مختلف مذاہب اور مختلف مکاتبِ فکر کے ہاں مختلف پیکروں میں چکر لگاتا چلا آرہا ہے۔ ہندومت کے ہاں ویدانت میں اسی تصور کے ماتحت کائنات کو مایا (فریب) اور سراب قرار دیا گیا۔ اسی کے ماتحت بدھ مت کے ہاں دنیا کو قابلِ نفرت ٹھیرایا گیا۔ اسی تصوّر کو سینٹ پال کی[1] عیسائیت نے اپنایا اور حقیقی دنیا "آسمان کی بادشاہت" کو قرار دیا اور جسم کے تقاضوں سے فرار کو رہبانیت کے مقدس نقاب میں چھپانے کی کوشش کی (رہبانیت کا مادہ رَہَبْ ہے جس کے معنی ڈرنے کے ہیں)، یہی نظریہ تصوّف کی روح بنا جس نے دنیا کو ناثبات قرار دیکر اس سے ترکِ علائق کی تلقین کی۔

اگر ربوبیت کے نقطۂ خیال سے دیکھئے (جس کے لئے یہ تمام تفاصیل بیان کی گئی ہیں)، تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ مادئیین کے نزدیک ربوبیت سے مقصود ہوگا جسم کی پرورش (کیونکہ وہ انسان میں جسم کے علاوہ اور کسی شے کے قائل ہی نہیں)، اور اس کا ذریعہ قرار دیں گے عقلی وسائل (کیونکہ وہ عقل سے ماورا کسی اور سرچشمۂ علم و ہدایت کو مانتے نہیں)۔ اس مسلک و منہاج کا نتیجہ انسانیت کے حق میں کیا ہوگا، اس کے متعلق آیندہ

---

[1] یاد رہے کہ موجودہ عیسائیت سینٹ پال (اور اس کے متبع مفکرین) کی اختراع ہے۔ جناب مسیح کی عیسائیت اس سے مختلف تھی۔

باب میں گفتگو کی جائے گی۔ باقی رہے دوسرے نظریہ کے قائل۔ سو ان کے متعلق آپ کے دل میں خیال پیدا ہوتا ہوگا کہ اُن کے نزدیک ربوبیت سے مراد ہوگی "روح کی پرورش" یعنی ایسا مسلک جس سے انسان کی روح نشوونما پاکر ایک مستقل حیثیت حاصل کرلے۔ لیکن آپ کو یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ اُن کے نزدیک بھی مقصودِ حیات یہ نہیں۔

نفس کشی اُن کا عقیدہ یہ ہے کہ روحِ انسانی (آتما) برہما (خدا) کی روحِ اعلیٰ (پرماتما) کا ایک جزو ہے۔ یہ جزو اپنے اصل سے الگ ہوکر مادی دنیا (پراکرتی) کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ مقصدِ حیات یہ ہے کہ اس روح کو ان زنجیروں سے آزاد کرایا جائے تاکہ یہ جزو اپنی اصل سے جا ملے۔ انسانی آرزوئیں اس مقصد کے حصول میں حائل ہوتی ہیں اس لئے اس کا علاج ترکِ آرزو ہے۔ یعنی دنیا اور اس کے متعلقات سے اس طرح کنارہ کشی کی جائے کہ انسان کے دل میں کوئی آرزو ہی پیدا نہ ہو۔ انسان جس قدر جسمانی لذائذ اور دنیاوی حظائظ سے اجتناب برت کر نفس کشی کرتا جائے گا، اسی قدر یہ بندھن ڈھیلے پڑتے جائیں گے۔ جب نفس کو پوری طرح فنا کرلیا جائے گا تو یہ زنجیریں ٹوٹ جائیں گی اور پھر انسانی روح اپنی اصل میں جاکر ضم (Absorb) ہو جائے گی۔ یہی منتہائے زندگی ہے۔ یہ نظریہ، بدھمت، ویدانت، عیسائیت سب میں چکر لگاتا چلا آرہا ہے۔ فرق صرف نام اور لباس میں ہے۔ روح ہر جگہ ایک ہے۔ اور (بدبختی سے) یہی روح ہمارے ہاں کے تصوف میں بھی کارفرما چلی آرہی ہے۔ ترکِ دنیا۔ ترکِ لذائذ۔ ترکِ خواہشاتِ انسانی سعی و عمل کا منتہیٰ ہے۔ اس لئے کہ دنیا جیل خانہ ہے جس میں انسانی روح مقیدؔ ہے۔ انسان نفس کشی سے وہ مقام حاصل کرلیتا ہے جس میں تمام دنیاوی زنجیریں ٹوٹ جاتی ہیں۔ اور روح ذاتِ خداوندی میں پھر سے مدغم ہو جاتی ہے۔ اسی کو واصل بالحق ہونا کہتے ہیں۔ یعنی روح کا حق (خدا) کے ساتھ جاکر مل جانا۔ یہی وجہ ہے کہ بزرگوں کی موت کو موت نہیں کہتے بلکہ یوں کہتے ہیں کہ ان کا "وصال" ہوگیا۔ یعنی جزو اپنی اصل سے جاکر مل گیا)۔ یہی روح کا منتہیٰ ہے۔ اسی میں اس کی مسرتوں کا راز پنہاں ہے۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

وحدتِ وجود اور ویدانت اُسی فکر کے مظاہر ہیں جس کا چشمہ سرزمین یونان سے پھوٹا اور ساری دنیا میں ایسی دلدل پیدا کرگیا کہ آج تک انسانیت اس میں تابکمر ڈوبی ہوئی ہے اور اس سے نجات کی کوئی راہ نہیں

ملتی۔ یہ افلاطونی فکر، بقول اقبالؒ

گوسفندے در لباسِ آدم است ۔ حکم او بر جانِ صوفی محکم است

بر تخیلہائے او فرماں رواست ۔ جام او خواب آور و گیتی رباست

قوم ہا از سُکرِ او مسموم گشت

خفت و از ذوقِ عمل محروم گشت

تصریحات بالا سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی کہ

(۱) مادیئین کے نزدیک ربوبیت سے مراد جسمِ انسان کی پرورش ہے جسے انسانی عقل کے ذریعے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اور

(۲) "روحانیین" کے نزدیک زندگی کا مقصود نفس (یا روح) کی ربوبیت نہیں بلکہ نفس کشی ہے۔ اور روح کا منتہیٰ اپنے آپ کو روحِ اعلیٰ میں فنا کر دینا۔

اوّل فنا۔ آخر فنا۔ ظاہر فنا۔ باطن فنا۔

لہٰذا ربوبیت کے نقطۂ نظر سے روحانیین کا مسلک تو اس قابل ہی نہیں کہ اس کے متعلق کوئی بحث کی جائے۔ البتہ مادیئین کا مسلک مزید گفتگو کا متقاضی ہے۔ اسے آیندہ باب میں دیکھئے۔

باب سوم

ربوبیت ــــ مادئین

(میکانکی نظریۂ حیات کے قائلین)

کے نقطۂ نظر سے

مادیئین کے (میکانکی تصورِ حیات کے) مطابق:

(۱) انسان سے مراد صرف جسمِ انسانی ہے۔ لہٰذا ان کے نزدیک ربوبیت سے مراد ہے جسم کی پرورش یعنی روٹی۔ کپڑا اور دیگر ضروریاتِ زندگی کا مہیا ہو جانا۔

(۲) جسم کی ربوبیت کا مسئلہ عقل کی رو سے حل ہو سکتا ہے۔ عقل کے علاوہ کوئی قانون ایسا نہیں جس کا فیصلہ ماننے کے قابل ہو۔

آیئے اب دیکھیں کہ اس مسلک کا عملی نتیجہ کیا ہے۔ یہ حقیقت کسی دلیل کی محتاج نہیں کہ تحفظِ خویش (Preservation of Self) ہر ذی حیات کا طبعی تقاضا ہے۔ یعنی جہاں بھی زندگی (Life) ہے۔ اس کا تقاضا اپنے آپ کی حفاظت ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے کیڑے سے لیکر انسان تک ہر نفس میں تحفظِ خویش کا تقاضا موجود ہے۔ یعنی ہر ذی حیات اپنی حفاظت اور بقا کے لئے انتہائی جدوجہد کرتا ہے۔ حیوانات کی سطح تک یہ تقاضا جبلّی طور پر (By instinct) پورا ہوتا رہتا ہے۔ لیکن انسان کی دنیا میں جبلّت سے

عقل کا تقاضا

آگے عقل بھی آجاتی ہے۔ یعنی انسانی زندگی میں تحفظِ خویش عقل کا تقاضا ہے وہ مامور ہی اس لئے ہے کہ وہ اس فرد کی حفاظت کرے جس کی وہ عقل ہے۔ میری عقل میری حفاظت چاہے گی۔ آپ کی عقل آپ کی حفاظت۔ یعنی ہر فرد کی عقل اس کی حفاظت چاہے گی۔ اسے کسی دوسرے فرد کی حفاظت سے سروکار نہیں ہوگا۔ اگر کسی سینما ہال میں آگ لگ جائے تو تماشائیوں میں سے ہر شخص بے تحاشا دروازے کی طرف بھاگ اُٹھے گا۔ اس بھگدڑ میں کسی کو دوسرے کا ہوش نہیں رہے گا۔ اس افراتفری کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آگ سے اتنی جانیں ضائع نہیں ہوتیں جتنی ہال کے دروازوں میں اس بھیڑ کی وجہ سے تلف ہو جاتی ہیں۔ ہر شخص دوسروں کو روندتا ہوا آگے نکل جانے کی فکر کرتا ہے۔ یہ اس لئے کہ ہر شخص کو اپنی جان پیاری ہے۔ وہ ہر حالت میں اپنی جان بچانا چاہتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ دیجئے کہ وہ اپنے ساتھ اپنے بچوں کی جان بچانے کی بھی فکر کرتا ہے۔ یہ بھی وہی جذبہ ہے جو حیوانات میں جبلّی طور پر موجود ہوتا ہے۔ دیکھئے! بلی۔ کتیا۔ گائے۔ بکری۔ کس طرح اپنے بچوں کی حفاظت کرتی ہیں۔ لیکن اگر کبھی ایسا وقت آجائے کہ ماں اور بچے میں سے صرف ایک کی جان بچ سکتی ہو تو ماں اپنی جان بچانے کی فکر پہلے کرے گی۔ بچوں کو چھوڑ جائے گی۔ مثل مشہور ہے کہ بندریا کے پاؤں جلنے لگے تو اس نے اپنے بچے کو پاؤں تلے رکھ لیا تھا۔ انسانوں میں بھی یہ واقعات دیکھنے میں آتے ہیں کہ ماں باپ نے بچوں کو بیچ کر اپنے لئے سامانِ زیست خرید لیا۔ بہرحال اگر ہم اس لطیف بحث میں نہ بھی جائیں تو بھی یہ حقیقت اپنی جگہ پر مسلّم ہے کہ

انسانی عقل صرف اس فرد کا تحفظ چاہتی ہے جس کی وہ عقل ہے۔ اسے اپنی حفاظت کے مقابلے میں دوسروں کی حفاظت کی فکر نہیں ہوتی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان اپنے ساتھ اپنے بچوں کی حفاظت بھی کرتا ہے۔

یہ ہوا پہلا کلیہ۔

اب آگے بڑھئے۔ تحفظِ خویش کا تقاضا حیوانات میں بھی ہے۔ لیکن حیوانات کل (Tomorrow) کا تصوّر نہیں رکھتے۔ یہ صرف انسان کی خصوصیت ہے کہ وہ فردا کا تصوّر بھی کر سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسانی عقل آج کی روٹی

حیوانات فردا کا تصوّر نہیں رکھتے

کے فکر سے فارغ ہو کر کل کی روٹی کی فکر بھی شروع کر دیتی ہے۔ اور چونکہ انسان کو اس کا علم نہیں کہ اس نے کتنا عرصہ زندہ رہنا ہے اس لئے اس کی فکر فردا لامتناہی (Indefinite and unlimited) ہو جاتی ہے

آپ ایک گائے کو دیکھئے۔ جب تک اس کا اپنا پیٹ نہیں بھرتا وہ کسی دوسری گائے کو چارے کے پاس نہیں آنے دیتی۔ اسے اس کا احساس تک بھی نہیں ہوتا کہ دوسری گائے کس قدر بھوکی ہے۔ اس کی ضرورت اس سے کتنی زیادہ ہے۔ اسے فقط اپنے پیٹ کی فکر ہوتی ہے لیکن جوں ہی اس کا پیٹ بھر جاتا ہے، وہ نہایت اطمینان سے بیٹھ کر جگالی کرنے میں مصروف ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اسے اس کی پرواہ نہیں ہوتی کہ باقی ماندہ چارہ کون لیجا رہا ہے اور کون کھا رہا ہے۔ وہ اس چارے کو شام کے لئے سنبھال کر نہیں رکھتی۔ اسے جمع کرنے کی فکر نہیں ہوتی (اس میں شبہ نہیں کہ بعض چیونٹیاں وغیرہ خوراک جمع کرتی رہتی ہیں لیکن اول تو یہ مستثنیات میں سے ہیں دوسرے یہ کہ ان کا یہ عمل غیر شعوری طور پر محض عادتاً ہوتا ہے۔ ان کی عقل اس کا فیصلہ نہیں کرتی کہ انہیں خوراک جمع کر کے رکھنی چاہیئے تاکہ کل کے کام آسکے۔ عام حیوانات کا ہر حال یہی شیوہ ہے کہ وہ 'کل' کی فکر سے بے نیاز ہوتے ہیں) لیکن انسانی عقل کی یہ کیفیت ہے کہ وہ ہمیشہ جمع کرنے کی فکر میں لگی رہتی ہے۔ بڑھاپے میں انسان کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ اس کی موت قریب آ رہی ہے۔ اس سے امکان تھا کہ انسان جمع کرنے کی ہوس کو مختصر کر دے لیکن یہاں اسے اولاد کی فکر دامنگیر ہو جاتی ہے۔ یعنی انسان اپنے مرنے کے بعد اپنی اولاد کی شکل میں زندہ رہنے کی آرزو رکھتا ہے۔ لہٰذا تحفظ خویش کے بعد اولاد کی حفاظت کی فکر دامن پکڑ لیتی ہے اور اس طرح یہ سلسلہ لامتناہی ہوتا چلا جاتا ہے۔ حیوانات میں نہ 'کل' کی فکر ہوتی ہے اور نہ ہی کچھ وقت کے بعد اولاد کی فکر۔ اس لئے ان کی انفرادی زندگی ان کی ذات تک محدود ہوتی ہے۔ لیکن انسان پہلے اپنے لئے۔ پھر اپنی اولاد کے لئے جمع کرنے اور اسے سمیٹ کر رکھنے کی دھن میں ایسا منہمک ہوتا ہے کہ اسے کسی دوسرے کے مفاد اور بہبود کا خیال ہی نہیں آنے پاتا۔ اور اس کی یہ ہوس قبر کے کنارے تک ساتھ رہتی ہے۔

یہ ہوگئی دوسری بات۔ یعنی

(۱) عقل کا تقاضا اس فرد کا تحفظ ہے جس کی وہ عقل ہے۔

(۱۱) انسان اپنے تحفظ کے لئے جمع کرنے اور اسے سمیٹ کر رکھنے کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتا ہے اور

(iii) اس کے ساتھ ہی اپنے بعد اپنی اولاد کی حفاظت کی فکر میں الجھ جاتا ہے۔

اب ایک قدم اور آگے بڑھئے۔ حیوانات کی کسی نوع (Species) کو لیجئے (مثلاً جنگل کے ہرن) ان میں سے ہر ایک ہرن کی ذہنی استعداد کم و بیش یکساں ہوتی ہے[1]۔ اس لئے ان میں اونچ نیچ کا سوال نہیں ہوتا۔ ان میں سے کوئی ہرن دوسرے ہرن کو دھوکا نہیں دیتا۔ وہ دھوکا دینے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ دھوکہ دینے کے لئے ضروری ہے کہ ایک کی ذہنی استعداد دوسرے سے زیادہ ہو۔ نہ ہی ان کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ ایک ہرن اپنے لئے زیادہ "کماکر" رکھے۔ وہاں نہ تو کمانے کا سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی کما کر جمع رکھنے کا،

ذہنی استعداد کا فرق

لیکن انسانوں کی دنیا میں ایک فرد کی ذہنی استعداد دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک فرد میں دوسرے فرد کی نسبت کمانے کی استعداد زیادہ ہوتی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ ایک فرد دوسرے فرد کو دھوکا دے سکتا ہے۔ آپ غور کیجئے۔ انسانی معاشرہ میں چھین جھپٹ کی بنیاد کیا ہے! عقول کی جنگ (Battle of wits) جس کی عقل تیز ہے وہی کامیاب ہے۔ کوئی کند ذہن۔ غبی۔ بیوقوف کسی عقلمند کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ وہ ہمیشہ دھوکا کھاتا ہے۔ مختلف منصوبے۔ تدابیر۔ اسکیمیں۔ سب عقل و خرد کے کرشمے ہیں اسی سے انسان زیادہ سمیٹتا ہے اسی سے معاشی طبقات (Economic classes) وجود میں آتے ہیں۔ عقل اس طبقاتی تقسیم و تفریق کے دلائل بہم پہنچاتی ہے وہ معاشرہ یا مملکت (Society or State) جسے دنیا اس وقت تک مثالی (Ideal) سمجھتی آرہی ہے افلاطون (Plato) کی جمہوریت (Republic)[2] میں ملتی ہے۔ اس میں عقلی دلائل کا پورا زور اس چیز کو ثابت

---

[1] حیوانات میں استعداد نوعی ہوتی ہے، انفرادی نہیں مثلاً جس قسم کا گھونسلا ایک بیا بناتا ہے اسی قسم کا سب بئے بناتے ہیں۔ جس قسم کا چھتہ ایک شہد کی مکھی بناتی ہے اسی قسم کا ہر مکھی بناتی ہے۔ پھر ان کی یہ استعداد عمر کے ساتھ بڑھتی نہیں۔ مکھی کی جو استعداد پہلے دن ہوتی ہے، وہی استعداد ساری عمر رہتی ہے۔ اسی طرح مکھیوں کی جو استعداد ہزار سال پہلے تھی وہی استعداد آج ہے۔ ان کے برعکس، انسان میں ہر فرد میں اختلاف استعداد ہوتا ہے۔ ایک فرد کی عمر کے مختلف حصوں میں اختلاف استعداد ہوتا ہے اور انسانوں کا اختلاف استعداد تاریخ کے مختلف ادوار میں بھی ہوتا ہے۔

[2] افلاطون کی اس کتاب کا نام جمہوریت یا (Republic) درست نہیں۔ نفس مضمون کے لحاظ سے اس میں جمہوریت کا

(باقی صفحہ ۳۳ پر)

کرنے میں صرف کیا گیا ہے کہ بعض لوگ پیدائشاً غلام (Slaves) ہوتے ہیں اس لئے انہیں غلام رکھنا عین منشائے فطرت ہے۔ بعض لوگ پیشہ ور (Artisans) ہوتے ہیں۔ بعض سپاہی (Warriors) اور ایک طبقہ ہے جو حکومت کرنے کیلئے پیدا ہوتا ہے۔ انہیں محافظین (Guardians) کہا جاتا ہے۔ انسانوں کی یہ تقسیم پیدائشی ہے اور اس تقسیم کو علی حالہٖ برقرار رکھنا منشائے فطرت کے عین مطابق ہے۔ یعنی افراد کے عقلی تفاوت کو بنیاد قرار دے دیا گیا ہے طبقاتی تقسیم کی اور پھر اس تقسیم کو عین منشائے فطرت ٹھہرا دیا گیا ہے۔ یہ وہی نظریہ ہے جو ہندو دھرم میں ورنوں (ذاتوں) کی تقسیم (Caste-system) کا موجب بنا۔ ہم نے افلاطون یا ہندو دھرم کا ذکر محض تمثیلاً کر دیا ہے، ورنہ ساری دنیا میں انسانی معاشرہ اسی نہج پر چل رہا ہے۔ نام کچھ ہی رکھ لیجئے، روح ہر جگہ ایک ہی کارفرما ہے کہ انسانوں کی تقسیم عقلی تفاوت کی بنا پر ہوتی ہے۔ جس کی عقل زیادہ ہے اس میں اکتسابِ دولت کی استعداد زیادہ ہے۔ وہ دوسروں کو دھوکا بھی دے سکتا ہے اور اسے اس کی ہنرمندی اور چابکدستی قرار دیا جاتا ہے۔ اس طرح ایک فرد زیادہ دولت سمیٹ کر جمع کرتا ہے اور اپنی اولاد کے لئے وراثت چھوڑ جاتا ہے۔ اب یہ اولاد اس وراثتی سرمایہ کی بنیاد پر سوسائٹی میں ممتاز حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ اس طرح ان لوگوں کا شمار طبقۂ اعلیٰ (Upper class) میں ہوتا ہے۔ ان کے برعکس جن میں عقل کی کمی ہو (یا وہ غریب جنہیں وراثت میں جائیداد نہ ملے) وہ ہیزم کش (مزدور) رہتے ہیں اور اسی نسبت سے معاشرہ میں ان کا مقام متعین کیا جاتا ہے۔

اس کے جواز میں دلیل بھی بڑی واضح ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ جو شخص اپنی ذہنی استعداد کی بنا پر زیادہ کماتا ہے وہ اس کمائی کا مالک ہے۔ اسے اس سے محروم کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ اس دلیل کی بنا پر آپ اس کی ملکیت کی کوئی حد نہیں مقرر کر سکتے وہ جس قدر کما سکتا ہے کمائے اور اس دولت سے مشینیں۔ فیکٹریاں۔ فرمز (Firms) بنک جو جی میں آئے خریدتا اور بناتا چلا جائے۔ اس طرح اس کی آمدنی اور زیادہ ہو جائے گی اور اس کی املاک بھی آگے بڑھتی چلی جائیں گی۔ یوں رزق کے سرچشمے اس کی انفرادی ملکیت میں آتے جائیں گے اور دوسرے افراد پر

صفحہ ۳۴ کا بقیہ فٹ نوٹ) تھوڑی نہیں۔ افلاطون۔ طبقۂ اعلیٰ کی مستقل اجارہ داری اور بلاشرکتِ غیرے حقِ حکومت کا نظریہ پیش کرتا ہے۔ اس لئے اس کی مملکت جمہوریت ہونے کی بجائے بڑی کاجعت پسندانہ ہے۔ جہاں تک اس کتاب کے نام کا تعلق ہے اس کا یونانی نام مملکت (State) یا دستور (Constitution) تھا۔ جو لاطینی ترجمے اور وہاں سے انگریزی میں جا کر جمہوریت یا ریپبلک ہو گیا۔

نظامِ سرمایہ داری

(اسی نسبت سے) رزق تنگ ہوتا جائے گا اس کا نام سرمایہ داری (Capital-ism) ہے۔ لہٰذا سرمایہ داری کے خلاف آپ کوئی عقلی دلیل پیش نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ سرمایہ داری کا نظریہ اور نظام خود "عقل" ہی کا تو پیدا کردہ ہے اور چونکہ میکانکی نظریۂ حیات کی رو سے عقل سے ماوراء کوئی اور دلیل اور برہان نہیں، اس لئے آپ میکانکی تصورِ حیات کو صحیح مانتے ہوئے سرمایہ داری کو ناجائز قرار دے ہی نہیں سکتے۔ کارل مارکس سرمایہ داری کے نظام کا سب سے بڑا دشمن سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس نظام کے خلاف وہ بھی کوئی عقلی دلیل پیش نہیں کر سکا۔ اور چونکہ وہ خود میکانکی تصورِ حیات کا قائل تھا اس لئے وہ اس کے

کارل مارکس کی دلیل

خلاف عقل سے ماوراء کوئی اور (مثلاً اخلاقی) دلیل بھی نہیں لا سکتا تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس نے سرمایہ داری کے نظام کی مخالفت کس "دلیل" پر کی ہے؟ اس نے کہا کہ ہمیں تاریخ بتاتی ہے کہ دنیا میں کوئی نظام علیٰ حالہٖ قائم نہیں رہ سکتا۔

..... ہر ایک نظام کچھ وقت تک چلتا ہے اس کے بعد اس نظام کے اندر سے خود اس نظام کے خلاف شگوفے پھوٹتے ہیں اور اس طرح یہ پہلا نظام تباہ ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ دوسرا نظام لے لیتا ہے جو اس پہلے نظام کی ضد ہوتا ہے۔ چونکہ آج کل نظام سرمایہ داری رائج ہے اس لئے مذکورہ صدر تاریخی اصول کی بنا پر یہ نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ نظام بدلے گا اور اس کی جگہ ایک ایسا نظام آئے گا جو اس نظام کی ضد ہوگا۔ یعنی موجودہ نظام، دولت مندوں، سرمایہ داروں اور زمینداروں کا ہے اور وہ آنے والا نظام (اس کی ضد یعنی) غریبوں مزدوروں اور کسانوں کا نظام ہوگا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ دنیا کے نظاموں میں یہ سلسلہ استبدال و استخلاف (Substitution and succession) کس قوت کی بنیاد پر جاری ہے تو اس نے کہا کہ یہ سب کچھ تاریخی وجوب (Historical Necessity) کی بنیاد پر ہو رہا ہے۔ اس وقت ہمیں اشتراکیت کی تفاصیل میں جانے اور اس نظریۂ تاریخی وجوب پر بحث و تنقید کی ضرورت نہیں۔ اس وقت صرف اتنا بتانا مقصود ہے کہ دنیائے سرمایہ داری کا سب سے بڑا دشمن کارل مارکس بھی نظامِ سرمایہ داری کے خلاف کوئی عقلی دلیل نہیں لا سکا۔ اسے اس کے لئے "تاریخی وجوب" کی اندھی قوت کا سہارا لینا پڑا۔

حاصلِ مبحث

یہاں تک ہم نے یہ دیکھ لیا کہ میکانکی تصورِ حیات کی رو سے۔

(i) انسانی ربوبیت سے مراد جسم انسانی کی پرورش ہے۔

(ii) انسانی جسم کی پرورش کا نظام عقل کی رو سے قائم ہوتا ہے۔

(iii) عقل کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس فرد کا تحفظ کرے جس کی وہ عقل ہے۔ اسے کسی دوسرے کی حفاظت سے سروکار نہیں ہوتا۔

(iv) ہر شخص (یا اس کی عقل) اپنی حفاظت کے لئے زیادہ سے زیادہ جمع کرنے اور سمیٹنے کی فکر میں منہمک رہتا ہے اور جب اپنے آپ سے آگے بڑھتا ہے تو اپنی اولاد کی حفاظت کے لئے جمع کرنا شروع کر دیتا ہے۔

(v) مختلف افراد میں عقل کا تفاوت موجود ہوتا ہے۔ اس لئے مختلف افراد میں دولت کمانے کی استعداد بھی مختلف ہوتی ہے۔

(vi) جس کی عقل زیادہ ہوتی ہے وہ زیادہ سے زیادہ کما کر اپنی ملکیت میں اضافہ کرتا جاتا ہے اور جوں جوں انفرادی ملکیتیں زیادہ ہوتی جاتی ہیں عامۃ الناس کا رزق تنگ ہوتا جاتا ہے۔ اسی کو سرمایہ داری کہتے ہیں۔

(vii) انسان کی عقل سرمایہ داری کے خلاف کوئی دلیل نہیں بہم پہنچا سکتی۔ اس لئے کہ یہ نظام خود عقل ہی کی پیداوار ہے۔

(viii) اس طرح انسانی معاشرہ میں طبقات کی تقسیم ہوتی جاتی ہے۔ اور اس کی زنجیروں کے حلقے دن بدن تنگ اور مضبوط ہوتے چلے جاتے ہیں۔

اب اور آگے بڑھئے۔ آپ کسی دولتمند سے کہتے ہیں کہ وہ ایک غریب آدمی کی مدد کرے۔ وہ کہتا ہے کہ میں اس کی مدد کیوں کروں؟ غور کرنے پر آپ کو اندازہ ہوگا کہ آپ کے پاس اس سوال کا عقلی جواب کوئی نہیں۔ آپ یہی کہہ سکتے ہیں کہ انسانی

غریب کی مدد کیوں کی جائے؟

ہمدردی کا تقاضا ہے کہ غریبوں کی مدد کی جائے۔ لیکن یہ اپیل تو اس کے جذبات سے ہے (انسانی ہمدردی کا تعلق جذبات سے ہے) عقلی دلیل نہیں۔ اگر وہ اس پر بھی آپ کی بات نہیں مانتا تو آپ اس کے متعلق یہی کہیں گے کہ

وہ بڑا سنگدل شقی القلب، بے رحم انسان ہے۔ یہ نہیں کہیں گے کہ بڑا بے وقوف ہے۔ یعنی آپ یہ نہیں کہیں گے کہ اس کا یہ انکار بے عقلی کی دلیل ہے۔ یہی کہیں گے کہ وہ انسانیت کے بلند جذبات وخصائص سے عاری ہے۔ لیکن میکانکی نظریۂ حیات کی رو سے انسانیت کے بلند اور پست جذبات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان کے نزدیک انسان نام ہے صرف جسم کا۔ لہٰذا وہاں کمزور جسم اور طاقتور جسم کا تو سوال پیدا ہوگا۔ جسمانی راحت اور تکلیف کا موازنہ ہوگا لیکن جسم سے آگے کسی اور چیز کا سوال ہی سامنے نہیں آئے گا۔

آپ اس دولت مند کو زیادہ سے زیادہ یہ عقلی دلیل دے سکتے ہیں کہ اگر کل کو تم بھی غریب ہو گئے تو تمہیں بھی دوسروں کی امداد کی ضرورت پڑے گی۔ اس لئے تمہیں چاہیئے کہ آج اس غریب کی مدد کرو۔ لیکن اگر وہ اس کے جواب میں کہہ دے کہ شکریہ! میں نے ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ میں کسی کا محتاج نہ ہوں، اس لئے مجھے اس سودے (Business) کی ضرورت نہیں کہ میں آج اس غریب کی مدد اس لئے کردوں کہ اگر کل میں غریب ہو گیا تو کوئی میری مدد کرے گا۔ یہ سودا بہت کمزور بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔ میں نے اپنا انتظام اس سے مضبوط بنیادوں پر کر رکھا ہے۔ اس عقلی جواب کے بعد آپ اسے کوئی اور دلیل نہیں دے سکتے۔

اب اسی حقیقت کا ایک اور پہلو سامنے لائیے۔ آپ نے اس دولتمند کو دلیل یہ دی تھی کہ اس غریب کی مدد کرنے میں تمہارا اپنا ہی فائدہ ہے۔ اس نے اس پر غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ نہیں میرا اپنا فائدہ

اپنا فائدہ

اس میں نہیں۔ میرا فائدہ اس انتظام میں ہے جو میں نے اپنے لئے کر رکھا ہے۔ آپ نے غور کیا کہ آپ کی دلیل کی تہ میں کیا بات پوشیدہ تھی؟ یہی کہ آپ نے اس دولتمند کی عقل کو یہ سمجھایا تھا کہ ایسا کرنے میں اس کا اپنا فائدہ ہے۔ لہٰذا آپ عقل کو کسی کام پر آمادہ نہیں کر سکتے جب تک آپ اسے یہ نہ بتائیں کہ اس میں اس کا کیا فائدہ ہے۔ اسی نکتہ کو ذرا اور آگے بڑھائیے۔ آپ ایک شخص سے کہتے ہیں کہ تم نے جھوٹ کیوں بولا ہے؟ وہ تڑاق سے جواب دیتا ہے کہ مجھے کیا ضرورت تھی میں جھوٹ بولتا۔ ہم آپ صبح سے شام تک

مجھے کیا ضرورت تھی؟

ہر روز برابر اسی کو دہراتے رہتے ہیں۔ "مجھے کیا ضرورت ہے میں تمہاری خاطر جھوٹ بولوں"۔ "مجھے غلط بیانی سے کیا فائدہ تھا"۔ "مجھے جھوٹی گواہی دینے سے کیا مل جاتا؟"

آپ نے کبھی غور کیا۔ اس کے معنی کیا ہیں؟ ہم کہتے یہ ہیں کہ میں کیوں جھوٹ بولتا۔ میرا اس میں کیا فائدہ

تھا۔ یعنی میں نے اس لئے جھوٹ نہیں بولا کہ جھوٹ بولنے میں میرا کوئی فائدہ نہیں تھا (یعنی) اگر جھوٹ بولنے میں میرا فائدہ ہوتا تو میں جھوٹ بول دیتا۔ یا مجھے کیا ضرورت تھی کہ میں جھوٹ بولتا؟ یعنی میں نے جھوٹ اس لئے نہیں بولا کہ اس کے بغیر میری کوئی ضرورت نہیں رکی رہتی تھی۔ اگر میری کوئی ضرورت رُکتی تو میں جھوٹ بول کر اسے حاصل کر لیتا! یہ بات آپ کہتے رہے ہوں گے ساری عمر لیکن آپ کو اس پر غور کرنے کا اس سے پہلے شاید موقعہ نہیں ملا ہوگا۔ آپ سوچئے کہ ہم ایک ایک بات میں غیر شعوری طور پر اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہم اس وقت تک سچے ہیں جب تک ہمیں جھوٹ بولنے میں فائدہ نظر نہیں آتا۔ اگر جھوٹ بولنے میں فائدہ ہو تو ہم جھوٹ بول دیں گے۔ یہ بھی وہی بات ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ یعنی عقل کو اس سے واسطہ نہیں کہ جھوٹ بُرا ہے اور سچ اچھا۔ اسے تو صرف اس سے تعلق ہے کہ اس کا فائدہ کس میں ہے۔ اگر اس کا فائدہ سچ بولنے میں ہے تو وہ سچ بولے گی اور اگر وہ دیکھے کہ اس کے مفاد کا تحفظ جھوٹ بولنے میں ہے تو وہ جھوٹ بول دے گی اسے غرض اپنے مفاد کے تحفظ اور حصول سے ہے۔ اور بس! اس لئے کہ (جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں) عقل کا فریضہ ہی یہ ہے کہ وہ اپنے (یعنی فردِ متعلقہ) کے مفاد کی حفاظت کرے۔ وہ اس سے آگے کچھ سوچ ہی نہیں سکتی۔

آپ کہیں گے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ میکانکی تصورِ حیات کے حاملین (یعنی .... مادہ پرست جو خالص عقل کے پیرو ہیں) غریبوں کی مدد کرتے ہیں۔ جھوٹ کو برا سمجھتے ہیں۔ اپنے اوپر دیگر اخلاقی پابندیاں بھی عائد کرتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجوہات کی تفصیل بہت طول طویل ہے۔ خود مغرب کے علمائے اخلاقیات (Ethics) نے ان امور کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن اس باب میں سب متفق ہیں کہ عقل کبھی اخلاقیات کی محرک نہیں ہو سکتی نہ ہی اس کا معیار بن سکتی ہے۔ کیونکہ اخلاقیات کا مدار مفادِ خویش سے بلند ہو جانے پر ہے اور یہ عقل کے بس کی بات نہیں کہ وہ مفادِ خویش کو نظر انداز کر کے دوسرے کے مفاد کی فکر کرنے لگ جائے بلکہ اشٹڈل (جس کی کتاب (The theory Of Good And Evil) اس موضوع پر اسناد میں شمار کی جاتی ہے) لکھتا ہے کہ

نہ اخلاقیات کے متعلق اور نہ ہی علم انسانی کے کسی دوسرے شعبے کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ عقل ہمیں حکم نہیں دیتی (Vol. II-p.28e)

اور میکس پلانک (Max PlanK) کہتا ہے کہ

حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی عقلمند کیوں نہ ہو اپنے شعوری افعال کے فیصلہ کن محرکات کے متعلق محض علت و معلول کے قانون کی رو سے کبھی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے لئے کسی اور قانون کی ضرورت ہے یعنی قانونِ اخلاقیات کی۔ یہ وہ قانون ہے جس کی جگہ نہ تو بلند ترین عقل لے سکتی ہے اور نہ ہی لطیف ترین تجزیہ نفس۔

(The Univer e In The Light Of Modern Physics)

لہٰذا عقل کا تقاضا محض مفادِ خویش کا تحفظ ہے۔ اس کے لئے وہ کسی اور قانون یا ضابطہ کو نہیں جانتی۔ اس باب میں انسان اور حیوان ایک ہی سطح پر ہیں۔ گائے کو بھوک ستاتی ہے تو وہ باہر کھیتوں کی طرف نکل جاتی ہے وہاں پہنچ کر اسے اس کی تمیز نہیں ہوتی کہ اپنے مالک کے کھیت سے گھاس چرے۔ اس کے سامنے جو کھیت بھی آجائے وہ اسی میں چرنے لگ جائے گی۔ اس کے سامنے جائز اور ناجائز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہی کام عقلِ انسانی کا ہے اس فرق کے ساتھ کہ حیوانات کی جبلت حصولِ مقصد کا صرف ایک ہی راستہ جانتی ہے۔ لیکن انسان کی عقل حیلہ جو اپنے مفاد کے حصول کے لئے ہزار تدبیریں اور لاکھ ساز نہیں کر سکتی ہے۔ واضح رہے کہ مفادِ خویش کا تحفظ یا اور اس کی خاطر حیلہ جوئیاں اور فریب تراشیاں عقل کا نقص نہیں اس کا فریضہ ہی یہی ہے وہ مامور ہی اس پر ہے کہ اس فرد کے مفاد کا تحفظ کرے جس کی وہ عقل ہے۔ نہ وہ کسی دوسرے کے مفاد کی محافظ بن سکتی ہے اور نہ ہی وہ جائز اور ناجائز کی تمیز جانتی ہے۔ صرف خوف (قانون کی گرفت اور سزا کا ڈر۔ خواہ اس کا حکم عدالت کے کٹہرے سے نافذ ہو یا سوسائٹی کی پیشانی کی شکن سے) اسے حد شکنی سے روکتا ہے۔ اسی لئے فلسفۂ افادیت (Utilitarianism) کے مؤید ہربرٹ اسپنسر (Herbert Spencer) نے کہا تھا کہ

اخلاقیات کی بنیاد انتقام کا خوف ہے۔

(Quoted by Mencken in " Treatise on Right And Wrong)

لیکن اگر عقل اس کا انتظام کر لے کہ وہ عدالت کی زنجیروں یا سوسائٹی کی طعن و تشنیع سے مامون رہ سکتی ہے تو پھر اسے

رد کرنے والی کوئی چیز نہیں رہ جاتی۔

ان حقائق کو سامنے رکھ کر ایک قدم اور آگے بڑھیے۔ اگر ایک انسان کسی ایسے جزیرے میں رہتا ہو جہاں کوئی دوسرا انسان نہ ہو تو وہاں جائز و ناجائز، مفادِ خویش اور مفادِ غیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ یہ سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں دو انسان اکٹھے مل کر رہیں۔ مل کر رہنے سے انسانوں کے مفاد میں ٹکراؤ (Clash of Interests) ہوتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے معاشرتی قوانین اور اخلاقی ضوابط کی ضرورت کا آغاز ہوتا ہے۔ انسانوں نے اس دنیا میں مل کر رہنا ہے۔ کوئی انسان تنہا نہیں رہ سکتا۔ قیدِ تنہائی (Solitary confinement) سخت ترین سزا ہوتی ہے۔ انسانوں کے مل جل کر رہنے سے معاشرہ (Society) کا وجود عمل میں آتا ہے۔ اب سوچیے کہ میکانکی تصورِ حیات کے ماتحت معاشرہ کا نقشہ کیا بنتا ہے؟

معاشرہ کا نقشہ

اس معاشرہ میں

(i) ہر فرد کی عقل کا تقاضا اس کے اپنے مفاد کا تحفظ ہوتا ہے۔ اس کے لئے اس کی عقل زیادہ سے زیادہ جمع کرنے اور سمیٹ لینے کی فکر میں لگی رہتی ہے۔

(ii) اس کھینچا تانی میں، زیادہ عقل و تدبیر کے مالک، زیادہ سے زیادہ سمیٹ لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

(iii) عقل مفادِ غیر کو پہچان ہی نہیں سکتی۔ نہ ہی وہ اخلاقی ضوابط کی پابند ہوتی ہے۔ اس لئے ہر فرد کی عقل۔ جائز و ناجائز، ہر طریق سے زیادہ سے زیادہ سمیٹ لینے کی فکر کرتی ہے۔

(iv) معاشرہ، نظامِ تمدنی (Social order) کو قائم رکھنے کے لئے قوانین اور سزائیں وضع کرتا ہے تاکہ ان کے خوف سے عقل حدودِ معاشرہ کے اندر رہے۔ لیکن عقل حیلہ جو ان قوانین سے بچ نکلنے کی ہزار ترکیبیں سوچ لیتی ہے اور قانون کی گرفت میں بھی بالعموم وہی آتے ہیں جن کی عقل کمزور ہوتی ہے۔

اب آپ خود ہی سوچیے کہ ایسے معاشرے میں دوسروں کی پرورش یا دوسروں کے مفاد کے تحفظ کا سوال کس کے سامنے آئے گا۔ اس میں ہر فرد اپنی اپنی پرورش (یا زیادہ سے زیادہ اپنی اولاد کی پرورش) کی فکر میں غلطاں و پیچاں اور جنباں و رقصاں رہے گا۔ کسی کو کسی دوسرے کے ساتھ کوئی قلبی علاقہ نہ ہوگا۔ یہ کیفیت تو ہوگی ایک معاشرہ کی۔ اب ذرا

اور آگے بڑھئے۔ گروہ بندی کا جذبہ (Herd instinct) انسان کے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہے۔ اسی جذبہ کے ماتحت اس نے شروع میں قبائلی زندگی اختیار کی جس کی آخری شکل آج قومیت (Nation-alism) کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ جو کچھ ایک فرد کی عقل دوسرے فرد کے ساتھ کرتی ہے، بعینہٖ وہی کچھ ایک قوم کی اجتماعی عقل، دوسری قوم کے ساتھ کرتی ہے۔ ایک قوم کی اجتماعی عقل صرف اپنی قوم کے مفاد کو دیکھ سکتی ہے۔ اس کے لئے ناممکن ہے کہ وہ کسی دوسری قوم کے مفاد کو پیش نظر رکھ سکے۔ پھر جس طرح انفرادی عقل جائز و ناجائز کا فرق نہیں کر سکتی اسی طرح قومی شعور بھی اپنی قوم کے مفاد کے حصول میں جائز و ناجائز کی تمیز نہیں جانتا۔ جائز وہ جس سے اپنی قوم کا فائدہ ہو۔ ناجائز وہ جس سے اپنی قوم کو نقصان پہنچے۔ اپنی قوم کے فائدے کا خیال حب الوطنی یا (Patriotism) ہے جس سے بڑا کار ثواب "نیشنلزم" کی لغت میں اور کوئی نہیں۔ اس کے برعکس، اپنی قوم کا نقصان وہ جرم عظیم (High Treason) ہے جس کی سزا موت ہے۔ "میرے ملک اور قوم کا تحفظ" یہ ہے سب سے بڑا حسن عمل خواہ وہ ملک یا قوم حق پر ہو یا برسر ناحق۔ یہ قومی شعور کا فیصلہ ہے جس پر اقوام عالم کی سیاست کا دار و مدار ہے۔

نیشنلزم

دورِ حاضر کی سیاست

اس سیاست کا امام میکیاؤلی (Machiavelli) تھا جس کی کتاب (The Prince) دورِ حاضر کی سیاست کی بائبل سمجھی جاتی ہے۔ وہ اس کتاب میں لکھتا ہے کہ

> حاکم (بادشاہ) کے لئے صفت روباہی نہایت ضروری ہے تاکہ وہ دجل و فریب کا جال پھیلا سکے۔ اس کے ساتھ ہی خوئے شیری بھی، تاکہ وہ بھیڑوں کو خائف رکھ سکے۔ صرف شیر کی قوت کافی نہیں۔ اس لئے عقلمند بادشاہ وہ ہے کہ جب وہ دیکھے کہ کوئی عہد یا معاہدہ اس کے اپنے مفاد کے خلاف جاتا ہے۔ یا جن حالات کے پیش نظر وہ معاہدہ کیا تھا وہ باقی نہیں رہے۔ تو وہ اس معاہدہ کو بلا تامل توڑ ڈالے، لیکن یہ ضروری ہے کہ اس قسم کی عہد شکنی کے لئے نہایت نگاہ فریب دلائل بہم پہنچائے جائیں۔ (باب ۱۸)

دوسرے مقام پر لکھتا ہے:-

> نیکی ایک واہمہ سے زیادہ کچھ نہیں۔ اصل شے تو برائی ہے اس لئے جو بادشاہ اپنی بنیادیں مستحکم کرنا چاہے اس کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ بدی کس طرح کی جاتی ہے۔ اور اس کے لئے کونسا وقت سب سے زیادہ

موزوں ہے۔ اس میں خوبیوں کا ہونا ضروری نہیں۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ بظاہر ایسا دکھائی دے کہ اس میں یہ خوبیاں ہیں۔ اس میں اگر کوئی خوبی سچ مچ پیدا ہو جائے تو بھی مضائقہ نہیں لیکن یہ ضروری ہو کہ اسکے دل کی حالت ہمیشہ ایسی رہے کہ جونہی وہ دیکھے کہ مصلحتِ وقت کا تقاضا ہے کہ اس خوبی کو الگ کر دیا جائے تو وہ بلا تامل و توقف اس کے خلاف بھی کر سکے۔ (ربابیت ۱۸)

فریڈرک دوم میکیاولی سیاست کا بڑا پرستار تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ

> کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ تم اپنے عزائم کو چھپاؤ اور اپنے کیرکٹر کو ہمیشہ زیرِ نقاب رکھو۔ صحیح حکمتِ عملی یہ نہیں کہ پہلے ہی متعین کر لیا جائے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ حکمتِ عملی یہ ہے کہ حسبِ موقع جو صورت اپنے فائدے کی نظر آئے اختیار کر لی جائے۔ اس لئے میں ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ دوسری سلطنتوں سے معاہدات کر کے اپنے ہاتھ نہیں باندھ لینے چاہئیں۔ میکیاولی نے کہا تھا کہ جو سلطنت معاہدوں کی پابند ہو جاتی ہے وہ اپنے مفاد سے غافل ہو جاتی ہے۔

(The Individual And The State, by Murray)

اسی مکتبِ فکر کا ایک اور مبلغ (Rume Lin) لکھتا ہے کہ

> مملکت کا بنیادی فریضہ اپنے مفاد کا تحفظ اور اپنی قوت کو نشو و نما دینا ہے۔ اسے کسی دوسری مملکت کے مفاد کا خیال صرف اسی صورت میں رکھنا چاہیئے جب اس سے اس کے اپنے مفاد پر زد نہ پڑتی ہو۔ اپنی مملکت کا استحکام، اخلاقی تقاضوں پر مقدم ہے۔ اس کے لئے ہر (اصول اور قاعدے کی) قربانی روا ہے۔ (ایضاً)

آپ نے غور کیا کہ اس مسلکِ سیاست کی بنیاد کیا ہے؟ وہی عقل کا تقاضا کہ اپنے مفاد کی حفاظت ہر شے پر مقدم ہے۔ جو چیز وہاں افراد میں تھی وہی یہاں اقوام میں کارفرما ہو رہی ہے۔ اس سیاست کا نتیجہ کیا ہے؟

اقوامِ عالم کی حالت

اسے مسٹر (Waneman) کے الفاظ میں سنئے جو اس نے اپنی کتاب (The Ascendancy Of Force) میں لکھے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اس سیاست کا نتیجہ یہ ہے کہ:-

> قومیں ایک دوسرے کے سامنے وحشی درندوں کی طرح کھڑی ہیں اور ان کے سامنے صرف ایک اصول رہ گیا ہے کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ (صفحہ ۱۷۸)

یہ تو ہے اقوام کی حالت۔ اس معاشرے میں خود انسان کی کیا حالت ہے۔ اس کے متعلق (Lewis Mumford)

اپنی کتاب (Faith For Living) میں لکھتا ہے:

ہم نے ایک نئی نسل پیدا کی ہے۔ عمدہ توانائی۔ خوبصورت جسم۔ لیکن دل بالکل خالی۔ وہ نسل جس کے نزدیک زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں۔ یہ "مہذب وحشی" حیوانوں کی سطح پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کبھی دھوپ میں کھڑے آفتابی غسل لے رہے ہیں۔ سمندر کے کنارے یا اپنے کمرے میں لیمپ کے سامنے۔ کبھی کبھی جنسی میلان کے تحرک سے رقص کرنے لگ جاتے ہیں۔ یہ لوگ کھاتے ہیں۔ پیتے ہیں، بشاری کرتے ہیں بچے پیدا کرتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ ایسی زندگی جی کر۔ جو اگر کامیاب ہو تو محض حیوانی نشاط انگیزی کی زندگی اور اگر ناکام ہو تو حسد، خوف اور پریشانی کی زندگی۔ حیوانی سطح پر حیوانی تسکین کے علاوہ انہیں ہر طرح کی زندگی سے نفرت ہے۔ انہیں ان حیوانی حظائظ نفس سے محروم کر دیجئے تو ان کے لئے جینا وبالِ دوش ہو جائے گا۔ یہ ہے انسانی زندگی کا مآل۔

یہ ہے دورِ حاضر کے اس انسان کا نقشہ جس کے متعلق (Dean Inge) نے کہا تھا کہ:

یہ انسان شاہراہِ حیات پر بے مقصد چلا جا رہا ہے۔ اسے کچھ خبر نہیں کہ مجھے کہاں جانا ہے اور وہ سفر کیوں اختیار کیا ہے۔ نہ اس کا کوئی عقیدہ ہے نہ ضابطۂ حیات۔ نہ معیارِ اقدار (the Fall Of Idols)

اسی انسان کے متعلق اقبال نے کہا ہے کہ:

عشق ناپید و خرد می گزدش صورت مار | عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا | اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا | آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

× × ×

خلاصۂ مبحث | گذشتہ صفحات میں یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ دنیا میں دو نظریات مسند اول چلے آرہے ہیں

ایک مادئیین کا نظریہ جن کے نزدیک زندگی کا مقصد صرف جسمانی پرورش ہے۔ اس کے لئے انسان کو ہمیشہ اپنا مفاد سامنے رکھنا چاہیئے۔ اسی طرح ہر قوم کو اپنا قومی مفاد دیکھنا چاہیئے۔ ہر وہ تدبیر یا عمل جس سے اپنے مفاد کا تحفظ ہو۔ قابلِ ستائش ہے۔ اور ہر وہ کام جس سے اس مفاد کو نقصان پہنچے مذموم ہے۔ دنیا میں اچھے اور بُرے کا یہی معیار ہے۔ اسی معیار کے مطابق انفرادی زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ اور اسی کے مطابق بساطِ سیاست تشکل کرنی چاہیئے۔ اور دوسرا افلاطونی روحانیین کا نظریہ جن کے نزدیک دنیا فریب ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ اصل حیات یہ ہے کہ انسان دنیا سے دور بھاگے۔ اسے قابلِ نفرت سمجھے۔ ترکِ آرزو اور ترکِ لذائذ میں مقصدِ حیات کا راز پوشیدہ ہے۔ زندہ اسے کہتے ہیں جو مرنے سے پہلے ہی مر جائے۔ انسان جس قدر اپنے آپ کو مارے گا اتنا ہی خدا کے قریب ہوتا جائیگا۔ روح کی عزت جسم کی ذلت میں ہے۔ خدا اسی کو ملتا ہے جو دنیا کو چھوڑتا ہے۔

اگرچہ، جیسا کہ ہم نے لکھا ہے، پہلا نظریہ ان لوگوں کا ایجاد کردہ ہے جو میکانکی تصورِ حیات کے قائل ہیں۔ اور جنہیں مذہبی اصطلاح میں دہریے یا خدا کے منکر (Atheists) کہا جاتا ہے۔ لیکن اگر آپ بغور دیکھیں تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی کہ یہ نظریہ منکرینِ خدا ہی سے وابستہ نہیں بلکہ دنیا کا بیشتر حصہ ایسا ہے جو خدا کی ہستی کا قائل بھی ہے اور اس کے ساتھ ہی اس نظریہ پر عامل بھی۔ لہذا یہ نظریہ خدا کے اقرار یا انکار سے وابستہ نہیں (Spalding) اس نظریہ کو (This-worldliness) کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ وہی بات ہے جسے ہمارے ہاں عام طور پر "دنیاداری" کہا جاتا ہے۔

دوسرا نظریہ افلاطونی فلسفۂ زندگی کا پیدا کردہ تھا جسے بعد میں ویدانت یا تصوف نے اپنایا۔ لیکن اب یہ نظریہ نہ تو افلاطونی فلسفہ کے ساتھ وابستہ ہے اور نہ ہی ویدانت اور تصوف سے مخصوص سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ اسے "دنیاداروں" کے مقابلہ میں "خدا پرستوں" کا نظریہ سمجھا جاتا ہے۔ آج دنیا کے تمام مذاہب اسی نظریہ کے حامل ہیں۔ حتیٰ کہ مسلمانوں کی بھی یہی حالت ہے[1]۔ ان کے ہاں بھی یہی کہا جاتا ہے کہ "دنیا مردار ہے اور اس کے طالب کتے"

[1] مسلمانوں کی یہ حالت اس لئے ہے کہ ان کا مروجہ مذہب وہ نہیں جو قرآن نے دیا تھا۔ یہ مذہب بعد کی پیداوار ہے جس کے اجزائے ترکیبی مجوسیوں (ایرانیوں) کی اشخاص پرستی اور تقدیر کا عقیدہ۔ یہودیوں کی رسومات اور روایات پرستی۔ اور عیسائیوں (افلاطونیت) کا تصوف تھا۔ قرآن ان سب کے خلاف صدائے احتجاج تھا۔ لیکن مسلمان نے قرآن کو "مردوں کو ثواب پہنچانے کے لئے" رکھ لیا اور مذہب وہ اختیار کر لیا جو اسے غیر قرآنی سرچشموں سے ملا۔ یہی مذہب اُن کے ہاں صدیوں سے چلا آرہا ہے۔

دنیا جیل خانہ ہے اور کوئی خدا پرست اس سے دل نہیں لگا سکتا۔ جو شخص جتنا یہاں ذلیل ہوگا خدا کے ہاں مقرب کہلائے گا۔ دنیا کی دولت و حشمت کوئی شے نہیں۔ اصل مقصد عاقبت کی سرخروئی ہے۔" اسلام غریبوں میں آیا، غریبوں میں رہا اور پھر غریبوں ہی میں لوٹ کر آئے گا۔" خدا کی بادشاہت، کمزوروں اور ناداروں کے لئے ہے۔ یہ عقائد دنیا کے تمام مذاہب میں مشترکہ طور پہ پائے جاتے ہیں (Spalding) اسی نظریہ کو Other-worldliness کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ یہی چیز جو ہمارے ہاں عرفِ عامہ میں "آخرت سنوارنا" کہلاتی ہے۔

آپ دیکھیں گے کہ دنیا انہی دو گروہوں میں بٹی ہوئی ہے۔ یہ تقسیم دورِ حاضر کی پیداوار نہیں، شروع سے ایسا ہی چلا آرہا ہے۔ لیکن (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) ربوبیت (انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما) نہ پہلے گروہ کے ہاتھوں ممکن ہے۔ نہ دوسرے کے۔ پہلے گروہ کا نظریہ صرف انسانی جسم کی پرورش ہے کیونکہ ان کے نزدیک انسان نام ہی جسمانی زندگی کا ہے۔ لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ انسان صرف جسم ہی کا نام نہیں۔ جسم کے علاوہ کچھ اور بھی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے۔ میکانکی نظریۂ حیات میں انسانی ذات کی پرورش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور جسم کی پرورش کے سلسلے میں بھی وہ کھینچا تانی ہوتی ہے جس سے دنیا جہنم میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ آجکل ہو رہا ہے۔

دوسرا نظریہ ترکِ دنیا کا حامل ہے جس میں جسم کی پرورش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ باقی رہی انسانی ذات سو اس کے متعلق ان کا نظریہ یہ ہے کہ یہ جس قدر جلد اپنی جداگانہ شخصیت کھو کر اپنی اصل میں جا ملے، اتنا ہی اچھا ہے۔ لہٰذا اس میں بھی انسانی ذات کی پرورش کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ربوبیت کے پہلے نظریہ کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا درندوں کا بھٹ بن رہی ہے اور دوسرے نظرے سے انسانوں کی بستیاں قبرستانوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اقبالؒ پہلے نظریے کو "مغرب" اور دوسرے کو "مشرق" کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے اور سرد آہ بھر کر کہتا ہے کہ

مغرب ز تو بیگانہ — مشرق ہمہ افسانہ

اب آیئے دیکھیں کہ اس باب میں قرآن کیا کہتا ہے۔

باب چہارم

قرآنی نظریۂ حیات

گذشتہ باب میں زندگی کے جو دو نظریے پیش کئے گئے ہیں۔ انہیں ایک مرتبہ پھر سامنے لے آئیے کیونکہ اب ان ہی نظریوں پر بحث ہو گی۔ قرآن نے ان دونوں نظریوں کی تردید کی ہے اور ان کے خلاف ایک تیسرا نظریۂ حیات پیش کیا ہے لیکن اس نظریہ تک پہنچنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ قرآن، ان دونوں نظریوں کے متعلق کیا کہتا ہے۔

روحانیین" کا نظریۂ حیات اتنا کمزور اور بدیہیات سے چشم پوشی پر مبنی ہے کہ قرآن نے اس کی تردید یا کچھ زیادہ دلائل کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ اس نے صاف کہدیا کہ

وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا...... (۵۷/۲۷)

یہ مسلک رہبانیت ان لوگوں کا خود تراشیدہ ہے۔ ہم نے انہیں اس مسلک کا حکم نہیں دیا تھا۔ ہم نے اس کے برعکس ان سے یہ کہا تھا کہ تم اپنی زندگی کو قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ رکھو[۱]۔ انہوں نے اس کی بجائے اس روش کو اختیار کر لیا۔ اور پھر لطف یہ کہ اپنے خود اختیار کردہ مسلک کو بھی نباہ نہ سکے (کیونکہ یہ نبھنے والا تھا ہی نہیں)

---

[۱] اس ٹکڑے کا یہ بھی مفہوم ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں نے رہبانیت" اس خیال کے تحت وضع کی تھی کہ اس سے زندگی کے وہ نتائج حاصل ہو جائیں گے جو مقصودِ حیات ہیں۔ لیکن اول تو ان کا یہی خیال غلط تھا۔ دوسرے یہ روش بجائے خویش ایسی ناممکن العمل تھی کہ انہوں نے اسے اختیار کرنے کو تو کر لیا لیکن نباہ نہ سکے۔

رہبانیت زندگی کی کشمکش سے فرار کا نام ہے۔ یہ زمانے کے محسوس تقاضوں کے مقابلے سے شکست خوردگی کا اعلان ہے۔ بھلا اس قسم کے مسلک کا حکم اس خدا کی طرف سے کس طرح مل سکتا تھا جس نے انسان سے علی الاعلان کہدیا تھا کہ

وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ (۴۵/۱۳)

کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے ہم نے اسے قانون اور قاعدے

کی زنجیروں میں اس لئے جکڑ رکھا ہے کہ تم اسے اپنے کام میں لاسکو۔

دنیاوی متاع وجہ جاذبیت ہے

اس نے کہا کہ دنیاوی مال و منال اور معاشی سہولتیں اور خوشگواریاں انسان کے لئے وجہ جاذبیت ہیں۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ...... (۳/۱۴)

انسان کے لئے عورت مرد کے تعلقات۔ اولاد۔ اموال (چاندی سونے کے ڈھیر) چنے ہوئے گھوڑوں

اور مویشیوں اور کھیتی (کی پیداوار) میں جاذبیت رکھ دی ہے ......

حقیقت یہ ہے کہ اگر اس نقطۂ نگاہ سے دیکھیں تو قرآن کے عجیب و غریب حقائق سامنے آتے ہیں۔ آپ کائنات میں غور کیجئے۔ دو نمایاں پہلو آپ کے سامنے آئیں گے کائنات کے مختلف عناصر میں یا تو قوت و جلال دکھائی دے گا اور یا حسن و جمال۔ اس میں بجلی کی کڑک، اور بادلوں کی گرج کے ساتھ قوسِ قزح کی رنگینیاں اور ابرِ رحمت کی نزہت آفرینیاں دکھائی دیں گی۔ اس میں اگر تیز ہواؤں کا جھکڑ اور طوفان ہے تو دوسری طرف نسیم سحری کا خرامِ ناز بھی ہے۔ اس کے جنگلات میں اگر بڑے بڑے تناور درخت اکڑے کھڑے ہیں تو صحنِ گلستاں میں سبزۂ نورستہ کا قالین بھی بچھا ہے۔ دوسری طرف یہ بھی دیکھئے کہ اگر پھلوں اور فصلوں میں سامانِ ربوبیت اپنے افادی پہلو کو لئے ہوئے ہیں تو

---

[1] قرآن نے جن آیات میں حیوٰۃ الدنیا اور حیاتِ آخرت کا مقابلہ کیا ہے ان کا ذکر بعد میں آئے گا۔ سردست ان آیات کا اتنا حصہ ہی درج کیا جاتا ہے جس کا تعلق حیاتِ دنیاوی سے ہے۔

ان ہی پھلوں کا رنگ اور خوشبو، جانفزائی کی ہزار جنتیں اپنے آغوش میں رکھتے ہیں۔ یہاں صرف غلہ ہی پیدا نہیں ہوتا، پھول بھی کھلتے ہیں۔ یعنی کائنات میں صرف افادی پہلو ہی نہیں، حسن کا پہلو بھی ہے۔ اس میں صرف جلال ہی نہیں جمال بھی ہے۔

آپ تاریخ انسانی پر غور کیجئے۔ اس نے ہمیشہ یہ کیا کہ کائنات کے جلال (یا افادیت) کے پہلو کو لیا تو حسن وجمال کے پہلو کو نظر انداز کر دیا۔ اور کبھی جمالیاتی (Aesthetic) پہلو کو لیا تو قوت و اقتدار کو پس پشت ڈال دیا۔ لیکن قرآن نے آکر یہ کہا کہ یہ انسان کی بھول ہے، اس کی نگاہ کی غلطی ہے۔ یہاں جلال اور جمال ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ حسن اور قوت دونوں کا سرچشمہ ایک ہے۔ جسے اللہ کہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے دیکھو کائنات کی مختلف قوتیں دن اور رات سرگرم عمل ہیں (يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۶۴/۱) یہ کس لئے سرگرم عمل ہیں؟ اس لئے کہ کائنات کے جلالی اور جمالی گوشوں کو بے نقاب کریں اور اس طرح بتا دیں کہ قوت اور حسن دونوں کا سرچشمہ ایک ہے (لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ ۶۴/۱) ملک کے معنی قوت اور اقتدار ہیں اور حمد کے معنی ہیں (Appreciation) تحسین، تاثر جمال، کسی حسین شے کو دیکھ کر آپ کی زبان سے بے اختیار واہ! واہ! نکل جاتا ہے۔ یہ ہے اس کی حمد۔ لہذا قوت و اقتدار، اور جمالیاتی پہلو دونوں کا سرچشمہ ایک ہے۔

اس آیت کے اگلے ٹکڑے میں قرآن نے ایک اہم حقیقت کو بے نقاب کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جلال اور جمال، ملک اور حمد، قوت اور حسن، دو متضاد عناصر نہیں ہیں۔ یہ ایک دوسرے کی ضد یا نقیض نہیں ہیں۔ جنہیں تم ایک دوسرے کی ضد (Antagonist) سمجھتے ہو، وہ ایک دوسرے کی زوج (Complementary) ہیں اس لئے قرآن نے کہا ہے کہ ہم نے ہر شے کی زوج پیدا کی ہے۔ رات اور دن ظلمت اور نور، قوت اور حسن، ایک دوسرے کی زوج ہیں یہ باہمدگر متماثل ہیں۔ ان کا باہمدگر متضاد ہونا تو ایک طرف ان کی تو کیفیت یہ ہے کہ ان میں سے ایک دوسرے کے اندر سے نمودار ہوتا ہے۔ تُولِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ (۳/۲۶) رات کی تاریکی غیر محسوس طور پر دن کی روشنی میں داخل ہو جاتی ہے اور دن کی روشنی رات کی تاریکی میں جا چھپتی ہے حتیٰ کہ موت اور حیات (جنہیں تم کھلے طور پر ایک دوسرے کی ضد سمجھتے ہو) ان کا بھی یہ عالم ہے کہ کائنات کی مردہ اشیاء (Inorganic) زندہ اشیاء (Organic) میں بدلتی رہتی ہیں اور

زندہ اشیاء مردہ میں۔ اس لئے جن چیزوں کو تم ایک دوسرے کی ضد سمجھتے ہو وہ صرف قانونِ خداوندی کے "پیمانوں کے اختلاف" کی نمود ہیں۔ ان پیمانوں کے بدلنے سے، کائنات کے تغیرات سامنے آتے رہتے ہیں۔

قرآن نے "اصحاب کہف" کا قصہ اسی غرض کے لئے بیان کیا ہے۔ یہ مسلکِ خانقاہیت کے پردے تھے جو دنیا کی آرائش و زیبائش اور حسن و جمال سے منہ موڑ کر عزلت نشین ہو چکے تھے۔ دیکھئے، قرآن اس قصے کی ابتدا کس انداز سے کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً (۱۸/۷) ہم نے جو کچھ زمین پر پھیلایا ہے اس سب میں زینت کا سامان ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان کی حالت ہمیشہ ایک جیسی نہیں رہتی۔ آج پھول مہک رہا ہے کل کو مرجھا جائے گا۔ اس وقت بہار کا موسم ہے، پھر خزاں آجائے گی۔ لیکن زندگی کے یہ مختلف پہلو اس لئے بدلے جاتے ہیں کہ حسین شے، حسین تر بن کر سامنے آئے لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (۱۸/۷)۔ بہار کا حسن اس بنا پر وجہ شادابی قلب و نگاہ بنتا ہے کہ وہ خزاں کے بعد آتا ہے۔ یہاں ہر بگاڑ میں ایک بناؤ ہے۔ ہر تخریب، ایک تعمیر کا پیش خیمہ ہے۔ لیکن کائنات کا رُخ بالمآل، تخریب و افسردگی کی طرف نہیں، تعمیر و شگفتگی کی سمت ہے۔ اس لئے کہ اسے پیدا ہی تعمیری نتائج مرتب کرنے کے لئے کیا گیا ہے خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ (۱۶/۳)۔ لہٰذا زندگی کا وہ تصور جو زینت و جمال کو قابلِ نفرت قرار دے، خدا کے قانون کا مقرر کردہ نہیں۔ یعنی وہ نقشہ جو تمہیں خانقاہوں میں ملتا ہے۔

اس تمہید کے بعد "اصحاب کہف" (غار والوں) کا قصہ شروع ہوتا ہے۔ اس قصہ کے ختم کرنے کے بعد یہ بتایا جاتا ہے کہ زندگی کا یہ نقشہ صحیح نہیں۔ صحیح نقشہ وہ ہے جو خدا کے قانون کے مطابق مرتب ہوتا ہے۔ یعنی وہ نقشہ جس میں انسان کی تمام صلاحیتوں کی نشو و نما ہوتی ہے اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا (۱۸/۳۰)، اور جس میں تمام اعمال (کاروبارِ حیات) میں حسن کارانہ انداز سے توازن قائم رکھا جاتا ہے وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا (۵/۱۲۰) اس کا قانون اشیائے کائنات کے پیمانوں پر اپنا کنٹرول رکھتا ہے۔ اسی ہوا کا پیمانہ ذرا وسیع کر دیا جاتا ہے تو وہ آندھی اور جھکڑ بن جاتا ہے اور جب یہی پیمانہ ذرا سکیڑ دیا جاتا ہے تو وہ نسیمِ سحری کے خوشگوار جھونکوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

اس لئے جلال اور جمال باہمد گر متضاد نہیں۔ قوت اور حسن ایک دوسرے کی نقیض نہیں، جو ایک جگہ

سکتے نہ ہوسکیں (یہ ایرانی ذہن کی غلط نگہی تھی کہ اس نے نور اور ظلمت کو دو متضاد قوتیں سمجھ کر "دینِ مجوس" کی طرح ڈال دی) لہٰذا وہ نظریۂ زندگی جس میں حسن و جمال اور تزئین و آرائش سے نفرت سکھائی جاتی ہو، کبھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ صحیح نظریۂ حیات، مختلف عناصر میں اعتدال، تناسب، اور توازن کا قائم رکھنا ہے۔ اس نے کہا (اور ایسے کہتے وقت اس کے پیشِ نظر خانقاہیت کی زندگی کے علمبردار تھے جو کائنات کی ہر حسین شے سے آنکھیں بند کر کے عزلت نشینی اور گوشہ گیری کی روش اختیار کر چکے تھے) کہ تم سمجھتے ہو کہ تزئین و آرائش اور تحسین و تجمیل اطاعتِ خداوندی کی راہ میں حائل ہوتی ہے؟ ہمارا قانون یہ ہے کہ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ[1] وَّکُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا[2]۔ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ (۷/۳۱) تم قانونِ خداوندی کی اطاعت کے ہر پہلو سے زینت و جمال اخذ کرو۔ اور زینت و جمال، صحیح تناسب و توازن کا نام ہے۔ تم دنیا کی تمام خوشگوار چیزوں کو کھاؤ پیو، لیکن ان میں اعتدال رکھو اور ان سے حاصل کردہ قوتوں کو اس طرح صرف نہ کرو کہ ان سے تعمیری نتائج پیدا نہ ہوں۔ اس کے بعد بتایا کہ اس تصور کے مطابق جو معاشرہ مرتب ہوگا اس کا نقشہ کیا ہوگا؟ اس نقشے کو دیکھئے اور پھر سوچئے کہ زینت و جمال کی کونسی چیز ہے جو اس کے اندر نہیں آگئی۔ وہ کہتا ہے کہ گھنی چھاؤں کے باغات جن کے نیچے آبِ رواں ہو۔ اس باغ میں چھپر کھٹ بچھے ہوئے تکئے لگے ہوئے۔ ان پر لیٹنے والے دبیز اور باریک ریشم میں ملبوس۔ سونے کے کنگن پہنے ہوئے (جو اس زمانے میں سرداری کی علامت ہوتے تھے) یہ ہے نقشہ اس معاشرے کا۔ (دیکھو $\frac{18}{31}$)

قرآن زندگی کے جمالیاتی پہلو کو اتنی اہمیت دیتا ہے کہ جن مقامات میں عام نگاہیں صرف افادی پہلو پر رک کر رہ جاتی ہیں وہ اُن کے سامنے جمالیاتی پہلو بھی لے آتا ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ اللہ نے تمہارے لئے مویشی پیدا کئے

---

[1] ظاہر ہے کہ اس جگہ مسجد کے معنی "مسلمانوں کی مسجد" نہیں ہو سکتی۔ ایک تو اس لئے کہ یہاں خطاب یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ سے ہے۔ یعنی تمام نوعِ انسانی سے نہ کہ مسلمانوں سے۔ اور دوسرے یہ کہ مسجد کے بعد وَّکُلُوْا وَاشْرَبُوْا (کھاؤ پیو) کا حکم اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس سے مراد کوئی عمارت نہیں ہے۔ مسجد سے یہاں مراد خود سجدہ (یعنی اطاعت) ہے۔

[2] زمین کی سیرابی کے لئے پانی نالیوں میں سے گزرتا ہے۔ اگر ایسا ہو کہ نالی ٹوٹ جانے سے پانی کھیت تک پہنچنے کی بجائے راستہ میں ادھر ادھر بہہ جائے تو اُسے اسراف کہتے ہیں۔

ہیں۔ ان کی اون سے تم گرم لباس بناتے ہو۔ ان کی دوسری چیزوں کو کئی اور منفعت بخش کاموں میں لاتے ہو۔ ان کا گوشت کھاتے ہو۔ یہ سب ان کے افادی پہلو ہیں۔ عام نگاہیں یہیں تک پہنچ کر رک جاتی ہیں۔ لیکن وہ اس سے آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ ذرا اس منظر کو سامنے لاؤ جب شام کے وقت تمہارے مویشی باہر سے چر کر گاؤں کی طرف واپس آتے ہیں۔ وہ منظر کس قدر حسین ہوتا ہے۔ یا علی الصبح نور کے تڑکے جب تم انہیں باہر کھیتوں میں لے جاتے ہو، وہ منظر بھی کس قدر دلکش ہوتا ہے اس لئے اُن کے افادی پہلو کے ساتھ ہی یہ جمالیاتی پہلو بھی ہے۔ (وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ (۱۶/۶)) اسی طرح دو تین آیتوں کے بعد فرمایا وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً (۱۶/۸) اس نے گھوڑے خچریں اور گدھے پیدا کئے جن پر تم سوار ہوتے ہو، اور یہ تمہارے لئے باعث زینت بھی ہیں۔

قرآن نے اس طرح کھول کھول کر بیان کر دیا کہ زینت و آرائش کی یہ سب چیزیں ہم نے انسان ہی کے لئے پیدا کی ہیں اور اس کے بعد یہ فرمایا کہ جب ان چیزوں کو ہم نے وجہ جاذبیت بنایا ہے، تو وہ کون ہے جو انہیں حرام قرار دے سکتا ہے؟

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ (۷/۳۲)

ان سے پوچھو کہ وہ کون ہے جو ان زینت کی چیزوں کو حرام قرار دے دے جو اللہ نے اپنے بندوں کے فائدے کے لئے پیدا کی ہیں اور رزق کی خوشگواریوں کو ممنوع قرار دیدے؟

آپ نے غور کیا کہ قرآن نے کس زجر و توبیخ سے کہا ہے کہ کون ہے جو دنیاوی جاذبیتوں اور معاشی خوشگواریوں کو حرام قرار دے کر ایسی حسین و جمیل دنیا کو ماتم کدہ بنا دے جس میں ہر چہرہ یبوست آمیز اور ہر پیشانی شکن آلود نظر آئے؟ اس نے کہا کہ دنیاوی دولت و حشمت، قوت و سطوت، حکومت اور سلطنت، اقتدار و اختیار خدا کی نعمتیں ہیں۔ خدا کے جتنے رسول آئے وہ اپنی قوموں کو ان نعمتوں کے حصول کی تلقین کرتے اور ان کی طرف توجہ دلاتے رہے۔ حضرت ہودؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ تم خدا کی ان نوازشات کو یاد کرو کہ اس نے تمہیں قومِ نوح کے بعد استخلاف فی الارض (حکومت و سطوت) عطا فرمائی۔

فَاذْكُرُوا آلَاءَ اللَّهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (۷/۶۹)

تم اللہ کی ان نوازشات کو سامنے رکھو تاکہ تم کامیاب زندگی بسر کرسکو۔

یہی حضرت صالحؑ نے اپنی قوم سے کہا۔

تم خدا کی اس نوازش کو سامنے رکھو کہ اس نے تمہیں قوم عاد کے بعد ملک میں تمکن عطا کیا۔ تم نرم نرم زمین پر محلات بناتے ہو اور سخت پہاڑوں کو تراش تراش کر (محفوظ) قلعے تعمیر کرتے ہو۔ (۷/۷۴)

حضرت شعیبؑ نے بھی اپنی قوم سے یہی کہا کہ "تم خدا کی اس نوازش کو فراموش نہ کرو کہ تم ملک میں بہت قلیل تعداد میں تھے۔ اس نے تمہیں کثرت عطا کی" (۷/۸۶) جس سے تم ایک طاقتور قوم بن گئے۔ آلِ ابراہیم کے متعلق ہے کہ "ہم نے انہیں کتاب و حکمت عطا کی" اور اس کے ساتھ ہی

وَاٰتَیْنٰھُمْ مُّلْکًا عَظِیْمًا ۔ (۴/۵۴)

ہم نے انہیں ایک عظیم الشان سلطنت بھی دی۔

حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کی تو تمام داستان اسی قوت و حشمت اور تمکن و تسلط کی مسلسل تاریخ ہے۔ اور اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ قرآن نے اس داستان کو بڑی شدت و تکرار سے دہرایا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اس قوم کی پیہم کشمکش اور مسلسل جدوجہد کا نتیجہ یہ نکلا کہ

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ کَانُوْا یُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَھَا
الَّتِیْ بٰرَکْنَا فِیْھَا ؕ وَتَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ الْحُسْنٰی عَلٰی بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ۙ بِمَا
صَبَرُوْا ؕ وَدَمَّرْنَا مَا کَانَ یَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا کَانُوْا یَعْرِشُوْنَ (۷/۱۳۷)

اور ہم نے اس طرح، اس قوم کو جو دنیا میں نہایت کمزور اور حقیر شمار کی جاتی تھی اس سرزمین کے مشرق و مغرب کا مالک بنا دیا جو اپنے اندر سامانِ پرورش کی فراوانیاں رکھتی تھی۔ اور اس طرح خدا کا قانون حسن کارانہ انداز سے قوم بنی اسرائیل کے حق میں ان کے استقلال و استقامت کی وجہ سے پورا ہوا۔ اور فرعون اور اس کی قوم کا ساختہ پرداختہ اور ان کی فلک بوس عمارات سب درہم برہم ہوگئیں۔

خدا کا یہ قانون (کہ حکومت و سلطنت اور غلبہ و اقتدار صلاحیتوں کے پیدا کرنے اور جدوجہد اور سعی و عمل سے حاصل ہوتا ہے) صرف بنی اسرائیل ہی کے حق میں پورا نہیں ہوا بلکہ جس قوم نے بھی اس قانون کے مطابق عمل کیا وہ صاحب تخت و

تنگیں ہوگئی۔ چنانچہ خود (دور اول کے) مسلمانوں سے کہا گیا کہ تمہاری سعی وکاوش کا نتیجہ یہ نکلا کہ

وَ اَوۡرَثَکُمۡ اَرۡضَہُمۡ وَ دِیَارَہُمۡ وَ اَمۡوَالَہُمۡ وَ اَرۡضًا لَّمۡ تَطَـُٔوۡہَا ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرًا (۳۳)

اور اس نے تمہیں (تمہارے دشمنوں کی) زمینوں کا اور ان کے شہروں کا اور ان کی دولت کا مالک بنادیا۔ اور (اس کے علاوہ) اس سرزمین کا بھی جہاں (اس سے پہلے) تمہارے قدم کبھی نہ پہنچے تھے۔ اللہ (کے قانون) نے ہر شے کے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں (اور ہر نتیجہ ان ہی پیمانوں کے مطابق برآمد ہوتا ہے۔)

جب حضرت ابراہیمؑ نے حجاز کی بے برگ وگیاہ وادی میں کعبہ کی بنیاد رکھی ہے تو اس بستی کے متعلق جو دعا کی تھی اس میں یہی فرمایا تھا کہ "اے میرے پروردگار! اس بستی کو امن وسکون کا مقام بنا اور اس کے باشندوں کو پھلوں کا رزق عطا فرما" (۲/۱۲۶) چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قریش مکہ پر جو اپنے انعامات گنائے ہیں ان میں یہی کہا ہے کہ "خدا نے انہیں بھوک رفع کرنے کے لئے رزق عطا کیا اور خوف سے انہیں مامون کیا" (۱۰۶/۳) خود نبی اکرمؐ سے فرمایا کہ تم غریبی کے بوجھ سے دبے ہوئے تھے، اللہ نے ایسے اسباب پیدا کر دیئے کہ تم غنی ہو گئے (۹۳/۸) سامانِ خورونوش ہی سے مردہ بستیاں زندہ ہوتی ہیں (۵۰/۱۱) اور قانونِ خداوندی کی اتباع کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ "زمین اور آسمان سے رزق کی فراوانیاں حاصل ہوجاتی ہیں (۵/۶۶) صرف رزق ہی نہیں بلکہ "رزقِ کریم" (عزت کی روٹی) جس کے معنی حکومت وسلطنت ہیں۔ چنانچہ اسی نے کہا کہ "ہمارا وعدہ ہے کہ جو قوم ہمارے قانون کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائے اور پھر صلاحیت بخش کام کرے ہم اسے حکومت عطا کردینگے" (۲۴/۵۵)۔ ہم ایسے لوگوں کو نہایت خوشگوار زندگی بسر کرائیں گے (۱۶/۹۷) ان کے لئے خوشحال زندگی کی زندہ بشارتیں ہیں۔

لَہُمُ الۡبُشۡرٰی فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ..... (۱۰/۶۴)

ان کے لئے دنیاوی زندگی میں خوشخبریاں ہیں۔

اس کے برعکس جو لوگ اس قانون کی خلاف ورزی کریں گے ان کے لئے

خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ..... (۲/۱۱۴)

دنیاوی زندگی میں رسوائی ہے۔

اس رسوائی کی تفصیل کیا ہے، بھوک اور خوف کا عذاب۔ رزق کی تنگی۔

......فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (۱۶/۱۱۲)

پس اس قوم کے جرائم کی پاداش میں اللہ نے انہیں بھوک اور خوف کی سزا کا مزا چکھایا۔ (نیز ۲/۱۵۵)

یعنی رزق کی فراوانی، معاشی سہولتیں اور خوشگواریاں خدا کی نعمتیں ہیں اور اس کے برعکس رزق کی تنگی۔ بھوک اور خوف خدا کا عذاب ہے دوسری جگہ ہے:

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا (۲۰/۱۲۴)

جو کوئی قانونِ خداوندی[1] سے اعراض برتے گا تو اس کی معیشت اس پر تنگ ہو جائے گی

اتنا ہی نہیں قرآن نے اس حقیقت کو اور بھی زیادہ واضح الفاظ میں ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے "خدا پرستوں" کے نزدیک انسانی زندگی کا منتہیٰ یہ ہے کہ جنت مل جائے تمام نیکیاں حصولِ جنت کی خاطر کی جاتی ہیں۔ جنت کی دوسری تفاصیل کو (سردست) چھوڑ دیجئے۔ قرآن میں قصۂ آدم[2] کے ضمن میں ہے کہ آدم سے کہا گیا تھا کہ ابلیس تمہارا دشمن ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ تمہیں جنت سے نکلوا دے۔ اور اس کے بعد تمہیں مشکلات کا سامنا ہو (فَتَشْقٰى) حالانکہ تمہاری یہاں یہ حالت ہے کہ

اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ۔ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى (۲۰/۱۱۸-۱۱۹)

تمہیں نہ بھوک کی تکلیف ہے نہ لباس کی نہ پیاس کی ۔ نہ مکان (دھوپ) کی

جنت کی زندگی

یعنی جنت کی زندگی میں بھوک۔ پیاس۔ لباس۔ اور مکان کی تنگی نہیں ہوتی غور کیجئے یہی چیزیں انسان کی بنیادی ضروریاتِ زندگی ہیں۔ لہٰذا جنت کی زندگی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں انسان اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہتا۔ اور دوسری جگہ ہے کہ جنت میں "آدم"

---

[1] قانونِ خداوندی سے مطلب ہے خدا کا کائناتی قانون جس کے مطابق زمین کے ذخیروں سے رزق حاصل ہوتا ہے اور جو کافر و مومن سب پر یکساں عادی ہے [2] قرآن کا قصۂ آدم سے مفہوم کیا ہے۔ اس کے لئے معارف القرآن (جلد دوم) عنوان آدم دیکھئے

اور اس کی بیوی" سے کہدیا گیا تھا کہ (وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ٢/٣٥) "تم اس میں جہاں سے جی چاہے بافراغت
کھاؤ پیو" یعنی جنت کی زندگی میں سامان خورونوش کی طرف سے بالکل اطمینان ہوگا۔ اس کے حصول میں نہ کسی قسم
کی مشقت اٹھانی پڑے گی نہ تکان ہوگی (٣٥/٣٥) اس رزق کی فراوانی کو دیکھ کر اہل جنت خدا کا شکر ادا کریں گے
(اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ٣٥/٣٤) کہ اس نے ہم سے حزن دور کیا۔ حزن کے معنی ہیں "سامان رزق کی کمی کی وجہ سے
افسردہ خاطر ہونا۔ حتیٰ کہ وہ بال بچے بھی حزن کہلاتے ہیں جن کی معاش کی فکر سے انسان غمگین ہو جائے۔ اس کے
علاوہ متعدد مقامات پر دہرایا گیا ہے کہ جنت کی زندگی میں (لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ) نہ کسی قسم
کا خوف ہوگا نہ حزن۔ ہر قسم کی حفاظت بھی ہوگی اور فکر معاش کی طرف سے اطمینان بھی۔ صرف فکر معاش کی طرف سے
اطمینان ہی نہیں بلکہ وہاں سامان خورونوش اور آرائش و زیبائش کی فراوانیاں ہوں گی۔ قرآن میں جنت کی زندگی
کی تفاصیل دیکھئے اور پھر غور کیجئے کہ آسائشوں اور خوشگواریوں کی کونسی چیز ہے جس کی وہاں فراوانی اور ارزانی
نہیں۔ ریشم و کمخواب کے ملبوسات (جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ٧٦/١٢) مسندیں اور صوفے (مُتَّكِئِيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ
٧٦/١٣) پھلوں کے ڈھیر (وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا ٧٦/١٤) چاندی کے برتن اور شیشے کے کنٹر (بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ
وَّاَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا ٧٦/١٥) باریک اور دبیز حریر و اطلس کے پردے اور ملبوسات (ثِيَابُ سُنْدُسٍ
خُضْرٌ وَّاِسْتَبْرَقٌ ٧٦/٢١) ہیرے اور جواہرات کے مرصع زیور (اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ٢٢/٢٣، ٣٥/٣٣) زیور
ہی نہیں بلکہ سونے کے طباق اور آبخورے (بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَّاَكْوَابٍ ٤٣/٧١)۔ دودھ اور شہد اور خمر لذیذ
کی نہریں (٤٧/١٥)، ہر قسم کے پھل اور گوشت (بِفَاكِهَةٍ وَّلَحْمٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ٥٢/٢٢) نرم و نازک قالین اور ریشمی
فرش (رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ ٥٥/٧٦) بلند نشستوں پر بچھے ہوئے (فُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ
٥٦/٣٤) ایسے مشروبات جن پر مشک کی مہریں لگی ہوں گی (رَحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ٨٣/٢٦) غرضیکہ ہر وہ چیز
جسے وہ چاہیں گے (لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا ٥٠/٣٥) جو مانگیں گے ملے گا۔ (وَلَهُمْ مَّا يَدَّعُوْنَ ٣٦/٥٨) ہر وہ
شے جس سے دل کو سرور اور آنکھوں کو نور حاصل ہو۔ (فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ ٤٣/٧١)
اور ان آسائشوں اور نعمتوں کے اثرات اُن کے چہرے کی تازگی سے نظر آئیں (تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ٨٣/٢٤)

یہی الفاظ ہیں جو بنی اسرائیل سے اس وقت کہے گئے جب انہیں فرعون کی غلامی سے نکال کر سینا کی وادیوں میں لایا گیا ہے (٢/٥٨)

یہ ہے قرآن کی رو سے جنت کی زندگی جو قرآنی پروگرام کے مطابق عمل کرنے سے ملتی ہے۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی ہے کہ قرآن کی رو سے اس دنیا کی خوشحالی اور خوشگواری کی زندگی، اللہ کی نعمت ہے۔ انسان کے حسن عمل کی جزا حکومت و سلطنت اور دولت و ثروت ہے۔ رزق کی فراوانی اور ضروریات زندگی کی طرف سے اطمینان کامرانیوں کی جنت ہے۔ دنیا کی زیب و زینت کی چیزیں وجہ جاذبیت ہیں جن کی طلب اور تمتع عین منشائے خداوندی کے مطابق ہے۔ اس کے برخلاف ذلت اور رسوائی۔ محکومی اور کمزوری بے بسی اور بے کسی۔ بھوک اور خوف خدا کا عذاب ہے جو اس قوم پر مسلط ہوتا ہے جو اس کے قانون کائنات سے سرکشی یا اعراض برتتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ "روحانیین" کا وہ نظریہ جس کی رو سے دنیا اور اس کی جاذبیتوں کو قابل نفرت سمجھا جاتا ہے اور یہاں کی ذلت و خواری اور فقر و فاقہ کو جنت کی نشانی قرار دیا جاتا ہے قرآنی تصور حیات کے یکسر مخالف ہے۔

یہ تو ہوا پہلے نظریہ کے متعلق۔ اب دوسرا نظریہ لیجئے جس کی رو سے سمجھا جاتا ہے کہ زندگی اسی دنیا کی زندگی ہے اس لئے ربوبیت سے مراد صرف جسم انسانی کی پرورش ہے اور بس۔ جب (موت سے) جسم انسانی کی طبعی زندگی ختم ہو جائے گی تو انسان بھی ختم ہو جائے گا۔ اس لئے انسانی تگ و تاز کا ماحصل یہ ہے کہ اس کی موجودہ زندگی کسی نہ کسی طرح عیش و آرام سے گزرے۔ کھانے کو عمدہ غذا۔ پہننے کو اچھے اچھے کپڑے۔ رہنے کو کشادہ مکان۔ ان کے علاوہ دیگر آسائش کے سامان۔ اگر یہ سب کچھ میسر آجائے تو سمجھا جاتا ہے کہ انسانی زندگی کا مقصد پورا ہو جاتا ہے اس لئے کہ ان کے نزدیک انسان سے مراد صرف اس کا جسم ہے اور ربوبیت سے مراد انسانی جسم کی پرورش۔

قرآن اس نظریہ کی بھی تردید کرتا ہے۔ اس لئے کہ اس کے نزدیک

(۱) یہ نظریہ حقیقت (Reality) کے خلاف ہے انسان صرف جسم ہی کا نام نہیں۔ جسم کے علاوہ انسانی ذات (نفس) بھی ہے جو حیات جاوداں حاصل کر سکتا ہے۔ اس لئے موت سے زندگی کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔

(۲) دوسرے یہ کہ مادیین کے نظریہ کے ماتحت مستقبل کی زندگی تو چھوڑیئے، خود اس دنیا میں تمام انسانوں کی

ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کا بھی خاطر خواہ انتظام نہیں ہو سکتا۔

اس کے خلاف، قرآن ایک ایسا نظام متعین کرتا ہے جس میں تمام نوعِ انسانی کی نہ صرف ضروریاتِ زندگی کی بہم رسانی ہی کا اطمینان بخش انتظام ہو جاتا ہے بلکہ ان کی مضمر صلاحیتوں کے نشوونما پانے کا بھی بطریقِ احسن بندوبست ہو جاتا ہے اور اس طرح

(ii) خود انسانی ذات کی نشوونما بھی ہوتی جاتی ہے جس سے وہ اس زندگی کے بعد اگلی زندگی کی منزلیں طے کرنے کے بھی قابل ہو جاتی ہے۔

دیکھئے قرآن اس باب میں کیا کہتا ہے؟

نفسِ انسانی

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قرآن نے بتایا ہے کہ منزلِ انسانیت میں پہنچ کر زندگی کی ارتقائی حالت وہ نہیں رہی جو حیوانات تک تھی۔ انسان میں ایک اور چیز کا بھی اضافہ ہوا ہے جسے قرآن نے "نفخ روحِ خداوندی" سے تعبیر کیا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے (جیسا کہ باب دوم میں پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) اب خود مغرب کے مفکرین بھی تسلیم کر رہے ہیں۔ مثلاً (Ouspensky) کہتا ہے کہ

> ہر انسان دو ہستیوں کا مجموعہ ہے۔ ایک وہ جو جمادات۔ نباتات اور حیوانات کا مرکب ہے۔ یعنی وہ انسان جو زمان و مکان کی دنیا میں رہتا ہے۔ اور دوسرا وہ جس کی دنیا اس سے الگ ہے۔ اول الذکر انسان ماضی سے متعلق ہے۔ اور ثانی الذکر مستقبل کا انسان ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انسانی انا میں اس ماضی اور مستقبل کی کشمکش جاری رہتی ہے۔ انسانی روح درحقیقت اسی کشمکش کی رزمگاہ ہے۔

نیٹشے نے زرتشت کی زبان سے اسی حقیقت کا اعلان کیا تھا جب اس نے کہا تھا کہ

> میں دیروزا اور امروزہ ہوں۔ لیکن مجھ میں کچھ ایسا بھی ہے جو فردا اور مستقبل سے متعلق ہے۔

(Tertium Organum)

یعنی زندگی، جمادات، نباتات، حیوانات کے مراحل سے گذرتی ہوئی درجۂ انسانی میں پہنچی ہے۔ یہ انسان کی سابقہ (ماضی کی) تاریخ ہے لیکن انسان کا مستقبل اس ماضی کی بڑھتی ہوئی شکل نہیں بلکہ مستقبل کا انسان ماضی کے انسان سے مختلف ہے۔ اس لئے کہ انسان کے درجہ میں پہنچ کر ایک نئی چیز کی نمود ہوتی ہے جسے انسانی ذات

(Personality) یا نفس (Self) کہا جاتا ہے۔ اب مستقبل اس ذات یا نفس کا ہوگا۔ انسانی جسم اجادات، نباتات اور حیوانات ہی سے مرکب ہے۔ اس لئے اس میں طبعی قوانین کے تحت ہر آن تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن انسانی ذات یا نفس۔ خدائی طاقت (روح) کا مظہر ہے اس لئے یہ خارجی تغیرات سے متاثر نہیں ہوتا۔ علم الابدان کے ماہرین کا کہنا ہے کہ جسم انسانی اس طرح مسلسل تغیرات کی آماجگاہ بنا رہتا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد سارے کا سارا جسم بالکل نیا بن جاتا ہے۔ یعنی آپ کا جو جسم دس سال پہلے تھا اس میں سے آج کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ آپ کا آج کا جسم ایک نیا جسم ہے لیکن جس چیز کو آپ "میں" کہتے ہیں وہ بدستور وہی ہے۔ آپ نے اگر کسی سے دس سال پہلے کوئی معاہدہ کیا تھا، تو آپ ہر وقت تسلیم کرتے ہیں کہ یہ معاہدہ "میں" نے ہی کیا تھا۔ اور "میں" ہی اس کا پابند ہوں۔ یہی وہ "میں" ہے جو جسم کے ساتھ بدلتا نہیں رہتا۔ بلکہ ہمیشہ غیر متبدل (مستقل) رہتا ہے۔ لہذا یہ "میں" جسم کا حصہ نہیں، اس سے الگ ہے۔ اس سے واضح ہے کہ انسان تغیر (Change) اور ثبات (Permanence) سے مرکب ہے۔ باردیو (Berdyeau) کے الفاظ میں

> دنیا میں جس قدر تغیرات رونما ہوتے ہیں ان کے متعلق انسان کا اندازِ نگاہ دہرا ہونا چاہیئے۔ زندگی تغیر کا نام ہے۔ جدت کے بغیر زندگی کچھ نہیں۔ لیکن صرف تغیر کا تصور فریب انگیز ہے۔ انسان میں ایک ایسی شے بھی ہے جو تغیر سے ناآشنا ہے۔ اس کے بغیر تشخص ذات کا تصور ناممکن ہے۔ لہذا اپنی ذات کے نشوونما میں انسان کو خود اپنی ذات سے فریب دہی نہیں کرنی چاہیئے۔ یعنی اسے اس مستقل شے کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ جو اسے ابدی طور پر ملی ہے۔ (The Divine and the Human) عام اشیاء کی صورت میں تغیر (Change) کے معنی یہ ہیں کہ اس شے کی (جس میں تغیر واقع ہوتا ہے) پہلی حالت یکسر معدوم ہو جاتی ہے۔ یعنی (It ceases to exist) اور اس کے بعد وہ شے از سر نو ایک نئی حالت میں پیدا ہوتی ہے۔ برگساں کے الفاظ میں انسانی ذات کی یہ خصوصیت ہے کہ
>
> (We change without ceasing)
>
> ہم میں تغیر تو آتا ہے لیکن معدوم ہوئے بغیر۔

لہ (Determination of Human Personality)

یہی انسانی انا یا ذات کی خصوصیت ہے۔ پھر جیسا کہ (باب دوم میں برگساں کے حوالے سے لکھا جا چکا ہے) انسانی ذات مرکب نہیں۔ بسیط ہے۔ جوڈ اس باب میں لکھتا ہے کہ اگر انسانی ذات کو ان اثرات کا مجموعہ ہی تسلیم کر لیا جائے جن سے وہ متاثر ہوتی ہے تو بھی یہ حقیقت اپنی جگہ رہتی ہے کہ انسانی ذات کو اس کے اجزا میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے

جو کچھ ہم کرتے ہیں اس میں ہماری ذات تمام کی تمام موجود ہوتی ہے۔

(Decadence)

البتہ انسانی ذات کے اعمال (Activities) کے میدان مختلف ہو سکتے ہیں (اور ہوتے ہیں)۔ "جہاں اس میں وسعت اور پہنائی زیادہ ہو جاتی ہے اسے فلاسفر کہا جاتا ہے۔ جب اس میں گہرائی بڑھ جاتی ہے تو اسے آرٹسٹ یا فطین"۔ (ایضاً)[1]

باردیو (Berdyeau) نے اپنی کتاب (Slavery And Freedom) میں انسانی ذات (Personality) کے متعلق ذرا تفصیل سے بحث کی ہے وہ برگساں کی ہمنوائی میں کہتا ہے کہ

(Personality is changelessness in change)

انسانی ذات تغیرات کے ہجوم میں عدم تغیر کا نام ہے۔

اس حد تک یہ تصور "روحانیین" کے نظریہ کے مطابق ہے کیونکہ وہ بھی نفس انسانی (یا انسانی ذات یا روح) کے قائل ہیں لیکن اس سے آگے بڑھ کر یہ تصور اُن کے تصور سے بالکل مختلف ہو جاتا ہے۔ ان کے نزدیک انسانی نفس کا منتہائے کمال یہ ہے کہ وہ اپنے جداگانہ تشخص کو فنا کر کے اپنی اصل (خدا کی ذات) میں جذب ہو جائے۔ اس تصور کی رو سے انسانی ذات کے نشو و نما پانے اور استحکام حاصل کرنے کا تصور باطل قرار پاتا ہے لیکن ہمارے زیرِ نظر تصور کی رو سے انسانی ذات اپنا مستقل تشخص رکھتی ہے اور انسان کی جد و جہد کا مقصود یہ ہے کہ اس کی ذات اس قدر پختگی حاصل کر لے کہ اس کا جداگانہ تشخص فنا ہونے پائے۔ چنانچہ اس باب میں باردیو لکھتا ہے:-

انسانی ذات اپنی ہستی مستقل اور جداگانہ رکھتی ہے۔ اس لئے ایک ذات کا تعلق دوسری ذات سے خواہ وہ ذات خود ذات خداوندی ہی کیوں نہ ہو، جزو اور کل کا تعلق نہیں ہوتا۔ ہر ذات اپنا مستقل وجود رکھتی ہے اور کسی

[1] ہم اس پر یہ اضافہ کریں گے کہ جہاں اس کی وسعت اور گہرائی دونوں میں اضافہ ہو جاتا ہے اسے مومن کہا جاتا ہے۔

دوسری ذات میں مدغم نہیں ہو سکتی۔ جزو کا کل کے ساتھ تعلق ریاضی کا تعلق ہے۔ جس طرح جسم کے ساتھ حیاتیاتی تعلق ہے (کسی ذات کے ساتھ تعلق اس قسم کا نہیں ہوتا)۔

اس کے بعد بار دیو لکھتا ہے کہ "انسانی ذات کی انفرادیت خود اس فرد سے بلند درجے کی ہوتی ہے"۔ جہاں تک خدا کا تعلق ہے، وہ لکھتا ہے کہ

خدا اور انسان کا تعلق سبب اور مسبب کا تعلق نہیں۔ یہ بھی نہیں کہ ایک خاص ہے اور دوسرا عام۔ نہ ہی ان کا تعلق مقصد اور ذریعہ کا ہے۔ اور نہ ہی غلام اور آقا کا۔ ہم اس تعلق کی کوئی مثال نہیں پیش کر سکتے۔ اس قسم کا تعلق نہ آفاقی کائنات میں کسی جگہ نظر آتا ہے اور نہ ہی انسان کی اجتماعی زندگی میں۔ خدا بے شک مقصود (End) ہے لیکن انسانی ذات اس مقصد کے حصول کا فقط ذریعہ (Means) نہیں۔ علم الٰہیات کا یہ عقیدہ کہ خدا نے انسان کو اپنی حمد و ستائش اور جبروت و کبریائی کی تعریف و توصیف کے لئے پیدا کیا انسانیت کی ذلت ہے۔ نہیں! یہ خود خدا کے بھی شایانِ شان نہیں۔ اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ جو عقیدہ انسان کے لئے وجہِ ذلت ہو وہ خدا کے لئے بھی باعثِ ذلت ہوتا ہے۔ لہٰذا انسانی ذات کا خدا کی ذات سے تعلق مقصد اور ذریعہ کا تعلق نہیں۔ ہر ذات، مقصود بالذات ہوتی ہے۔ وہ اپنا مقصد آپ ہوتی ہے۔

البتہ یہ حقیقت ہے کہ انسانی ذات نہ اپنی نشو و نما حاصل کر سکتی ہے اور نہ ہی تکمیل جب تک ماورائے انسان، اقدار موجود نہ ہو۔ یعنی جب تک خدا موجود نہ ہو۔

یہ بھی واضح رہے کہ ہر ذات کی اپنی دنیا الگ ہوتی ہے۔ یہ کسی دوسرے کی دنیا کا حصہ نہیں ہو سکتی۔

میکانکی تصورِ حیات کے متعلق بحث کرتا ہوا بار دیو کہتا ہے کہ

انسان میں جو کچھ میکانکی طور پر کام کرتا ہے۔ جس کی حرکت محض مشین کی سی ہے۔ اس کا انسان کی **ذات** سے کچھ تعلق نہیں۔ "خدا کا عکس" اور "میکانکی عکس" بالکل متضاد تصورات ہیں

انسانی ذات کی قدر و قیمت کیا ہے؟ اس کے متعلق وہ کہتا ہے کہ

انسان اپنی جان بھی دے سکتا ہے۔ اور ایسے مواقع آجاتے ہیں جہاں یہ اپنی جان فی الواقعہ دے دیتا ہے۔ لیکن اسے اپنی ذات کو کبھی نہیں دینا چاہیئے (یہ جان سے بھی عزیز تر متاع ہے۔) انسانی ذات جھکنا نہیں جانتی۔

موت کے متعلق وہ کہتا ہے کہ

موت انسانی ذات کا خاتمہ نہیں کرتی وہ صرف خارجی دنیا کے وجود کا خاتمہ کرتی ہے

اس کی تکمیل اور وجود کے متعلق لکھتا ہے کہ

انسانی ذات، اندرونی یکجہتی اور وحدت کا نام ہے۔ اپنے آپ پر ضبط کا نام۔ غلامی پر قدرت پا لینے کا نام جب انسان کے مختلف عناصر ذہنی، جذباتی اور احساساتی عناصر الگ الگ کام کرنے لگیں، سمجھو کہ انسانی ذات میں انتشار واقع ہو رہا ہے۔ اس کے برعکس جب انسانی ذات اندرونی استحکام حاصل کر لیتی ہے تو انسان خوف سے مامون ہو جاتا ہے۔

پروفیسر (Ervin Schodinger) نے ایک چھوٹی سی لیکن بڑی اہم کتاب لکھی ہے (What IS Life -) وہ اس کتاب کے خاتمہ پر لکھتا ہے

"میں" کسے کہتے ہیں:

اگر آپ "میں" کا تجزیہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ یہ انسانی تجارب اور حافظہ کے مجموعے سے کچھ زیادہ کا نام ہے یہ وہ پردہ ہے جس پر انسانی تجربہ اور حافظہ کے نقوش جمع ہوتے ہیں۔ اگر آپ اپنی داخلی دنیا کا غور سے مطالعہ کریں گے تو آپ پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ جسے آپ "میں" کہتے ہیں، وہ اس بنیاد کا نام ہے جس پر تجربے اور حافظے کی عمارت اٹھی ہے۔

تم کسی نئے ملک میں چلے جاؤ۔ تمہارے تمام سابقہ دوست تمہاری نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں گے ہو سکتا ہے کہ رفتہ رفتہ تمہاری یاد سے بھی اتر جائیں، ان کی جگہ نئے دوست لے لیں۔ اور وہ تمہاری زندگی میں اسی شدت اور گہرائیوں سے شریک ہو جائیں جس طرح تمہارے سابقہ دوست تھے اس طرح پرانے دوستوں کی یاد محو ہوتی چلی جائے گی۔ تمہارے شباب کے قصے ایسے محسوس ہوں گے گویا کسی اور کی داستان ہیں لیکن بایں ہمہ جہاں تک "میں" کا تعلق ہے اسے موت نہیں آئی۔ موت تو ایک طرف اس میں کوئی انقطاع بھی واقع نہیں ہوا۔ اگر کوئی کامیاب جنیاتسٹ (ماہر عمل تنویم) ایسا بھی کر دے کہ تمہاری تمام سابقہ یادداشت ذہن سے یکسر محو ہو جائے پھر بھی تم دیکھو گے کہ اس سے تمہاری "میں" کی موت نہیں واقع ہو جائے گی۔ لہذا

انسانی ذات کی ہستی کبھی ضائع نہیں ہوتی۔

نہ ہی یہ کبھی ضائع ہو گی۔

برگسان اس سے بھی آگے جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خود حافظہ (Memory) بھی مادی جسم کی پیداوار نہیں بلکہ انسانی ذات کی تخلیق ہے۔ وہ اپنی کتاب (Matter And Memory) میں لکھتا ہے کہ

> آپ نے اب سمجھ لیا ہو گا کہ حافظہ کیوں دماغ کا فعل نہیں ہو سکتا۔ دماغ حافظہ کے تسلسل کو قائم رکھتا ہے اور اسے مادی قالب میں سمو کر اس قابل بنا دیتا ہے کہ یہ حال پر اپنا تصرف کر سکے لیکن خالص حافظہ روحانیت کا مظہر ہے حافظہ کی دنیا درحقیقت روح کی دنیا ہے[1]۔

ہکسلے (A.Hu ley) اپنی کتاب (Means And Ends) میں لکھتا ہے کہ

> بہر حال اسے تسلیم کرنا پڑے گا کہ نفسِ انسانی (اس کا نام کچھ ہی رکھ لیجئے) جسمِ انسانی سے الگ اپنا وجود رکھتا ہے اور جسمانی زندگی کے کوائف و قوانین کے تابع نہیں۔

اور پروفیسر (Ernest Cassirer) اس باب میں رقمطراز ہے کہ

> انسانی زندگی میں نت نئی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن انسان کی حقیقی قدر و قیمت کا راز اس "داخلی نظام" میں ہے جو تغیرات سے ماوراء ہے۔ ہذا انسان اسی طبعی دنیا کا باشندہ نہیں اس کے ماوراء ایک اور دنیا بھی ہے جسے "اشارات کی دنیا" کہا جا سکتا ہے۔ (A) Essay On Man)

یہ ہے نفسِ انسان کے متعلق دورِ حاضر کے مفکرین اور سائنسدانوں کے خیالات۔ یعنی نفسِ انسانی جسم سے الگ اور ماوراء اپنی مستقل ہستی رکھتا ہے اور اس کی نشوونما، جسمانی نشوونما سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ جسمِ انسانی طبعی قوانین کے تابع ایک مدت کے بعد فنا (منتشر Disintegrate) ہو جاتا ہے لیکن نفسِ انسانی نشوونما پا لینے کے بعد فنا نہیں ہوتا۔ اس باب میں دورِ حاضرہ کا مشہور باطنی مفکر گرجیف (G.Gurdjieff) جس کی شاگردی اوسپنسکی نے اختیار کی تھی، اپنی کتاب (All and Everything) میں لکھتا ہے:

---

[1] ان امور کی تفصیل (کہ بعض حوادث میں حافظہ یکسر محو ہو جاتا ہے۔ اور غشی کے عالم میں حافظہ بالکل کام نہیں کرتا وغیرہ) معارف القرآن کی آئندہ جلد میں ملے گی جو اس وقت زیر ترتیب ہے۔

اگر انسان ہر آن بدلتا رہے۔ اگر اس میں کوئی ایسی شے نہ ہو جو خارجی تغیرات سے اثر پذیر نہ ہو۔ تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اس میں کوئی چیز ایسی نہیں جو موت کا مقابلہ کر سکے۔ لیکن اگر وہ خارجی اثرات سے آزاد ہو جائے۔ اگر اس میں اس شے کی نمود ہو جائے جو اپنی زندگی جئے۔ تو یہ شے کبھی مر نہیں سکتی۔ عام حالات میں ہم ہر ثانیہ مرتے رہتے ہیں خارجی حالات بدلتے ہیں اور ان کے ساتھ ہم بھی بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر انسان اپنے اندر مستقل انا کو نشوونما دے لے تو یہ خارجی تغیرات سے غیر متاثر رہ سکتا ہے۔ اور اس طرح طبعی جسم کی موت کے بعد بھی زندہ رہ سکتا ہے۔

علامہ اقبال کے الفاظ میں

زندگانی ہے صدف، قطرۂ نیساں ہے خودی — وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی — یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

یہی وہ انسان ہے جس کے متعلق بارڈیو کہتا ہے کہ

وہ تاریخ اور کائنات کی زندگی میں جیتا ہے، لیکن تاریخ اور کائنات سے متاثر نہیں ہوتا بلکہ انہیں اپنے ارادوں کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔ اس قسم کا انسان صرف اپنی ذات کی، یا ان لوگوں کی ذمہ داری ہی نہیں لیتا جو اس کے گردوپیش ہوں، بلکہ تمام نوعِ انسانی کے مقدرات کی ذمہ داری اپنے سر لیتا ہے۔

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ مغرب کے مفکرین اور سائنسدان خود اس حقیقت کا اعتراف کر رہے ہیں کہ انسانی ذات جسم سے الگ، اپنا مستقل وجود رکھتی ہے اور اس کے خصائص و عوامل طبعی جسم کے خصائص سے مختلف ہیں۔

جسمِ انسانی کی نشوونما میکانکی طور پر ہوتی رہتی ہے اس میں انسانی اختیار و ارادہ کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ آپ کا کام فقط اتنا ہے کہ بھوک لگنے پر کھانا کھالیں۔ یہ کھانا کس طرح جزوِ بدن بنتا ہے اور اس سے کس طرح آپ کے جسم کی پرورش ہوتی رہتی ہے آپ کے اختیار و ارادہ کا محتاج نہیں۔ یہ سب کچھ میکانکی طور پر خود ہوتا رہتا ہے لیکن نفسِ انسانی کی نشوونما اس طرح میکانکی طور پر نہیں ہوتی۔ اس کی نشوونما ان اعمال (Actions) سے ہوتی ہے جنہیں آپ اپنے اختیار و ارادہ سے کرتے ہیں۔ یعنی جسم کی پرورش (ربوبیت) غذا سے ہوتی ہے اور نفسِ انسانی کی ربوبیت اس سے کہ آپ اپنے اختیار و ارادہ کو کس طرح استعمال کرتے ہیں۔ اوسپنسکی اپنی ایک اور کتاب میں لکھتا ہے کہ

۱؎ غور کیا آپ نے کہ یہ انسان مارکس کے انسان سے کس قدر مختلف ہے جو "تاریخی وجوب کی اندھی قوتوں کی زنجیروں میں جکڑا رہتا ہے!

انسانی ارتقاء سے مفہوم ہے ان قوی اور ممکنات کا نشوونما پانا جو از خود نشوونما نہیں پا سکتیں۔ یعنی جن میں میکانکی طور پر بالیدگی نہیں پیدا ہو سکتی۔ صرف اس نہج کا ارتقاء صرف اس انداز کی بالیدگی، انسان کا حقیقی ارتقاء کہلا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور چیز کو انسان کا ارتقاء نہیں کہا جا سکتا۔

(In Search Of The Miraculous)

ارتقاء تو ایک طرف، جوڈ کے خیال کے مطابق، انسان کے متعلق صحیح علم بھی حاصل نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ اس کی ذات (Personality) کا علم نہ ہو۔ اور یہ چیز سائنس کے بس کی بات نہیں۔ وہ لکھتا ہے :-

انسان کا حقیقی علم اس کی زندگی کے مختلف شعبوں کے علم کا مجموعہ نہیں۔ خواہ یہ علم کتنا ہی جامع اور صحیح کیوں نہ ہو۔ انسان کے متعلق صحیح علم کے معنی ہیں انسان کا تمامًا علم اور اس قسم کا علم اسی صورت میں ممکن ہے جب اس کی ذات کا علم ہو۔ اس لئے کہ انسانی ذات ہی سے تو انسان کی تکمیل ہوتی ہے۔ انسانی ذات، انسان کے تمام اجزا کو اپنے اندر سمو لیتی ہے۔ اور ان کے مجموعے سے کچھ الگ ہوتی ہے۔ انسانی ذات کا علم سائنس کے احاطے سے باہر کی چیز ہے۔ اس لئے نہیں کہ سائنس انسانی ذات کا تجزیہ کر کے اس کے الگ الگ اجزا کا علم حاصل کرنا چاہتی ہے اور ایسا کرنا ناممکن ہے (علم تجزیۂ نفس کے ماہرین ایسا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اس کوشش میں انسانی ذات پھسل کر ان کے ہاتھوں سے صاف نکل جاتی ہے) بلکہ اس لئے کہ اس کوشش کے نتیجے کو علم کہا ہی نہیں جا سکتا۔

(Philosophical Aspects Of Modern Science)

انسانی جسم سے آگے بڑھ کر آپ دنیائے سائنس کی طرف آئیے۔ ایک سائنسدان اپنی لیبارٹری (معمل) میں بیٹھا ایٹم بم کے متعلق تحقیق کر رہا ہے۔ وہ مختلف اشیاء کا تجزیہ کرتا ہے، ان کے خواص معلوم کرتا ہے۔ مختلف اشیاء کے امتزاج سے ان کا ردِ عمل معلوم کرتا ہے۔ یہ سب کچھ میکانکی طور پر ہو رہا ہے۔ اس میں اس کے اختیار و ارادے کو کچھ دخل نہیں یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ چاہے تو پانی کا قطرہ شق ہو کر ہائیڈروجن اور آکسیجن بن جائے اور چاہے تو نائٹروجن اور کاربن میں تبدیل ہو جائے۔ ان تمام اشیائے کائنات کے اعمال و خواص (Actions and properties) پہلے سے متعین ہیں۔ انسان کا کام صرف یہ ہے کہ ان خواص کا انکشاف (Discover) کرے۔ اس انکشاف سے سائنس(دان)

نے ایٹم بم تیار کر لیا ہے۔ اس سے علمی دنیا میں اضافہ ہوا۔ لیکن یہ سب کچھ میکانکی طور پر ہوا۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ اس ایٹم بم کا استعمال کہاں کیا جائے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انسان کے اختیار و ارادہ کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ یعنی علم انسانی کا مصرف کیا ہونا چاہیئے؟ اس کا مدار انسان کے اپنے اختیار پر ہے۔ انسانی ذات کی تربیت (Development) یہ سکھاتی ہے کہ انسانی علم کا صحیح مصرف کیا ہونا چاہیئے۔ اسی لئے (Mason) لکھتا ہے کہ

انسانی علم کا مصرف

> انسان کی نجات اس میں نہیں کہ وہ آسمان سے تارے توڑنے والی عقل حاصل کرے۔ اس کی نجات کی راہ یہ ہے کہ وہ علم کے ساتھ ساتھ اپنی ذات کا ارتقاء بھی کرتا جائے تاکہ اسے اپنے علم کا صحیح مصرف معلوم ہو جائے۔

(The Creative Freedom)

ان تصریحات سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ انسان کی ربوبیت (پرورش) سے مفہوم صرف انسانی جسم کی پرورش نہیں بلکہ نفسِ انسانی کی تربیت و ارتقاء بھی ہے اور ارتقائے نفس پر انسانی معاشرہ کا بہت بڑا دار و مدار ہے۔

قرآن کریم زندگی کا مقصود، انسانی ذات (نفس) کا نشوونما (تزکیہ یا تربیت) قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا (۹۱/۷) نفسِ انسانی اور وہ قوتیں جو اس میں توازن اور تقویت پیدا کرتی ہیں اس پر شاہد ہیں کہ اس میں کمزور پڑ کر منتشر ہو جانے اور تربیت پا کر ثابت رہنے کی صلاحیتیں ودیعت کر کے رکھ دی گئی ہیں (فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۹۱/۸)۔ سو جس نے اس کی نشوونما کی، اس کی کھیتی پروان چڑھے گی اور جس نے اسے خاک کے تودے کے نیچے دبا دیا تو وہ تباہ و برباد ہو جائے گا (قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۹۱/۹-۱۰)۔ زکار کے معنی نشوونما پانا۔ بالیدگی حاصل کرنا کھیتی کا بڑھنا ہے اسی سے تزکیہ اور زکوٰۃ کا لفظ نکلا ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ (قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۸۷/۱۴) جو اپنی ذات کی نشوونما کا سامان کرتا ہے اس کی کھیتی بار آور ہوتی ہے۔ قرآن نے جنت اور جہنم کی لمبی چوڑی تفصیلات بیان کی ہیں ان تفصیلات کے پیش کرنے کا یہ موقع نہیں۔ اس وقت صرف اتنا دیکھئے کہ قرآن نے بتایا ہے کہ جہنم وہ مقام ہے جس میں زندگی کی نشوونما رک جاتی ہے (وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۲/۱۷۴)

قرآن اور نفسِ انسانی کا ارتقاء

لے (Integration and Disintegration)

ان کے لئے مستقبل کی زندگی میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ (اُولٰٓئِکَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ...... وَلَا يُزَكِّيْهِمْ 3/77) جہنم[1] کے لئے عربی لفظ جحیم آیا ہے۔ جحم کے معنی روک دینے کے ہیں۔ یعنی اہلِ جہنم وہ ہیں جن کی نشوونما رک چکی ہو گی۔ جو آگے بڑھنے کی صلاحیت نہ رکھیں۔ لہٰذا قرآن کی رو سے انسانی زندگی کا مقصود یہ ہے کہ انسانی ذات یا نفس (خودی۔ یا انا) کی نشوونما (تزکیہ۔ ربوبیت) ہو جائے۔ نفسِ انسانی ربوبیت حاصل کر کے اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ اس زندگی سے آگے بڑھے اور ارتقائی منازل طے کرتا ہوا بڑھتا چلا جائے۔ لہٰذا نفسِ انسانی کی ربوبیت کے تصور کے ساتھ ہی اس زندگی سے متصل اگلی زندگی پر ایمان بھی لاینفک ہو جاتا ہے۔

اس کا علم کیسے ہو؟ یہاں سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کو معلوم کیسے ہو کہ اس کی ذات کی مضمر صلاحیتیں (Latent Potentialities) کیا ہیں۔ کیونکہ جب تک اس کا علم نہ ہو، یہ تعین کرنا ناممکن ہو گا کہ انسانی ذات کی نشوونما ہو رہی ہے یا نہیں اور اگر ہو رہی ہے تو کس حد تک۔ انسانی جسم کے متعلق ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ اب کمزور ہو رہا ہے اور اب طاقتور۔ اب اس کی فلاں قوت (مثلاً بینائی) کمزور ہو رہی ہے اور اب وہ اپنی اصلی حالت پر آ رہی ہے۔ اس لئے جسم اور اس کی صلاحیتوں کی نشوونما (Development) کے متعلق معلوم کرنے میں دشواری نہیں ہوتی۔ لیکن انسانی ذات غیر محسوس اور غیر مرئی ہے اس کے متعلق کیسے معلوم ہو کہ اس کی خصوصیات کیا ہیں اور ان کی نشوونما ہو رہی ہے یا نہیں؟

قرآن نے کہا ہے کہ جسے نفسِ انسانی (self) کہا جاتا ہے اس کا تعلق روحِ خدائی (Divine energy) سے ہے۔ لہٰذا یہ معلوم کرنے کے لئے کہ انسانی ذات کی خصوصیات کیا ہیں ہمیں معلوم کرنا ہو گا کہ خود روحِ خداوندی کی خصوصیات یا خدا کی صفات کیا ہیں؟ قرآن نے اس کے لئے اسماء الحسنیٰ (balanced Attributes of God) کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ یہ اسماء حقیقتِ مطلقہ کے مختلف گوشے ہیں (various aspects or - Facets of Absolute Reality) قرآن نے ان اسماء کا ذکر شرح و بسط سے کیا ہے۔ چونکہ انسانی ذات روحِ خداوندی ہی کی مظہر (Manifestation) ہے اس لئے، اسماء الحسنیٰ سے ایک سمٹے ہوئے انداز میں خود انسانی صفات کی مختلف صلاحیتوں کا بھی تعارف ہو جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

---

[1] جہنم۔ عبرانی زبان کا لفظ ہے۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۲۱/۱۰)

ہم نے تمہاری طرف جو کتاب بھیجی ہے حقیقت یہ ہے کہ اس میں خود تمہارا ہی ذکر ہے۔ کیا تم اس میں غور و فکر نہیں کرتے؟

لہٰذا اسماء الحسنیٰ (حدودِ بشریت کے اندر) خود نفسِ انسانی (Human Ego) کے مختلف گوشوں کی ترجمانی بھی کرتے ہیں۔ اقبالؔ کے الفاظ میں:

محمد بھی ترا۔ جبریل بھی۔ قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

یعنی یہ تذکرہ ہے ان صلاحیتوں کا جو نفسِ انسانی میں مضمر ہیں اور جن کی نشوونما اور بالیدگی (ربوبیت) مقصدِ زندگی ہے لہٰذا اب ہمارے سامنے ایک مستقل معیار آگیا جس سے ہر وقت پہچانا اور ماپا جاسکتا ہے کہ ہماری کون کون سی صلاحیت نشوونما پا رہی ہے اور کونسی ہنوز خوابیدہ ہے۔

برگساںؔ کے نزدیک کائنات کا فریضہ ہی یہ ہے کہ وہ اس قسم کے انسان پیدا کرے جن میں صفاتِ خداوندی کی نمود ہو چنانچہ وہ اپنی کتاب (The Two Sources Of Religion And Morality) میں لکھتا ہے:

> آج نوعِ انسانی خود اپنی ترقی کے بوجھ کے نیچے دبی، کچلی ہوئی مصروفِ آہ و فغاں ہے۔ یہ اس لئے کہ انسان کو اس کا احساس نہیں کہ اس کا مستقبل خود اس کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے لئے سب سے پہلے اس امر کا فیصلہ کرنا ہوگا کہ انسان زندہ رہنا چاہتا ہے یا نہیں۔ پھر اس کے بعد یہ کہ انسان محض زندہ رہنا چاہتا ہے یا اس سے آگے بڑھ کر، فریضۂ کائنات کی تکمیل کے لئے جدوجہد کرنے کے لئے بھی تیار ہے۔ فریضۂ کائنات کیا ہے؟ صفاتِ خداوندی رکھنے والے افراد کی تخلیق۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی رو سے کفر اور ایمان کی تمیز، زندگی کے انہی دونوں حصوں کی تمیز ہے۔ مادیئین کے نقطۂ نگاہ سے انسان حیوان ہی کی ارتقاء یافتہ شکل کا نام ہے اس لئے انسانی خصائص، حیوانی جبلت کی ذرا لطیف صورت ہیں۔ اور بس۔ لہٰذا دوسرے حیوانات کی طرح، اس کی زندگی کا مقصد بھی جسم کی پرورش اور افزائشِ نسل ہے

اس کے علاوہ نہ زندگی کا کوئی نصب العین ہے نہ مستقبل۔ قرآن کہتا ہے کہ انسان کے متعلق یہ تصورِ زندگی کفر ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ (۴۷/۱۲)

جو لوگ کفر کی روش کے حامی ہیں اُن کا نظریۂ زندگی یہی ہے کہ جس طرح حیوانات کھاتے پیتے ہیں اسی طرح کھاؤ۔ پیو اور لذّاتِ دنیاوی سے تمتّع حاصل کرو۔ اور بس۔

اس کے برعکس قرآن کہتا ہے کہ انسان کی زندگی کا ایک حصّہ تو بے شک حیوان ہی کی ارتقاء یافتہ شکل ہے اس کی زندگی کا یہ حصّہ وہ ہے جس میں یہ حیوانات کی طرح قوانینِ طبعی کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے (کھانا۔ پینا۔ سونا۔ افزائشِ نسل کرنا۔ اور مر جانا)۔ لیکن اس کی زندگی کا دوسرا (اور بلند) حصّہ حیوان کی ارتقاء یافتہ شکل نہیں بلکہ صفاتِ خداوندی کا مظہر ہے اس کے اس حصّۂ زندگی کی خصوصیات صرف انسان کے لئے مختص ہیں، حیوان ان میں قطعاً شریک نہیں اس مقام میں یہ منفرد ہے۔ ایمان باللہ (خدا پر ایمان لانے) کا عملی مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کے اس حصّہ کو بھی تسلیم کرے۔ اس حصّۂ زندگی کی نشو و تربیت کا نام ہے صبغۃ اللہ۔ یعنی صفاتِ خداوندی کے رنگ میں رنگے جانا۔ اسی سے ایمان بالآخرۃ وابستہ ہوتا ہے، کیونکہ زندگی کا تسلسل اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان کی زندگی حیوانی سطح سے بلند ہو۔

قرآنی نظامِ ربوبیت انسانی زندگی کے ان دونوں حصّوں کی نشو و نما کرتا ہے۔

یہاں تک دو باتیں ہمارے سامنے آگئیں:

(۱) انسان میں جسم کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے جسے نفسِ انسانی یا انسانی ذات کہا جاتا ہے۔ جسم کے ساتھ ساتھ اس کی نشو و نما بھی نہایت ضروری ہے۔ یعنی نفسِ انسانی کی مضمر صلاحیتوں کی ربوبیت۔

(۲) قرآن نے جن صفاتِ خداوندی (اسماء الحسنیٰ) کا ذکر کیا ہے، انہی سے ہم نفسِ انسانی کی صلاحیتوں سے بھی متعارف ہو سکتے ہیں۔ اور اسی سے ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ ہماری کون کون سی صلاحیت نشو و نما پا رہی ہے، اور کون کون سی خوابیدہ ہے۔

مصرف کیا ہونا چاہیے

اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ جب ہماری یہ صلاحیتیں نشو و نما پا جائیں تو ہمیں کس طرح معلوم ہو کہ فلاں صلاحیت (قوت) کا صحیح مصرف کیا ہے۔ اس لئے کہ جیسا کہ

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں، اصل مقصد قوت کا نشو و نما یا حصول نہیں۔ بلکہ اس قوت کا مصرف ہے۔ اس کے لئے قرآن نے یہ بتایا ہے کہ

مستقل اقدار

اشیائے کائنات کی (ربوبیت) نشو و نما کے لئے مختلف مواقع پر مختلف قسم کی صفاتِ خداوندی کا ظہور ہوتا رہتا ہے۔ اسی طرح جب انسانی دنیا میں اسی قسم کے حالات رونما ہوں تو انسان کی طرف سے بھی اسی قسم کی صفت کو ظہور میں آنا چاہیئے۔ بالفاظِ دیگر، ایک قسم کے حالات میں ایک ہی قسم کی صفت کا ظہور۔ یعنی ایک قسم کے حالات میں ہمیشہ ایک ہی قسم کا ردِ عمل (Re-Action)۔ یہ نہیں کہ جب ہمارے ہاں اسی قسم کے حالات رونما ہوں تو ہمارا ردِ عمل کچھ اور ہو اور جب اسی قسم کے حالات کسی غیر قوم میں رونما ہوں تو ہمارا ردِ عمل کچھ اور ہو جائے۔ جس طرح صفاتِ خداوندی کا ظہور، زمان، مکان، رنگ، نسل، جغرافیائی حدود، لسانی تفریقات سے غیر متاثر رہتا ہے اسی طرح ہمارا ردِ عمل بھی ان امتیازات سے غیر متاثر رہنا چاہیئے۔ ایک قسم کے حالات میں ہمیشہ اسی قسم کا "ردِ عمل"! اسے کہتے ہیں مستقل اقدار (Permanent Values) کی پابندی۔ لہذا انسانی قوتوں کا استعمال ہمیشہ مستقل اقدار کے تابع ہونا چاہیئے۔

اسے دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ عقل کا تقاضا تحفظِ جان ہے یعنی اپنے مفاد کی حفاظت۔ اگر ان مفاد کا تحفظ دیانت اور راست بازی سے ہوتا ہے تو عقل اس مسلک کو اختیار کر لیگی اور اگر انکا تحفظ جھوٹ اور بد دیانتی سے ہوتا ہے تو وہ یہ راستہ اختیار کر لیگی۔ یعنی اس کے نزدیک صداقت اور دیانت کی کوئی قیمت فی ذاتہٖ (Intrinsic Value) نہیں۔ ان کی قیمت صرف اضافی (Relative) ہے۔ اگر یہ تحفظِ مفاد کے لئے ممد ہیں تو یہ اصول قیمتی ہیں۔ اگر نہیں، تو ان کی کوئی قیمت نہیں۔ بالفاظِ دیگر، عقل کی رو سے دنیا میں مستقل اقدار کا کوئی وجود نہیں۔ لیکن اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ اپنے اصولوں کی خاطر اپنے کسی مفاد کی پرواہ نہیں کرتے۔ حتیٰ کہ اصول کی خاطر جان تک بھی دے دیتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک، اصل قیمت جان کی نہیں بلکہ اصول کی ہے۔ ان کا مسلک یہ ہوتا ہے کہ اگر جان کو محفوظ رکھتے ہوئے اصول کی حفاظت ہوتی ہے تو جان کو محفوظ رکھا جائے۔ لیکن اگر کبھی ایسا موقعہ آجائے کہ جان اور اصول میں کشمکش (Tie) پڑ جائے اور ان میں سے ایک ہی چیز محفوظ رکھی جا سکے، تو جان دیدی جائے لیکن اصول پر آنچ نہ آنے دی جائے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اُن کے نزدیک اصول کی قیمت مستقل ہے۔

قرآن اسی تصورِ حیات کا حامل ہے۔ اس کے نزدیک صفاتِ خداوندی ابدی صداقتیں (Eternal Truths) یعنی مستقل اقدار ہیں جن کا تحفظ بہر حال و بہر کیف ضروری ہے۔ اگر ان اقدار کا تحفظ جان کی سلامتی کے ساتھ ممکن ہے تو جان کو سلامت رکھنا چاہیئے۔ لیکن اگر کبھی ایسا وقت آجائے کہ ان کا تحفظ جان دے کر ہوتا ہے تو اس وقت جان تک بھی دیدینی چاہیئے۔ زندگی جان کی سلامتی کا نام نہیں۔ زندگی درحقیقت ان مستقل اقدار کی حفاظت کا نام ہے۔ اسی لئے

ہے کبھی جاں۔ اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے دعوئے صداقت کے پرکھنے کا معیار "موت کی تمنا" قرار دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان سے کہو کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو موت کی تمنا کرکے بتاؤ۔

فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۲/۹۴)

اور اس کے بعد خود ہی بتا دیا کہ یہ لوگ کبھی موت کی تمنا نہیں کریں گے۔

وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا (۲/۹۵)

موت کی تمنا تو ایک طرف۔ یہ لوگ تو زندگی کے اس قدر حریص ہیں کہ موت کے تصور سے ان کی جان جاتی ہے۔

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ (۲/۹۶)

اس لئے کہ ان کے نزدیک اصول اور صداقت کی کچھ قیمت نہیں۔ قیمت صرف اس دنیاوی زندگی کی ہے۔ لیکن ان کے برعکس جن لوگوں کو معلوم ہے کہ اصول کی خاطر جان دیدینے ہی میں اصلِ حیات ہے وہ بلا تامل و تذبذب۔ تبسم برلب موت کا استقبال کرتے ہیں۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق

عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

یہی وجہ ہے کہ قرآن کی رو سے، وہ سعادت مند انسان جو ان ابدی صداقتوں کے تحفظ کے لئے جان تک دیدیتے ہیں (اور جنہیں عرفِ عام میں شہید کہا جاتا ہے) کبھی نہیں مرتے اُن کے نصیب میں حیاتِ جاوید ہوتی ہے۔ جان کا دیدینا تو انتہائی مرحلہ ہے۔ اس سے پہلے بھی بہت سے مقام ایسے آتے ہیں جن میں انسان کے

ذاتی مفاد اور اصول کے تحفظ کا سوال سامنے آتا ہے۔ ان مقامات میں عقل کا تقاضا ذاتی مفاد کا تحفظ ہوگا۔ لیکن تحفظ اصول کا تقاضا کچھ اور ہوگا۔ "اصول" کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے سامنے زندگی کا ایک مستقل۔ غیر متبدل۔ نصب العین ہے اور اصول ان ذرائع کا نام ہے جن سے آپ اس نصب العین تک پہنچ سکتے ہیں۔ لہٰذا اصول، یا مستقل اقدار کا سوال صرف اس کے سامنے آئے گا جس کے پیش نظر زندگی کا نصب العین (جسمانی پرورش سے آگے) کچھ اور بھی ہوگا۔ (Dean Inge) کے الفاظ میں

> انسان ایک عجیب وغریب حیوان ہے۔ کیونکہ اس میں شہید ہو جانے کی بھی صلاحیت ہے۔ اس کے لئے اتنا ہی ضروری نہیں کہ اس کی مادی ضروریات پوری کردی جائیں۔ اس کے لئے ایک نصب العین کی ضرورت ہے جس کے لئے یہ جیے اور جس کے لئے اگر ضرورت پڑے تو یہ جان تک بھی دیدے۔ (ان سے مفہوم یہ ہے کہ دنیا میں مستقل اقدار بھی ہیں جن کی خاطر انسان جان تک بھی دے دیتا ہے)۔ جسمانی زندگی اور اس کی لذات کا شمار ان مستقل اقدار میں نہیں ہوسکتا۔
>
> (The Fall Of idols)

یہاں تک ہم نے دیکھ لیا کہ انسان کے سامنے ایک تو اس کے ذاتی مفاد ہوتے ہیں اور دوسرے مستقل اقدار جن کے ذریعے انسان "زندگی کے نصب العین" کو حاصل کرسکتا ہے انسان کا جسم اور اس کے مفاد ایسی بدیہی چیزیں ہیں جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ ان سے کسی کو انکار نہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ خود قرآن، زندگی کے اس حصے کو کس قدر اہمیت دیتا ہے۔ اس کے نزدیک جسم اور اس کی پرورش کے تقاضے ایسے حقائق ہیں جن سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ لہٰذا ان تقاضوں کو نہایت خوشگواری سے پورا کرنا (یعنی دنیاوی زندگی کو عزت وآبرو، آرام اور سہولت سے بسر کرنا) انسان کے بنیادی تقاضوں میں سے ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ہم نے "مستقل اقدار" یا "نصب العین حیات" کا جو ذکر کیا ہے ان سے کیا مقصود ہے؟ جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں، قرآن کہتا ہے کہ انسانی جسم، مادی عناصر سے مرکب ہے۔ اس لئے موت کے ساتھ جسم کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن انسان صرف جسم ہی کا نام نہیں۔ اس کے اندر جسم کے علاوہ دوسری چیز

بھی ہے جسے نفس یا ذات کہا گیا ہے۔ اگر اس دوسری چیز کی پرورش (نشوونما۔ ربوبیت) ہو جائے تو اسے حیاتِ جاوداں حاصل ہو جاتی ہے۔

قرآن کی رو سے انسانی زندگی کی آماجگاہ، مادی کائنات کی چار دیواری ہی نہیں۔ اس کے میدان بہت وسیع ہیں۔ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ تم اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (زمان و مکان کی حدود) سے آگے نکلنا چاہتے ہو؟ یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۵۵/۳۳) وہ کہتا ہے کہ ایسا بھی ممکن ہے (فَانْفُذُوْا ۵۵/۳۳)۔ لیکن اس کے لئے قوت کی ضرورت ہے (لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ۵۵/۳۳) یہ قوت، نفسِ انسانی کی ربوبیت سے حاصل ہوتی ہے۔ برگساں کہتا ہے کہ

> انسان کے ارتقاء سے مقصود یہ ہے کہ وہ ان حدود سے آگے بڑھ جائے جو مادی فطرت نے انسان پر عائد کر رکھی ہیں۔
>
> (The Two Sources Of Morality And Religion)

برگساں اس ارتقاء کے لئے اصطلاح بھی قرآن ہی کی استعمال کرتا ہے۔ یعنی "رجعت الی اللہ" (Getting Back To God) قرآن نے کہا ہے کہ خدا کا قانونِ تخلیق و ارتقاء تمہیں مختلف حالات سے گزارتا ہوا اس مقام (انسانیت) تک لایا ہے (وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ۷۱/۱۴) اس کے بعد تم طبقاً عن طبق۔ درجہ بدرجہ۔ منزل بہ منزل اوپر چڑھتے جاؤ گے لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (۸۴/۱۹) تا آنکہ وہ "روحِ خداوندی" جو تمہاری ذات میں "پھونکی گئی" تھی خدا کے قانونِ ربوبیت کی رو سے پوری نشوونما پا کر مشہود ہو جائے وَاَنَّ اِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَهٰی (۵۳/۴۲) یقیناً اس سلسلۂ ارتقاء کا منتہیٰ تیرے رب کی طرف ہے)۔ یہ ہیں نفسِ انسانی کے ارتقائی منازل اور یہ ہے اس کا مقصود و منتہیٰ۔

ایک اعتراض کہا جا سکتا ہے کہ اگر ایک انسان حیات بعد الممات کا قائل ہی نہیں تو وہ نفس کی تربیت اور مستقل اقدار کی پابندی کے متعلق کیوں پریشان ہو؟ لیکن سوال کسی کے قائل ہونے یا نہ ہونے کا نہیں۔ حیات بعد الممات ایک حقیقت ہے جو بہرحال واقعہ ہو کر رہتی ہے۔ کسی کا قائل ہونا یا نہ ہونا اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے قرآن کہتا ہے کہ حیاتِ اُخروی کے منکرین کی ہزار آرزوؤں کے باوجود کہ ہم دوبارہ

نہ اٹھائے جائیں اور مٹی میں مل کر ہمیشہ کے لئے مٹی ہی رہیں) انہیں دوبارہ اٹھایا جائے گا۔ تاکہ وہ اپنے اعمال کے نتائج و عواقب اور نفسِ انسانی پر ان کے اثرات کو اپنی آنکھوں سے بے نقاب دیکھ لیں۔ یَوْمَ یَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ یَدَاہُ وَ یَقُوْلُ الْکٰفِرُ یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرٰبًا (۷۸/۴۰) (اس وقت ہم حیات بعد الممات کے مسئلہ پر بحث نہیں کرنا چاہتے۔ یہ ایک جداگانہ مبحث ہے۔ اس وقت صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ اب مغرب کے مفکرین اور سائنسدان بھی حیات بعد الممات (Survival after death) حتیٰ کہ حیاتِ جاوداں (Immortality) کے قائل ہوتے جارہے ہیں اور اس کی تائید میں سائینٹفک ثبوت بہم پہنچارہے ہیں[2]) بہرحال یہ ہے مقصد نفسِ انسانی کی ربوبیت یا مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کا۔ اسی کا نام اوسپنسکی کی اصطلاح میں "مستقبل کا انسان" ہے مستقبل کے لئے عربی میں آخرۃ کا لفظ آتا ہے۔

یہیں سے ایک اور چیز بھی ہمارے سامنے آگئی۔ ایک شخص سنکھیا کھاتا ہے۔ اس کا اثر فوراً نمودار ہوجاتا ہے لیکن ایک شخص جھوٹ بولتا ہے تو اس کا کوئی اثر ہمارے سامنے نہیں آتا (اور اگر وہ جھوٹ بولنے کا عادی ہوچکا ہے تو وہ خود بھی اس کا اثر محسوس نہیں کرتا۔) قرآن کہتا ہے کہ جس طرح طبعی اشیا اپنے خواص و اثرات رکھتی ہیں اسی طرح مستقل اقدار بھی اپنے اثرات رکھتی ہیں۔ کائنات انفس ہو یا آفاق۔ قانون ہر جگہ ایک ہی کارفرما ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ طبیعی دنیا میں عمل کا نتیجہ جلدی اور محسوس شکل میں سامنے آجاتا ہے۔ لیکن معنوی دنیا (انسان کے اندر کی دنیا) میں اعمال کے نتائج دیر میں مرتب ہوتے ہیں۔ اور چونکہ نفسِ انسانی کی زندگی اسی دنیا تک نہیں رہتی آگے چلتی ہے

---

[1] "اٹھائے جانے" اور اعمالِ انسانی کے اثرات مرتب ہونے کی تفاصیل کا یہ موقع نہیں۔ اسے میں اپنی کتاب "معارف القرآن" کی آخری جلد میں بیان کروں گا۔ واللہ المستعان۔

[2] اس باب میں گرجیف، اوسپنسکی، اوربارو وغیرہ کے کچھ اقتباسات پہلے دیئے جاچکے ہیں۔ جو حضرات اس مسئلہ میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہوں (اور وہ میری کتاب معارف القرآن کی آخری جلد کی اشاعت کا انتظار نہ کرسکتے ہوں) ان کے لئے سردست حسب ذیل کتابوں کا مطالعہ مفید رہے گا:

Immortality - Keyserling ; Immortality - Sir James Marchael; A Seientific Demonstration Of Future Life - Hudson; The New Immortality (and) Nothing Dies In The World by J. W. Dunne

اس لئے جن اعمال کے نتائج یہاں ظہور پذیر نہیں ہوتے وہ اس زندگی کے بعد ظہور میں آجاتے ہیں۔ پھر جس طرح ایک فرد کی زندگی پر مستقل اقدار اثر انداز ہوتی ہیں اسی طرح قوموں کی زندگی بھی ان ہی کے تابع آگے چلتی ہے۔ قوموں کی زندگی میں یہ اثرات صدیوں کے بعد جاکر مشہود شکل میں سامنے آتے ہیں۔ ظہور نتائج کے اس طریق عمل (Process) کو ایک فرد اپنی زندگی میں محسوس نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے تاریخ کا مطالعہ ضروری ہے۔ اسی لئے قرآن تاریخی شواہد کے مطالعہ پر بہت زور دیتا ہے۔ لہذا، قوانین طبعی کے ماتحت ظہور نتائج جلدی عمل میں آجاتا ہے۔ لیکن مستقل اقدار کے ماتحت نتائج کے مشہود شکل میں سامنے آنے میں دیر لگ جاتی ہے۔ عربی زبان میں قریب کے لئے دنیا کا لفظ آتا ہے (دنی۔ ادنیٰ۔ دنیا) اور بعید کے لئے آخرت کا (اُخر۔ اخرٰی) ان دونوں لفظوں کے مفہوم کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کیونکہ آگے چل کر اس سے اہم نکات مرتب ہوں گے۔

خلاصہ بحث

یہاں تک ہم نے دیکھ لیا کہ قرآنی نظریہ حیات کی رُو سے

(i) انسان صرف جسم تک محدود نہیں۔ جسم کے علاوہ اس میں ایک اور چیز بھی ہے جسے نفس یا ذات یا انا یا خودی کہتے ہیں۔

(ii) انسان کا جسم موت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے لیکن نفس انسانی اس کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔

(iii) دنیا میں طبعی قوانین کے علاوہ کچھ اور اصول بھی ہیں جنہیں مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔ یہ اقدار غیر متبدل ہوتی ہیں۔ اور عقل کے فیصلوں کے ساتھ بدلتی نہیں رہتیں۔

(iv) جس طرح انسانی جسم کی پرورش (ربوبیت اور نشوونما) ہوتی ہے اسی طرح نفسِ انسانی کی بھی نشوونما (ربوبیت) ہوتی ہے۔

(v) انسانی جسم کی پرورش، عقلِ انسانی کے سطحی تقاضوں کے ماتحت ہوتی ہے۔ لیکن نفسِ انسانی کی پرورش (نشوونما) مستقل اقدار کے ماتحت ہوتی ہے۔

(vi) طبعی قوانین کے نتائج جلدی اور محسوس شکل میں سامنے آجاتے ہیں۔ لیکن مستقل اقدار کے نتائج دیر میں مرتب ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ نتائج موت کے بعد ظہور میں آئیں۔ اور اقوام کی صورت میں صدیوں کے بعد۔

(vii) عربی زبان میں دنیا کے معنی قریب کے ہیں اور آخرت کے معنی بعید یا مستقبل کے۔

یہاں ایک اور اہم سوال پیدا ہوتا ہے جسے سامنے لانا نہایت ضروری ہے۔ کہا یہ جائے گا کہ "روحانیین" بھی تو یہی کہتے ہیں کہ انسانی زندگی کا مقصود و منتہیٰ "تزکیہ نفس" ہے۔ پھر اُن کے اس عقیدے اور قرآنی مسلک میں فرق کیا ہے؟ ان دونوں میں بنیادی فرق ہے۔ ایک فرق تو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں یعنی 'روحانیین' کے نزدیک "تزکیہ نفس" سے مراد ہے انسانی ذات یا جداگانہ تشخص کی فنا۔ اس کا ذاتِ خداوندی میں مدغم ہو جانا۔ اس کے برعکس قرآنی تزکیہ نفس (ذاتِ انسانی کی نشو و نما) سے مقصود ہے اثباتِ ذات۔ اس کے جداگانہ تشخص کا استحکام اور بقا۔ لیکن اس سے زیادہ اہم دوسرا فرق ہے جسے نمایاں طور پر سامنے رکھنا چاہیئے۔ "روحانیین" کے نزدیک "تزکیہ نفس" کی صورت ترکِ دنیا ہے۔ ہر آرزو کی فنا۔ ہر خواہش کا کچل دینا۔ اس عقیدے کا نتیجہ وہ ذلت و خواری اور بے کسی و بے بسی کی زندگی ہے جس میں (مسلمانوں سمیت) دنیا کی وہ تمام قومیں مبتلا رہی ہیں اور آج بھی ہیں جن پر یہ "افلاطونی طلسم" مذہب بن کر سوار ہو گیا اور جو ان کے تمام قوائے عملیہ کو مفلوج کر کے تباہ کر گیا۔ اس کے برعکس، قرآن کی رو سے تزکیہ نفس (انسانی ذات کی نشو و نما) کا طریقہ یہ ہے کہ انسان، تمام کائنات کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں تمام نوعِ انسانی کی ربوبیت کے لئے عام کر دے۔ اس کا نام ہے نظامِ ربوبیت جس کی تفصیل آئندہ اوراق میں آپ کے سامنے آئے گی۔

ہم نے دیکھا ہے کہ قرآن کی رُو سے مستقل اقدار وہ ہیں جنہیں صفاتِ خداوندی یا اسماء الحسنیٰ کہا جاتا ہے۔ یہ اسماء متعدد ہیں۔ اس لئے وہ مستقل اقدار بھی جن کی رو سے انسانی ذات کی نشو و نما ہوتی ہے متعدد ہیں۔ لیکن ان سب میں ایک قدر ایسی ہے جو اس عمارت کے لئے سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی قدر کے گرد باقی تمام اقدار گردش کرتی ہیں۔ قرآن کی ابتدا اسی قدر سے ہوتی ہے۔ یہ قدر ہے ربّ العالمین یعنی تمام کائنات کی ربوبیت۔ قرآن کی سب سے پہلی آیت ہے۔

صفتِ ربّ العالمین	اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ یعنی ہر قسم کی تعریف و ستائش کا سزاوار ہے

وہ خدا جو تمام کائنات کی ربوبیت کا ذمہ دار ہے۔ جب خدا کی یہی صفت انسانوں کی دنیا میں آئے گی تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ انسانی ذات اسی صورت میں محمود (قابلِ حمد و ستائش) قرار پائے گی جب وہ خدا کی صفتِ ربّ العالمین کی مظہر ہو گی۔ یعنی جب وہ تمام نوعِ انسانی کی نشو و نما کا ذریعہ بنے گی۔ لہٰذا، انسانی ذات کی نشو و نما کا راز نوعِ انسانی (humanity) کی ربوبیت (نشو و نما) میں ہے۔ جسم کی پرورش کے لئے عقل کا تقاضا یہ تھا کہ ہر فرد اپنی اپنی پرورش اور اپنے اپنے مفاد کا تحفظ کرے۔ اسے دوسرے کے مفاد سے کچھ غرض نہ ہو۔ لیکن انسانی ذات کی ربوبیت کے لئے مستقل اقدار کا تقاضا یہ ہے کہ ہر فرد دوسروں کی ربوبیت کی فکر کرے اور ہمیشہ دوسرے کو اپنے آپ پر ترجیح دے۔ جس خدا نے جسمانی پرورش کے لئے وہ قانون بنایا ہے، اسی نے انسانی ذات کی پرورش کے لئے یہ قانون بنایا ہے۔ راشڈل کے الفاظ میں، انسانی دنیا میں مثالی معاشرہ (Ideal Society) وہ ہوگا جس میں کیفیت یہ ہو کہ

> میں کسی دوسرے کی نشو و نما کی فکر کروں اور اسی میں اپنا مفاد اور خیر سمجھوں۔ اور اسی طرح وہ میری نشو و نما کی فکر کرے اور اسی میں اپنا مفاد اور خیر سمجھے۔

(The Theory of Good And Evil - Vol. II)

یہ ترجمہ ہے قرآن کی اس آیت کا جس میں کہا گیا ہے کہ قرآنی معاشرہ میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ[1] (۵۹/۹)

لوگ دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں۔ خواہ خود تنگی ہی میں کیوں نہ رہیں۔

قرآن نے اس تصورِ حیات کو آج سے چودہ سو سال پہلے بیان کیا تھا لیکن دیکھئے کہ دورِ حاضر کے مفکرین، انسانی تاریخ کے مشاہدات۔ نفسِ انسانی کے احساسات و مدرکات کے مطالعہ۔ اور اپنے دور کے عمرانی اور تمدنی تقاضوں کے اثرات سے کس طرح اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔

مفکرینِ عالم کی آراء

انسانی تہذیب کا نامور مورخ (Briffault) اپنی شہرۂ آفاق کتاب (The Making Of Humanity) میں لکھتا ہے:

---

[1] ان آیات کی تشریح آگے چل کر بیان کی جائے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی ساخت کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ ایک فرد کی نشوونما ہو ہی نہیں سکتی جب تک پوری نوعِ انسانی کی نشوونما نہ ہو۔ فرد کی نشوونما پوری انسانیت کی نشوونما کے تناسب سے ہوتی ہے۔

دوسرے مقام پر لکھتا ہے:۔

انسان کی ارتقار کا حقیقی مفہوم "ہی تعمیر انسانیت" ہے۔ یہ ایک ایسی ٹھوس حقیقت ہے جس کی صحیح تعبیر "اخلاقی قانون" کی اصطلاح سے نہیں ہوسکتی۔ اسے اخلاقی قانون نہیں کہا جاسکتا (یہ اس سے بہت اونچی چیز ہے) یہ تو خود انسان کی اپنی ذات کی نشوونما کی لاینفک شرط اور غیر متبدل ضرورت کا نام ہے۔ (صفحہ ۲۶۱)

یعنی دنیا میں جس قدر رب العالمین (تمام نوعِ انسانی کی نشوونما) کی قدر مشہود ہوتی جائے گی، اسی نسبت سے افراد کی اپنی نشوونما ہوتی جائے گی۔ اس کے برعکس یہ ہو نہیں سکتا کہ کوئی فرد نوعِ انسان سے الگ تھلگ رہ کر اپنی نشوونما کر سکے (Mumford) کے الفاظ میں

فرد کو اپنی ذات کی تکمیل کے لئے ایک عالمگیر معاشرہ کی ضرورت ہے۔

(The Conduot Of Life)

راشڈل اس باب میں لکھتا ہے۔

مثالی معاشرہ اس کیفیت کا نام ہے جس میں ہر فرد معاشرہ کی بہبود کے لئے وہی کچھ کرے جو معاشرہ اس فرد کی بہبود کے لئے کرتا ہے۔ اس طرح ان مقاصد کی مملکت کا قیام عمل میں آتا ہے جو کانٹ کے نظریہ کے ماتحت نوعِ انسانی کے بلند ترین مقاصد ہیں۔

حال ہی میں مجلسِ اقوام متحدہ (U.N.O.) کے ثقافتی شعبہ (U.N.E.S.C.O) نے ماہرینِ علوم وفنون کی ایک تحقیقاتی کمیٹی بٹھائی تھی تاکہ وہ غور کرے کہ انسانی نشوونما کے اصول کیا ہیں۔ اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ

انسان پیدائشی طور پر باہمی تعاون کا جذبہ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اور جب تک اس کے اس جذبے کی تسکین نہ ہو، افراد اور اقوام دونوں مریض ہو جاتے ہیں۔ انسان ایسا مدنی الطبع واقع ہوا ہے کہ اس کی کامل نشوونما مختلف افراد کے باہمی ربط وضبط ہی سے ممکن ہے۔ اگر افراد کے اس باہمی عمرانی رابطہ کو کسی وقت بھی

نظر انداز کر دیا جائے تو اس سے انتشار واقع ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے ہر انسان اپنے بھائی کا پاسبان (Keeper) ہے۔ ہر فرد ایک کل کا جزو ہے۔ اس لئے ہر فرد انسانیت کی چادر میں لپٹا ہوا ہے

بریفالٹ (Briffault) دوسری جگہ لکھتا ہے :۔

فطرت کی میزان میں وہی عمل خیر ہے جو نوعِ انسانی کی ربوبیت میں مدد کر رہا ہے، اور وہ عمل شر ہے جو اس ربوبیت کی راہ میں مزاحم ہوتا ہے۔ اُسی فرد کی زندگی قابلِ ستائش ہے جو ربوبیت کے صراطِ مستقیم پر چلنے والے کارواں کے ساتھ ہو۔ جو زندگی اس راہ سے ہٹی ہوئی ہوتی ہے، بیکار ہوتی ہے۔ اور جو اس رستے میں روڑا بن کر مزاحمت کرتی ہے وہ بدترین زندگی ہے۔ اخلاقی اقدار کی یہی فطری۔ مطلق اور حقیقی میزان ہے۔ فطرت اس مقدس ولی کی زندگی کو پر کاہ جتنی اہمیت بھی نہیں دیتی جو نوعِ انسانی کی ربوبیت کے لئے کچھ نہیں کرتا۔ اس کی زہد و عبادت کی پوری کی پوری زندگی اس شخص کے ایک عمل جتنی بھی قیمت نہیں رکھتی جو انسانیت کی نشو و نما میں ممد و مددگار ہو۔ فطرت درحقیقت ایسے زاہد و عابد کے اعمال تولنے کے لئے میزان ہی کھڑی نہیں کرتی (صفحہ ۲۵۲)

دوسری جگہ ہے :۔

اخلاق ایک حرفِ بے معنی بن کر رہ جاتا ہے اگر اس کا عملی نتیجہ نوعِ انسانی کی بہبود نہ ہو۔

اوسپنسکی لکھتا ہے کہ

اگر نوعِ انسان کا ارتقار نہیں ہوگا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حیاتِ خاص کا ارتقار رک جائے گا۔ اور اس طرح کائنات میں تخلیقی شعاع کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ اگر انسانیت کا ارتقار نہ ہو تو اس مقصد کے پیشِ نظر جس کے لئے اس کی تخلیق ہوئی تھی، ایسی انسانیت بیکار ہو جاتی ہے اور بے کار ہونے کا مطلب اس کی فنا ہے۔ اس طرح نوعِ انسانی کے سلسلۂ ارتقار کے رُک جانے کا نام نوعِ انسانی کی فنا ہوگا۔

(In Search Of The Miraculous)

وہائٹ ہیڈ کے نزدیک " زندگی کی تکمیل کا راز اپنی ذات سے ماورار مقاصد کے حصول میں ہوتا ہے۔

یعنی اپنی ذات سے آگے بڑھ کر نوع انسانی کی تکمیل میں

(Adventures Of Ideas)

کانٹ (KANT) نے جس اصول کو اخلاق کی بنیاد قرار دیا تھا وہ یہ تھا کہ

اس طرح کام کرو گویا تم اور تمام افراد انسانیت ذاتی قیمت کے اعتبار سے برابر ہو۔ تم ایک ایسے معاشرے کے فرد بن جاؤ جس میں ہر فرد دوسرے افراد کے مفاد کی قیمت اپنے مفاد کی قیمت کے برابر سمجھتا ہو۔

برگساں انسانی معاشرہ کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ اس کی اصطلاح میں ایک کا نام (— Closed Society -) ہے جس میں ہر فرد یا جماعت صرف مفاد خویش کو مدنظر رکھتی ہے۔ دوسرے معاشرہ کا نام (Open Society) ہے جس میں تمام نوع انسانی کی بہبودِ کلی کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔

(The Two Sources Of Religion And Morality)

ہمارے دور کا ایک اور مفکر (Huxley) تو اس مذہب کی تلاش میں ہے جو نوع انسانی کی ربوبیت کو انسانی زندگی کا نصب العین قرار دے۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب (Religion Without Revelation-) میں لکھتا ہے:—

میں سمجھتا ہوں کہ انسان کے تمام فرائض کو ان الفاظ میں سمٹایا جا سکتا ہے: "زندگی کی فراوانی اپنے لئے بھی اور اپنے ہمسایہ کے لئے بھی۔" میرا عقیدہ ہے کہ محنت اور مشقت کے بعد ہی سہی، انسان اس مقصد کو حاصل کرنے کے قابل ضرور ہے۔

جو مذہب اس مقصد کو اپنا مرکزی نقطہ قرار دے لے اور وسعتِ نگاہ کے ساتھ اس کی تبئین بھی کر دے یعنی یہ بتا دے کہ انسانی زندگی کی ممکنات کیا ہیں اور اس کی حدود کیا۔ وہی مذہب ایک سچا مذہب ہو سکتا ہے۔ ص ۱۷۳

لے (K.R.Popper) نے (The open Societies And its enemies) کے عنوان سے دو جلدوں میں نہایت عمدہ کتاب لکھی ہے۔ لیکن وہ اس میں جمہوریت اور آمریت سے بحث کرتا ہے۔ برگساں نے اس اصطلاح کو زیادہ وسیع مفہوم کے لئے وضع کیا تھا۔

کہ یہ مذہب زندگی کا مذہب ہوگا۔ یہ زندگی کو زیادہ کرنے کی حوصلہ افزائی کرے گا۔ اور جوں جوں زندگی بڑھے گی یہ خود بھی بڑھے گا۔

میتھن اس باب میں لکھتا ہے:

انسان کا ایک مقصد تو اپنی ذات کی نشوونما ہے۔ لیکن اس کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ دیگر افرادِ انسانیہ کی ذات کی نشوونما بھی زیادہ سے زیادہ حد تک ہو جائے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان پہلے مقصد کے حصول میں جذب ہو کر دوسرے مقصد کو نظرانداز کر دیتا ہے۔ ایسے شخص کو انفرادی طور پر نیک (Moral) کہنا چاہیئے تو کہیئے۔ لیکن انسانیت کے نقطۂ نگاہ سے یہ کبھی نیک نہیں کہلا سکتا۔ بلند ہستیاں وہ ہیں جو ان دونوں مقاصد کو باہم دگر مدغم کر دیں۔ (Creative Freedom)

ہم ذرا آگے چل کر بتائیں گے کہ قرآن کس طرح نوعِ انسانی کو ایک ناقابلِ تقسیم وحدت (Indivisible Unit) قرار دیکر اس کی نشوونما کو تمام انسانی جد و جہد کا منتہیٰ بتاتا ہے۔ اس وقت اتنا دیکھئے کہ ہمارے دور کے غیر مسلم مفکرین کس طرح اس "مذہب" کی تلاش میں سرگرداں ہیں جو نوعِ انسان کی ربوبیت کو اپنا مرکزی نقطہ قرار دے اور اس طرح افراد کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کا سامان بہم پہنچائے۔

بہرحال، قرآن نے یہ اصول بیان کیا ہے کہ انسانی ذات کی نشوونما کی صورت یہ ہے کہ ہر فرد دیگر افراد کی ربوبیت کی فکر میں رہے اور اس طرح پورے کے پورے معاشرے کی نشوونما ہوتی چلی جائے۔

قرآنی تصور لیکن اس اصولی نقطہ کو ذرا وضاحت سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک معاشرہ دس افراد پر مشتمل ہے۔ انفرادی مفاد کے تحفظ کے نظریئے کے مطابق، ان میں سے ہر فرد اپنے اپنے مفاد کے تحفظ کی فکر کرے گا۔ اس طرح مختلف افراد کے مفاد کا تزاحم (Clash of interests) ناگزیر ہوگا لیکن اگر ان میں سے ہر فرد کے پیشِ نظر طریقِ ربوبیت ہو تو ہر فرد دوسرے افراد کی نشوونما کی فکر کرے گا۔ اس طرح بظاہر ایسا معلوم ہوگا کہ ہر فرد دوسروں کے مفاد کی حفاظت تو کرتا ہے لیکن اس کے اپنے مفاد غیر محفوظ (Unprotected) رہ جاتے ہیں۔ ...... لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہوگا۔ اس معاشرہ میں ایک ایسا دائرہ (Cycle) قائم ہو جائے گا جس میں ہر فرد کے مفاد کا تحفظ از خود ہوتا چلا جائے گا۔ (اس کی عملی شکل کی آئندہ باب میں پیش

کی جائے گی)۔ البتہ تحفظِ مفاد کا یہ طریقہ بالواسطہ (Indirect) ہوگا (اس نقطہ کو ذرا اچھی طرح سمجھ لیجئے) جب ہر فرد اپنے مفاد کی حفاظت کرتا ہے تو وہ بلا واسطہ (Directly) اپنے مفاد حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن افرادِ معاشرہ میں ایک دائرہ (cycle) قائم کرکے مفاد کا تحفظ براہِ راست نہیں ہوتا۔ بالفاظِ دیگر، مفادِ خویش کے تحفظ میں ہر فرد اپنے مفاد کو اپنے سامنے، بالکل قریب، دیکھ لیتا ہے۔ لیکن مفادِ کلی کے طریق سے، اس کے مفاد کا تحفظ دور کے راستے سے (Indirectly) ہوتا ہے۔ آپ دیکھ چکے ہیں کہ دنیا کے معنی قریب کے ہیں اور آخرت کے معنی مستقبل یا بعید کے۔ لہٰذا تحفظِ مفاد کا وہ طریقہ جس میں ہر فرد اپنے پیشِ پا افتادہ، قریبی مفاد کا حصول چاہتا ہے، قرآن کی اصطلاح میں متاع الدنیا کہلاتا ہے۔ اور تحفظِ مفاد کا دوسرا طریق جس میں بہبودِ کلی سے افراد کے مفاد کا تحفظ ہوتا ہے، متاعِ آخرت کہلاتا ہے۔ (تفصیل اس اجمال کی آگے چل کر آئے گی)

دنیا اور آخرت کا ایک اور مفہوم

لہٰذا دنیا اور آخرت کی اصطلاحوں کے دونوں مفہوم ہمارے سامنے آ گئے۔ پہلا مفہوم دنیا کی زندگی کے معنی اسی جسم کی طبعی زندگی اور آخرت کی زندگی کے معنی مرنے کے بعد زندگی کا اگلا مرحلہ۔ دوسرا مفہوم دنیاوی زندگی یا متاع کے معنی ہر فرد کا اپنے اپنے مفاد کے تحفظ کا تصور۔ قریبی مفاد کا نظریہ، اور اس کے مقابلہ میں آخرت سے مراد، نوعِ انسانی کے مفادِ کلی کے راستے افراد کے مفاد کا تحفظ۔ یعنی مستقبل پر نگاہ رکھنا بہبودِ کلی کو نصب العین بنانا

دنیا اور آخرت کے اس مفہوم کو سمجھ لینے کے بعد یہ دیکھئے کہ آخرت کے مفاد کے تحفظ میں (یعنی نوعِ انسانی کی بہبود میں) کس طرح دنیاوی مفاد (افراد کے مفاد) کا تحفظ از خود ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ حقیقت بھی سمجھ میں آ جائے گی کہ اس طریق سے عقل کے وہ تقاضے بھی کس طرح پورے ہو جاتے ہیں جن کے لئے وہ اس قدر مضطرب و بیتاب رہتی ہے۔ عقل اس کے سوا اور کیا چاہتی ہے کہ اس فرد کے مفاد کا تحفظ ہو جائے جس کی وہ عقل ہے۔ آپ دیکھئے کہ قرآنی نظام کے ماتحت عقل کا یہ تقاضا کس حسن و خوبی سے پورا ہو جاتا ہے۔ اس طریق کار میں عقل کو سمجھانا صرف اس قدر ہوتا ہے کہ اس سے تمہارے مفاد پر کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ وہ ہر طرح سے محفوظ رہتے ہیں اور فردِ متعلقہ کے جن مفاد کی فکر میں تم اس طرح غلطاں و پیچاں رہتی ہو وہ کس طرح نہایت خوش اسلوبی سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ یعنی اس طریق سے اقبال کے الفاظ میں، کیا یہ جاتا ہے کہ "عقلِ خود بیں" کو "عقلِ جہاں بیں" بنا دیا جاتا ہے۔

اس تمام بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ عقلِ خود بیں کا تقاضا "لینا" (To Receive) ہوتا ہے۔

لیکن عقل جہاں بیں "لینے" کی بجائے "دینے" (To Give) (مَنْ اَعْطٰی) سے اپنے مفاد کا تحفظ کرتی ہے۔ اسی تبدیلی میں انسانی ذات کی نشوونما کا راز ہے۔ آئن سٹائن کے الفاظ میں یہی شرف و تکریم انسانیت کا صحیح معیار ہے

انسان کی قدر و قیمت کا معیار یہ ہے کہ وہ کس قدر "دیتا ہے"۔ نہ یہ کہ اس میں "لینے" کی استعداد کس قدر ہے۔

(Out of My Later Days)

(Bardyeav) نے اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

وہی صاحب قوت ہے جو "دیتا ہے"۔ جو دوسروں کی مدد کرتا ہے انسان کی مشکلات کو آسان کرتا ہے۔

(Slavery and Freedom)

بظاہر فرق صرف طریق کار میں ہے لیکن دیکھئے کہ طریق کار کے اس فرق سے کس طرح ساری دنیا کا نقشہ بدل جاتا ہے۔

اس سے دنیا بدل جاتی ہے

دنیا کے تمام فسادات کی جڑ "لینے" کا جذبہ ہے۔ یہ بھی میں لے لوں وہ بھی میں لے لوں۔ یہ کچھ بھی میرا ہو جائے۔ وہ کچھ بھی میرے پاس آ جائے۔ یہ بھی میری ملکیت ہو جائے وہ بھی میرے قبضے میں آ جائے۔ ہم چوری کیوں کرتے ہیں دوسرے کی چیز لینے کیلئے۔ ہم جھوٹ کیوں بولتے ہیں؟ جو چیز اپنی نہیں اسے اپنے قبضے میں رکھنے کیلئے بد دیانتی کیوں کرتے ہیں؟ اس کا جواب صرف یہ ہے کہ "بہت کچھ لینے کے لئے"۔ ہم دوسروں کے حقوق غصب کیوں کرتے ہیں؟ اس لئے کہ ان کا سب کچھ ہمارے پاس آ جائے۔ ہم حسد کیوں کرتے ہیں؟ اس لئے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے پاس وہ کچھ نہیں جو دوسروں کے پاس ہے۔ آپ نے غور کیا کہ "لینے کا جذبہ" کس طرح فساد انگیزیوں اور ہلاکت آفرینیوں کا موجب بنتا ہے۔ اگر آپ اس کی جگہ "دینے کا جذبہ" پیدا کر دیں تو یہ تمام فتنہ سامانیاں خیرسگالیوں میں بدل جائیں گی۔ کسی سے دشمنی اور عداوت، حسد اور کینہ، بغض اور منافرت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ نہ ہی کسی کو جھوٹ بولنے، چوری اور بد دیانتی کرنے اور سلب و نہب پر اترنے کی ضرورت ہوگی۔

آپ غور کیجئے کہ اگر کوئی ایسا معاشرہ (society) وجود میں آ جائے جس میں ہر فرد "دینے کے جذبہ" کو اپنا ایمان (یعنی زندگی کا نصب العین) قرار دے لے، تو اس معاشرے میں کس قدر

تبدیلیٔ قلب و نگاہ

امن و سکون اور سلامتی و عافیت ہوگی! اس میں زندگی کس قدر بڑھے، پھولے اور پھلے گی

اس میں کس قدر بالیدگی اور نشوونما آجائے گی۔ لیکن اس قسم کے معاشرے کی تشکیل کے لئے بنیادی ضرورت نگاہ کی اس تبدیلی کی ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے یعنی "لینے" کی بجائے "دینے" کو نصب العین بنا لینے کی تبدیلی (Leslie Paul) کے الفاظ میں۔

یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ حضرت انسان اپنا تعلق مستقل اقدار کے سرچشمہ یعنی خدا سے قائم کرے۔ اور پھر اسی تعلق کی نسبت سے معاشرہ کا جائزہ لیتا رہے

(The Meaning of Human Existance)

(Brightman) اس قسم کے معاشرہ کے متعلق کہتا ہے:

یہ معاشرہ ان آزاد لوگوں پر مشتمل ہوگا جو ایک معقول، قابل قدر واحد نصب العین کے حصول کے لئے باہمی تعاون و تناصر سے کام لیں۔ وہ نصب العین جس کی بنیادیں خدا کے ایمان پر مستحکم ہوں۔

(A Philosophy of Religion)

قلب و نگاہ کی اس تبدیلی کے بغیر ایسے معاشرے کا قیام ناممکن ہے۔ قرآن کی رو سے یہ تبدیلی کس طرح پیدا کی جا سکتی ہے۔ اس کی تفصیل آئندہ باب میں سامنے آئے گی۔ اس وقت اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ قرآن اس طریق کار کو اقامت صلوٰۃ کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی وہ طریق عمل جس سے انسان (فرد اور معاشرہ) خدا کے قانون کے پیچھے پیچھے جا رہا ہو (مصلّی اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو ریس میں اول نمبر کے گھوڑے کے بالکل ساتھ ساتھ پیچھے جا رہا ہو) اس معاشرے کا عملی نتیجہ (یعنی اس شجر طیب کا پھل) یہ ہوتا ہے کہ اس میں ہر فرد دوسرے افراد کی نشوونما کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ اسے ایتاء زکوٰۃ کہا گیا ہے (سامان نشوونما دینا) لہٰذا قرآن کی ساری تعلیم کا ماحصل ہے "اقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ" آپ دیکھئے، قرآن میں ان الفاظ کو کتنی بار دہرایا گیا ہے۔ یہ ہے وہ معاشرہ جس میں نوعِ انسانی وہ کچھ بن جاتی ہے جو کچھ بننے کے لئے اسے پیدا کیا گیا ہے۔ یعنی خارجی کائنات میں ہر شے فطرت کے قوانین کے تابع، بلا اختیار و ارادہ، اپنی صلاحیتوں کی حدود (تقدیر) کے مطابق اپنی تکمیل تک جا پہنچتی ہے۔ لیکن انسانوں کی دنیا میں یہی کچھ انسانوں کے اختیار و ارادہ سے عمل میں آتا ہے۔ برگسان کے الفاظ میں:

زندگی کی تمام تگ و تاز کا مفہوم نوعِ انسان کی تخلیق کی تکمیل ہے یعنی انسانیت (Humanity) کو وہ کچھ بنا دینا

جو کچھ فی الفور بن جاتی اگر اسے انسانوں کی مدد کے بغیر اپنی آخری شکل اختیار کر لینے کا اختیار ہوتا۔
(The Two Sources Of Morality And Religion)

خلاصۂ مبحث اب ہم اس مقام تک آ پہنچے ہیں جہاں زندگی کے دونوں نظریے واضح اور بیّن طور پر ہمارے سامنے آ گئے ہیں۔

پہلا نظریہ یہ کہ انسانی زندگی بس اسی جسم کی زندگی ہے۔ اس لئے انسانی تگ و تاز کا مقصد جسم انسانی کی پرورش ہے۔ اس کے لئے ہر فرد اپنے اپنے مفاد کے تحفظ میں غلطاں و پیچاں رہتا ہے۔ اور کسی کو دوسرے کے مفاد سے کچھ غرض نہیں ہوتی۔ عقل کا فریضہ انفرادی مفاد کا تحفظ ہے۔ اس فریضہ کی سر انجام دہی کے لئے نہ کسی اصول کی پرواہ ہوتی ہے نہ ضابطہ سے واسطہ۔ چونکہ اس نظریہ میں انسان کی نگاہ ہمیشہ قریبی، پیش پا افتادہ، عاجلہ مفاد پر رہتی ہے اس لئے قرآن کی اصطلاح میں اسے حیٰوۃ الدنیا (قریبی مفاد کی زندگی) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

دوسرا نظریہ —— یہ کہ انسان کے جسم کے ساتھ ساتھ انسانی ذات کی پرورش و تربیت بھی ضروری ہے۔ اس سے انسان کو حیات جاودانی مل جاتی ہے۔ اس تربیت (ربوبیت) کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنی کوششوں کو مستقل اقدار کے تابع رکھے۔ ان میں سے بنیادی مستقل قدر یہ ہے کہ انسان "لینے" کی بجائے "دینا" سیکھے۔ یعنی ہر فرد دوسرے فرد کی ربوبیت کا سامان بہم پہنچانے کی فکر کرے۔ اور اس طرح پوری کی پوری نوعِ انسانی کی بہبود کو مطمعِ نگاہ بنائے۔ چونکہ اس نظریہ میں انسان کی نگاہ مفادِ عاجلہ کی بجائے مستقبل پر رہتی ہے، اس لئے قرآن کی اصطلاح میں اسے حیاتِ آخرت (مستقبل کی زندگی کے مفاد) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یاد رہے کہ آخرت (مستقبل) سے مراد صرف مرنے کے بعد کی زندگی نہیں۔ بلکہ اس سے مقصود، اس دنیا میں، انفرادی مفاد (مفادِ عاجلہ) کی بجائے نوعِ انسانی کے کلی مفاد پر نگاہ رکھنا بھی ہے اسی سے انسان کو مفادِ عاجلہ بھی حاصل ہو جاتے ہیں اور مستقبل کے مفاد بھی۔ یعنی اس کا حال بھی خوشگوار ہوتا ہے اور مستقبل بھی (مستقبل میں موجودہ نسلوں کے بعد آنے والی نسلیں بھی شامل ہوتی ہیں اور اس زندگی کے بعد آنے والی زندگی بھی)۔

حیات الدنیا اور حیاتِ آخرت کی ان دو بنیادی اصطلاحوں کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔ کیونکہ قرآنی نظامِ ربوبیت کی تمام گردش انہی منفی (Negative) اور مثبت (Positive) محوروں (Axes)

کے گرد گھومتی ہیں۔ جب تک ان اصطلاحات کا صحیح مفہوم سامنے نہیں آئے گا قرآن کے وہ مقامات سمجھ میں نہیں آسکیں گے جن میں نظام ربوبیت سے بحث کی گئی ہے۔

چند قرآنی اصطلاحات ہمارا خیال ہے کہ ان دو بنیادی اصطلاحوں کے علاوہ کچھ اور اصطلاحات کا صحیح مفہوم بھی سامنے رکھ لینا چاہیئے جنہیں قرآن اپنے نظام ربوبیت کے ضمن میں استعمال کرتا ہے۔ مثلاً

(۱) رب - خدا کا قانونِ ربوبیت جو تمام کائنات میں جاری و ساری ہے۔

(۲) ربوبیت - کسی شے کا کامل نشوونما پا کر اپنی تکمیل تک پہنچ جانا یعنی اس کی مضمر صلاحیتوں کا پورے طور پر نشوونما پا جانا

(Fullest Development of its latent faculties

(۳) حق - کسی عمل کا تعمیری (constructive) پہلو جو ٹھوس نتائج کی شکل میں سامنے آجائے اور اپنی جگہ پر اٹل رہے۔

(۴) باطل کسی عمل کا تخریبی (Destructive) پہلو جو منفی نتائج پیدا کرے

(۵) ارض - انسان کی معاشی زندگی - وسائلِ پیداوار

(۶) سماء - خدا کا کائناتی قانون جو از خود جاری و ساری ہے

(۷) طیبات - زندگی کی خوشگواریاں

(۸) فضل - معاشی سہولتیں - رزق کی فراوانی

(۹) حسنات - (اعمالِ حسنہ) انسانی ذات اور معاشرہ میں ٹھیک ٹھیک تناسب قائم رکھنے والا پروگرام۔

(۱۰) سیئات - (اعمالِ سیئہ) انسانی ذات اور معاشرہ کا توازن بگاڑنے والا پروگرام۔

(۱۱) اعمالِ صالحہ - انسانی ذات اور معاشرہ میں ہمواریاں پیدا کرنے والا پروگرام۔ وہ اعمال جو انسان کی صلاحیتوں کو ابھار کر نشوونما دیں۔

(۱۲) فساد۔ وہ پروگرام جو انسانی ذات اور معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کر دے۔

(۱۳) عدل ہر شے کو اس کی صحیح حالتِ اعتدال پر رکھنا اور اس میں کمی بیشی نہ ہونے دینا۔

(۱۴) احسان۔ جہاں کسی فرد یا معاشرہ کی کسی قوت میں کوئی کمی (Deficiency) آ جائے اسے پورا کر کے معاشرے کے توازن کو قائم رکھنا۔

(۱۵) تقویٰ۔ معاشی پروگرام کو مستقل اقدار (قانونِ خداوندی) کے ساتھ ہم آہنگ رکھنا اور اس طرح فرد اور معاشرہ کو خوف اور حزن سے محفوظ کر لینا۔

(۱۶) اقامت الصلوٰۃ معاشرہ کو ان بنیادوں پر قائم کرنا جن پر ربوبیتِ نوعِ انسانی (ربّ العالمین) کی عمارت استوار ہوتی جائے۔ قلب و نظر کا وہ انقلاب جو اس معاشرہ کی روح ہے۔[1]

(۱۷) ایتاءِ زکوٰۃ۔ نوعِ انسانی کی نشو و نما کا سامان بہم پہنچانا (تزکیہ کے معنی ہیں نشو و نما۔ بالیدگی)۔

(۱۸) فی سبیل اللہ نوعِ انسانی کی ربوبیت کے حصول کی راہیں۔

(۱۹) انفاق ایسا نظام جس میں ایک طرف سے افراد کی محنت کا ماحصل آتا جائے اور دوسری طرف سے مفادِ عامہ کے لئے نکلتا جائے۔ (نفق۔ ایسا رستہ جو دونوں طرف سے کھلا ہو۔ روپیہ ڈالنے کی ہمیانی جس کے دونوں منہ کھلے ہوں۔ جیسے پاجامہ کا نیفہ جو دراصل نیفق ہے۔)

برگسان کے الفاظ میں (Open Society) عام فہم الفاظ میں، انسانی کمائی کا مفادِ عامہ کے لئے کھلا رہنا۔

(۲۰) بخل۔ انفاق کے مقابلہ میں، اجتماعی مفاد کے بجائے انفرادی مفاد کا نظریہ۔ روپے کو تھیلی میں ڈال کر اوپر سے اس کا منہ بند کر دینا۔ (جَمَعَ فَاَوعٰی)

برگسان کی اصطلاح میں (Closed Society) عام فہم الفاظ میں اپنی کمائی کو اپنے مفاد

---

[1] وہ اجتماعات جو اس مقصد کے لئے منعقد کئے جاتے ہیں۔ (اور جنہیں موقت نریضہ نماز کہا جاتا ہے) ان کے لئے بھی قرآن نے یہی لفظ (الصلوٰۃ) استعمال کیا ہے۔ وہ بھی اقامتِ صلوٰۃ میں شامل ہیں۔ [2] منافق کو اس لئے منافق کہتے ہیں کہ وہ کسی نظام کے اندر داخل ہونے سے پہلے یہ دیکھتا ہے کہ اس سے باہر نکلنے کا رستہ کونسا ہے اور داخل ہی اس وقت ہوتا ہے جب اسے نکلنے کی راہ نظر آ جائے۔

کی خاطر سمیٹ کر رکھ لینا۔

(۲۱) رَبّانِیّون - نظامِ ربوبیت کی حامل جماعت

(۲۲) ایمان بالغیب - خدا کے نظامِ ربوبیت کے ان دیکھے نتائج پر یقین رکھنا۔

باب پنجم

قرآنی نظامِ رُبوبیّت

گذشتہ باب میں بحث کا زیادہ حصہ نفسِ انسان سے متعلق تھا۔ اس لئے گفتگو بیشتر تجریدی (Abstract) ہو گئی تھی۔ چونکہ تجریدی گفتگو میں عام طور پر کچھ الجھاؤ سا ہوا کرتا ہے اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آگے بڑھنے سے پہلے اصل موضوع کو ذرا کھلے کھلے الفاظ میں سامنے لے آیا جائے تاکہ ذہن میں کوئی الجھاؤ باقی نہ رہے۔

بات یہ ہے کہ انسان نام ہے جسم اور نفسِ انسانی کا (جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے) مقصدِ زندگی یہ ہے کہ انسان کے جسم کی پرورش بھی نہایت عمدگی سے ہو اور اس کے ساتھ ساتھ نفسِ انسانی کی ربوبیت (پرورش و تربیت) بھی ہوتی جائے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جسم کی پرورش کا اصول، اور انسانی ذات کی پرورش کا اصول ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں جسم کی پرورش کا اصول یہ ہے کہ جسم کو کچھ ملے۔ میرا جسم اسی صورت میں پرورش پا سکے گا جب میں خود کچھ کھاؤں۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ میں دوسروں کو کھلاؤں (خواہ یہ دوسرے میرے اپنے بیٹے ہی کیوں نہ ہوں) اور میرا جسم مضبوط ہوتا جائے۔ اپنے جسم کی پرورش اور توانائی کے لئے مجھے خود کھانا ہوگا۔ اس لئے جسم کی پرورش کا نظام یکسر انفرادی ہے میرا جزوِ بدن وہی چیز بنے گا جسے میں کھاؤں گا۔ جس چیز کو میں کسی دوسرے کو دیدوں گا اس سے میرے جسم کی پرورش نہیں ہو سکے گی۔ لہٰذا جسم کی پرورش کا اصول یہ ہے کہ تمہارا جسم کس قدر "لیتا" ہے۔ یہ وہ قانون ہے جسے کوئی بدل نہیں سکتا۔

لیکن انسانی ذات کی پرورش کا قانون اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس کا اصول یہ ہے کہ تم "دیتے" کس قدر ہو

تم کائنات کے حسن میں کس قدر اضافہ کرتے ہو۔ تم نوع انسان کی ربوبیت کے لئے کس قدر (Contribute) کرتے ہو۔ تم جتنا زیادہ دیتے جاؤ گے اتنی ہی زیادہ تمہاری ذات کی کشاد ہوتی جائے گی۔ اسی کا نام نفس انسانی کی پرورش و تربیت ہے۔

اب بات یوں ہوئی کہ

(i) انسان نام ہے جسم اور انسانی ذات کا۔

(ii) پرورش و تربیت دونوں کی ضروری ہے۔

(iii) لیکن جسم کی پرورش "لینے" سے ہوتی ہے۔ اور انسانی ذات کی پرورش "دینے" سے۔

(iv) یہ دونوں تقاضے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ہم "لیتے" ہیں تو ہماری ذات کی ربوبیت نہیں ہوتی اور "دیتے" ہیں تو جسم کی پرورش میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔

یہ ہے اصلی کشمکش۔ یہ ہے وہ پیچیدہ مسئلہ جس کا حل نہیں ملتا۔ انسانیت اسی مسئلہ کے حل میں سرگرداں چلی آرہی ہے اور افراط و تفریط کے جھولے جھول رہی ہے۔ ایک گروہ نے کہا کہ تم دیتے جاؤ "جسم کے تقاضوں کی پرواہ نہ کرو۔ جسم کو فنا ہونے دو کہ اس کی فنا میں تمہاری بقا کا راز ہے۔

یہ بھی غلط تھا۔ انسان نام ہے جسم اور ذات دونوں کا۔ دوسرے گروہ نے کہا کہ تم لئے جاؤ۔ سب کچھ اپنے لئے سمیٹے جاؤ۔ اس سے تمہارے جسم کی پرورش ہوگی۔ توانائی بڑھے گی۔ اور مقصود زندگی جسم کی پرورش و توانائی ہے۔ اور بس!

یہ بھی غلط۔ اس لئے کہ انسان جسم اور ذات دونوں پر مشتمل ہے۔ اس میں کسی ایک کو بھی نظر انداز (Neglect) کر دینا مقصد حیات میں ناکام رہنا ہے۔

ذہن انسانی اس سے آگے بڑھ نہیں سکا۔ وہ اس "کج دار و مریز" کی گتھی کو سلجھا نہیں سکا اس لئے اس کی اپنی ذات میں تضادات (Contradictions) پیدا ہو گئے اور ان تضادات کا لازمی نتیجہ تھا کہ معاشرہ میں تضادات پیدا ہو جائیں۔ معاشرہ کے یہی تضادات ہیں جنہیں قرآن نے فساد (یا ناہمواریاں) کہہ کر پکارا ہے۔

قرآن نے آکر بتایا کہ ان تضادات میں توافق پیدا ہو سکتا ہے یہ (Contradictione) آسانی سے Resolve ہو سکتے ہیں۔ ایسا نظام قائم کیا جا سکتا ہے جس میں جسم اور ذات دونوں کے (متضاد) تقاضے بیک وقت پورے ہوتے جائیں اور اس طرح یہ دونوں پرورش پاکر توانا ہوتے جائیں۔ اس نظام کا نام ہے نظامِ ربوبیت۔

اب آئیے یہ دیکھیں کہ قرآن اس نظام کی تفاصیل کیا بیان کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے آپ انسانی زندگی کے ان دو بنیادی نظریوں کو سامنے رکھئے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے (جیسا کہ پچھلے باب میں بتایا جا چکا ہے) قرآن نے اس نظریے کے لئے جس میں انسان کی نگاہ صرف جسم کی پرورش تک محدود رہتی ہے، حیٰوۃ الدنیا کی اصطلاح استعمال کی ہے جس کے معنی ہیں مفادِ خویش قریبی مفاد، پیش پا افتادہ مفاد" عاجلہ مفاد' ہی کو پیش نظر رکھنا۔ آئندہ صفحات میں اس نظریے کے لئے یہی اصطلاح استعمال کی جائیگی۔ اس کے برعکس، دوسرے نظریے کے لئے (جس میں جسم اور ذات دونوں کی پرورش در بوبیت مقصود ہوتی ہے) قرآن نے آخرت کی اصطلاح استعمال کی ہے جس سے مفہوم ہے حالی اور مستقبل دونوں کی خوشگواریاں چونکہ یہ خوشگواریاں صرف اس صورت میں حاصل ہوتی ہیں جبکہ (انفرادی مفاد کے بجائے) پوری کی پوری انسانیت کا مفادِ کلی پیش نظر رہے۔ اس لئے آئندہ صفحات میں اسے مفادِ کلی " یا اجتماعی مفاد " کی اصطلاح سے تعبیر کیا جائے گا

مفادِ خویش کی نظر سے انسان کی حالت

قرآن کہتا ہے کہ جب انسان کے سامنے "مفادِ خویش" کا نظریہ رہے تو اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ جمع کئے جاتا ہے لیکن اس کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا (جَمَعَ فَاَوْعٰی ۱۸/۷۰) سب کچھ سمیٹتا جاتا ہے اور پھر اسے تھیلی میں ڈال کر اوپر سے اس کا منہ بند کر دیتا ہے (اَوْعٰی) تاکہ جمع شدہ سرمایہ خرچ نہ ہونے پائے۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا (۱۹/۷۰)

یقیناً انسان بہت ہی بے صبرا ہے (هلوعًا۔ ہر وقت بھوکا رہے)

جس کی بھوک کبھی کم نہ ہو۔ وہ دولت کی محبت میں کھنچا چلا جاتا ہے وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ (۸/۱۰۰)

روپیہ جمع کرتا رہتا ہے۔ اور اسے گنتا رہتا ہے اور اس طرح ننانوے کے پھیر میں پڑ جاتا ہے۔ جَمَعَ مَالًا وَّ

عَدَّدَهٗ (۱۰۴/۲) سمجھتا ہے کہ یہی مال و دولت اسے حیات جاودانی عطا کر دے گا۔ یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ (۱۰۴/۳) اس کی نگاہ ہمیشہ مفادِ عاجلہ (Immediate gain) پر رہتی ہے كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ (۷۵/۲۰) اور مستقبل کی خوشگواریوں کو نظرانداز کر دیتا ہے وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ (۷۵/۲۱) مستقبل کی خوشگواریوں پر مفادِ عاجلہ کو ترجیح دیتا ہے بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا (۸۷/۱۶) چاہتا ہے کہ اپنا بھی سب کچھ پاس رہے اور اس کے علاوہ جو کچھ دوسروں نے جمع کر رکھا ہے اُن کے مرنے کے بعد وہ بھی اسی کے پاس آجائے وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا (۸۹/۱۹) (لَمّ کے معنی سمٹنے کے ہیں) اس کی نیت یہ ہوتی ہے کہ اِدھر اُدھر کا مال اس کے پاس اس طرح چلا آئے جیسے گرد و نواح کا تمام پانی نشیب زمین کی طرف آکر کسی گڑھے میں اکٹھا ہو جاتا ہے۔ وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا (۸۹/۲۰) یہ لوگ صرف ضرورت کے لئے مال جمع نہیں کرتے بلکہ اس ہوس کارانہ زندگی سے ان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ ان میں سے ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ مال و دولت میں بڑھ جائے۔ اور اس خواہش کی تسکین پوری ہی نہیں ہوتی حتیٰ کہ وہ قبر میں جا پہنچتا ہے۔

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (۱۰۲/۱-۲)

ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی خواہش جس کا سلسلہ قبر تک

جاری رہتا ہے تمہاری تباہی کا باعث بنتا ہے۔

اس معاشرہ میں ایک انسان دوسرے انسان سے اس طرح الگ ہو جاتا ہے جیسے ان میں کسی نے (wedges) ٹھونک دی ہوں (بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (۲/۳۶) عدیٰ، دو لکڑیوں کے درمیان (wedge) کو کہتے ہیں اسی سے عدو کے معنی ہیں ایسے لوگ جو ایک دوسرے سے الگ رہیں۔ ان میں ناہمواریاں ہوں۔ متعادی، ایسی ناہموار چیزوں کو کہتے ہیں جو آپس میں ملتی جلتی نہ ہوں) اس کے بعد ان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ بھائی بھائی سے الگ ہو جاتا ہے۔ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ (۸۰/۳۴) اولاد ماں باپ سے جدا ہو جاتی ہے (وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ (۸۰/۳۵) حتیٰ کہ میاں بیوی اور باپ بیٹے کے مفاد تک بھی ایک دوسرے سے متصادم ہو جاتے ہیں۔ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ (۸۰/۳۶) ہر شخص اپنے اپنے مفاد کے حصول اور تحفظ میں ایسا جذب ہوتا ہے کہ اسے دنیا و ما فیہا کی کوئی خبر نہیں رہتی لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ (۸۰/۳۷) اُن میں ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ وہ مشترکہ مفادِ انسانیت کی

بجائے اپنے اپنے مفاد کے حصول کے لئے الگ الگ پروگرام بنائے بَلْ يُرِيدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَن يُؤْتَىٰ صُحُفًا مُّنَشَّرَةً (۷۴/۵۲) اس نظریہ کے ماتحت جو کچھ افراد میں ہوتا ہے وہی کچھ اقوام میں ہوتا ہے۔ اس کی رُو سے ہر قوم کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ دوسری قوموں کو زندگی کی خوشگواریوں سے محروم کر دے۔

كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَّعَنَتْ أُخْتَهَا (۷/۳۸)

اس جہنمی زندگی میں ہر قوم دوسری قوم کو محروم کرنے کی فکر

میں ہوتی ہے (لعن کے معنی ہیں دور رکھنا۔ محروم کرنا۔)

اور اس طرح دوسری قوموں سے آگے بڑھ جائے۔ أَن تَكُونَ أُمَّةٌ هِيَ أَرْبَىٰ مِنْ أُمَّةٍ (۱۶/۹۲) اس کے بعد جس طرح ہر دولتمند یہ سمجھ لیتا ہے کہ مجھے اب دوسرے افراد انسانیہ کی پرواہ کیا ہے۔ میرا مال و دولت میرے لئے کافی ہے اسی طرح ہر قوم اپنے آپ کو خود مکتفی (Self-Sufficient) سمجھ کر خیال کر لیتی ہے کہ مجھے اب دوسروں کی کوئی احتیاج نہیں۔ اور اس طرح احترام و تکریم انسانیت کے تمام قواعد و ضوابط سے سرکشی اختیار کر لیتی ہے

كَلَّا إِنَّ الْإِنسَانَ لَيَطْغَىٰ أَن رَّآهُ اسْتَغْنَىٰ (۹۶/۶-۷)

جب انسان اپنے آپ کو مستغنی تصور کر لیتا ہے تو پھر آئین و ضوابط سے سرکشی اختیار کر لیتا ہے۔

غور کیجئے۔ کتنی بڑی ہے یہ حقیقت جسے قرآن نے دو جملوں میں سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ ایسا انسان سمجھتا ہے کہ میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا (أَيَحْسَبُ أَن لَّن يَقْدِرَ عَلَيْهِ أَحَدٌ (۹۰/۵))

اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ انسان معاشرہ کے عام قوانین و دستور کی بھی پرواہ نہیں کرتا اور ہمیشہ کوشش کرتا رہتا ہے کہ لوگوں سے زیادہ سے زیادہ لے اور انہیں کم سے کم دے۔ آپ اپنے معاشرے (کے کاروباری حلقہ) میں دیکھئے ہر جگہ یہی ذہنیت کارفرما نظر آئے گی۔ ہر شخص اسی گھات میں لگا رہتا ہے کہ کس طرح دوسرے کی جیب کا روپیہ اس کی جیب میں آ جائے اور اگر اسے دوسروں کی محنت کا معاوضہ (یا جنس کی قیمت) دینی پڑے تو کم از کم دے۔ یہی وہ ذہنیت ہے جس سے سارے معاشرے میں ناہمواریاں (فساد) برپا ہو جاتی ہیں۔ اور اسی سے وہ تباہیاں آتی ہیں جن میں آج دنیا اس طرح چاروں طرف سے گھری ہوئی ہے۔ قرآن اپنے دعاوی کی شہادت میں تاریخی نوشتوں کو پیش کرتا ہے۔ جس ذہنیت کا اوپر ذکر کیا گیا ہے وہ قوم شعیب کو اس کے ترجمان کی حیثیت سے

پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان کی اس ذہنیت کو مفادِ کلی (نظریۂ آخرت) میں بدلنے کے لیے حضرت شعیبؑ نے پوری کوشش فرمائی۔ انہوں نے اس قوم سے کہا کہ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ (۷/۸۵) تمہارے پاس خدا کا قانونِ ربوبیت واضح انداز میں آچکا ہے۔ اسے اپنی زندگی کا نصب العین بناؤ اور اپنی موجودہ روش کو چھوڑ دو

فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ (۷/۸۵)

تم اپنے ماپ اور تول کے پیمانوں کو ٹھیک رکھو۔

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ (۱۱/۸۵)

اور ایسا نہ کرو کہ لوگوں کو ان کی چیزیں کم دیا کرو۔

اس طرح معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ وَلَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا (۷/۸۵) اس کے برعکس اگر تم نے خدا کے قانونِ ربوبیت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا تو یہ تمہاری خوشگواریوں اور زندگی کے ہر شعبے میں فراوانیوں کا ضامن بن جائے گا۔ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۷/۸۵) تم تجارت کی شاہراہوں پر قابض ہو کر بیٹھ جاتے ہو اور پھر (عام قوانینِ عدل و انصاف کی رُو سے نہیں بلکہ) لوگوں کو طرح طرح سے مرعوب کر کے معاملات کی سیدھی سیدھی اور صحیح راہیں ان پر مسدود کر دیتے ہو اور انہیں ٹیڑھی راہوں پر چلنے کے لیے مجبور کر دیتے ہو (۷/۸۶) اس کا نتیجہ تباہی کے سوا اور کیا ہے (۷/۸۶)

سورۂ شعرا میں ہے کہ حضرت شعیبؑ نے ان سے کہا کہ اپنے ماپ تول میں ڈنڈی مت مارا کرو۔ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ (۲۶/۱۸۱) سورۂ عنکبوت میں ہے کہ حضرت شعیبؑ نے ان سے کہا کہ تم مفادِ عاجلہ سے صرفِ نظر کر کے مستقبل کے مفاد پر نگاہ رکھو وَارْجُوا الْيَوْمَ الْاٰخِرَ۔ (۲۹/۳۶) اور معاشرے میں ایسا نظام نہ پیدا کرو جس کا نتیجہ ناہمواریاں ہوں۔ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ (۲۹/۳۶)

قرآن کریم نے قومِ شعیب کو اس ذہنیت کے ترجمان کی حیثیت سے بطور تاریخی شہادت پیش کیا ہے ورنہ وہ کہتا ہے کہ "قریبی مفاد" کے نظریہ کے ماتحت تمام انسانوں کی حالت یہی ہو جاتی ہے کہ وہ سب کچھ اپنے ہی سمیٹنے کی فکر میں پریشان رہتے ہیں اور دوسروں کے مفاد کی قطعاً کچھ پرواہ نہیں کرتے وہ سامانِ نشوونما کو

۱؎ قوم کی طرف سے اس کا کیا جواب ملا تھا اس کا ذکر بعد میں آئے گا۔

اپنے لئے روک رکھتے ہیں (مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ ۵۰/۲۵) خدا کے جاری پانی کے آگے دیواریں کھڑی کر دیتے ہیں تاکہ کسی اور کی کھیتی سیراب نہ ہونے پائے (وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ ۱۰۷/۷) وہ انسانیت کی خاطر کچھ دینے کے لئے اول تو کچھ دینے پر آمادہ ہی نہیں ہوتے، اور اگر انہیں مجبوراً کچھ دینا پڑ ہی جائے تو بہت تھوڑا دیتے ہیں اور پھر اسی طرح اپنے ہاتھ کو سخت کر لیتے ہیں جس طرح پتھریلی زمین کسی روئیدگی کو باہر نہیں آنے دیتی (وَاَعْطٰى قَلِيْلًا وَّاَكْدٰى ۵۳/۳۴) اسی ذہنیت کو قرآن نے دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۸۳/۱ (تباہی اور بربادی ہے اس نظامِ معاشرہ کے لئے جس میں لوگوں کی کیفیت یہ ہو کہ ہر شخص یہ چاہے کہ تمام مفاد اسی کے قریب ہو جائیں اور دوسروں کو جتنا ہو سکے کم ملے (تطفیف) یہ وہ لوگ ہیں:

اَلَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ (۸۳/۲)

کہ جب دوسروں سے ماپ کر لیتے ہیں تو پورا لیتے ہیں۔

لیکن

وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ (۸۳/۳)

جب انہیں ماپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو ہمیشہ ڈنڈی مار لیتے ہیں۔

یہ تو پھر بھی وہ طبقہ ہے جو لیتا زیادہ ہے اور دیتا کم ہے۔ لیکن ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو دوسروں سے لیتا ہی لیتا ہے۔ انہیں دیتا کچھ نہیں۔ یہ وہ طبقہ ہے جو دوسروں کی کمائی پر عیش کرتے

مترفین کا طبقہ

ہیں۔ انہیں قرآن کی اصطلاح میں مترفین کہا جاتا ہے۔ (ترف کے معنی ہیں سامانِ زیست کی فراوانیوں کی بنا پر نہایت عیش و عشرت، سہل انگاری اور بیکاری کی زندگی بسر کرنا) یہ وہ لوگ ہیں جو دوسروں کی کمائی کھاتے رہتے ہیں اور خود کوئی ایسا کام نہیں کرتے جس سے معاشرہ میں تعمیری نتائج مرتب ہوں۔ یہ طبقہ بالخصوص مذہبی پیشواؤں پر مشتمل ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے کہ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ...... (۹/۳۴)

اے وہ جماعت جو خدا کے قانونِ ربوبیت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائے ہو، اس حقیقت کو سامنے

رکھ کر ارباب طریقت و شریعت کا گروہ کثیر وہ ہے جو لوگوں کی کمائی کھاتا ہے اور ہمیشہ تخریبی نتائج کا موجب بنتا ہے اور اس طرح معاشرہ کو مثبت نتائج پیدا کر کے آگے بڑھنے سے روکتا ہے۔

یہ وہ گروہ ہے جو ہمیشہ اس انقلاب کی مخالفت کرتا ہے جس میں خدا کی ربوبیت عام ہو۔ اس لئے کہ اس انقلاب میں انہیں اپنی موت نظر آتی ہے انہیں خود محنت کر کے کھانے کی عادت نہیں ہوتی اور نظامِ ربوبیت میں ہر اس شخص کو کام کرنا پڑتا ہے جو کام کے قابل ہو۔ اس میں کام چوروں اور مفت خوروں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ لہٰذا جہاں، اور جب بھی نظامِ ربوبیت کے قیام کی آواز بلند ہوتی ہے، اس طبقہ کی طرف سے ہمیشہ اس آواز کی مخالفت ہوتی ہے۔ وہ لوگوں کو یہ کہہ کر اُبھارتے ہیں کہ دیکھو! یہ نئی دعوت دینے والے تمہیں تمہارے آباؤ اجداد کے مسلک سے ہٹانا چاہتے ہیں۔ انقلاب اور اس کی مخالفت کے ضمن میں یہی شروع سے ہوتا رہا ہے اور یہی ہوتا رہے گا۔

وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ
اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ (۴۳/۲۳)

اسی طرح اس سے پہلے بھی جس قوم میں کوئی دعوتِ انقلاب نذر (منذر) لے کر آیا تو وہاں کے مترفین نے یہ کہہ کر اس آواز کی مخالفت کی کہ ہم نے جس مسلک پر اپنے آباؤ اجداد کو دیکھا ہے ہم اس کی پیروی کرتے جائیں گے

یہ مخالفت بدیہی ہے۔ دوسروں کی کمائی پر آرام طلبی کی زندگی بسر کرنے والے کب چاہتے ہیں کہ انہیں خود کما کر کھانا پڑے بلکہ ان کی محنت سے دوسروں کے لئے بھی سامانِ پرورش بہم پہنچایا جائے۔

یہ ہے قرآن کی رو سے "مفادِ خویش" (حیات الدنیا) کو اپنی زندگی کا نصب العین بنانے والوں کی کیفیت۔ ان کے سامنے ہمیشہ مفادِ عاجلہ رہتے ہیں اور مستقبل کی زندگی ان کی نگاہوں سے اوجھل رہتی ہے ان کی زندگی کی تمام تگ و تاز ان کی ساری کوششیں "مفادِ خویش" کے حصول میں ضائع ہو جاتی ہیں اور وہ بزعمِ خویش سمجھتے رہتے ہیں کہ وہ بہت بڑا کام کر رہے ہیں۔ حالانکہ نظامِ انسانیت کی میزان میں ان کی

کوششوں کا وزن پرکاہ کے برابر بھی نہیں ہوتا۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا - الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا - أُولٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهٖ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا

(۱۸ / ۱۰۳ — ۱۰۴ — ۱۰۵)

ان سے کہو کہ تمہیں ہم بتائیں کہ وہ کون لوگ ہیں جن کی تمام سعی وعمل کا نتیجہ نقصان کے سوا کچھ نہیں ہوگا؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کے تمام پروگرام قریبی مفادِ خویش کے حصول میں ضائع ہو جاتے ہیں اور وہ اپنے دل میں سمجھتے ہیں کہ ہم بہت بڑے تعمیری کام کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کے قانونِ ربوبیت سے انکار کرتے اور حقائق کا سامنا کرنے سے جی چراتے ہیں۔ سو ان کے پروگرام بظاہر بڑے خوش آئند نظر آتے ہیں لیکن ان کے ٹھوس نتائج کبھی بھی مرتب نہیں ہو سکتے[1]۔ قیامِ انسانیت کے پروگرام میں ان کے اعمال کا کوئی وزن نہیں ہوگا۔

اس قسم کے معاشرے کی تباہی کے اسباب وعلل تلاش کرنے کے لئے کسی خاص کاوش کی ضرورت نہیں۔ بات بالکل ظاہر ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہر فرد کی عقلِ بے باک کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس فرد کے مفاد کا تحفظ کرے۔ چونکہ انسان کو اپنی موت کے متعلق معلوم نہیں کہ وہ کب آئے گی، اس لئے وہ اپنی مفاد پرستی کی دوڑ میں کوئی آخری حد مقرر نہیں کر سکتا۔ اس کی عقل اسے ہر وقت غیر مصئونیت (Insecurity) کے خوف سے ڈراتی رہتی ہے اس لئے وہ قبر تک سمیٹنے کی فکر کرتا رہتا ہے۔ لہٰذا اس کے مفاد غیر محدود (Un-limited) ہوتے ہیں۔ لیکن اشیائے ضروریات ہمیشہ محدود (Limited) ہوتی ہیں۔ ہر انسان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ اشیائے ضروریات اس کے قبضے میں آجائیں۔ اس کے لئے افراد میں کشمکش ہوتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جب دو آدمیوں نے ایک گھوڑے پر بیٹھنا ہو تو ان میں سے ایک کو بہر حال پیچھے بیٹھنا ہوگا لیکن اگر دونوں کی خواہش اور کوشش یہ ہو کہ وہ آگے بیٹھیں تو اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ لہٰذا اس قسم کے معاشرے میں افراد کی باہمی کشمکش لازمی ہے

ایسے معاشرے کا حشر

[1] حبطت اعمالھم۔ جس مویشی کا سو ہضم کی وجہ سے پیٹ پھول جائے اور اس طرح وہ بڑا فربہ دکھائی دے لیکن اس کی غذا ہضم ہوئے بغیر خارج ہو جائے اسے حبط کہتے ہیں۔

افراد سے آگے بڑھ کر یہی حال اقوام کا ہے۔ جس طرح ہر فرد کی عقل اس کے مفاد کا تحفظ چاہتی اور زیادہ سے زیادہ سمیٹ لینے کی فکر کرتی ہے، اسی طرح قوم کی مجموعی عقل بھی یہی چاہتی ہے کہ وہ قوم زیادہ سے زیادہ وسائلِ پیداوار پر قابض ہو جائے۔ اس سے بین الاقوامی کشمکش شروع ہوتی ہے جس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کا وہ جہنم ہے جس میں آج ساری دنیا مبتلا ہے۔ جوڈ لکھتا ہے:

> جس معاشرے میں افراد کا منتہائے نگاہ قریبی مفاد کا حصول ہو، اس میں کبھی توازن اور استحکام پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ جب انسان کا مقصودِ حیات وہ چیزیں قرار پا جائیں جو دنیا میں اتنی افراط سے موجود نہیں تو اس کا نتیجہ لامحالہ یہ ہوگا کہ چند آدمیوں کے پاس بہت کچھ آ جائے گا اور باقی اس سے محروم رہ جائیں گے۔ یہ محروم رہنے والے لوگ ہمیشہ غیر مطمئن اور مضطرب رہیں گے۔ اس قسم کے غیر مطمئن افراد ہمیشہ معاشرے کی تباہی کا موجب بنتے ہیں۔ (Decadence)

باقی رہے مترفین۔ سو ان کے متعلق Briffault لکھتا ہے کہ

> کوئی معاشرہ صحت مند نہیں کہلا سکتا جس میں ایک فرد دوسرے کے خون سے فربہ ہو۔

"قریبی مفادِ خویش" کے نظریے کے حامل معاشرہ کی یہی حالت ہوتی ہے۔ اس معاشرے کے اہلِ فکر حضرات اس جہنم کی شعلہ سامانیوں سے گھبرا کر سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں کہ معلوم کریں کہ اس الم انگیز تباہی کے اسباب کیا ہیں۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ یہ اسباب اس قدر بدیہی اور نمایاں ہیں کہ ان کی دریافت کے لئے کسی تحقیقاتی کمیشن کی ضرورت ہی نہیں۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں کہتا ہے کہ جب ان کی یہ حالت ہوتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ خدا کی مرضی ہے اس نے ایسا کر دیا۔ وہ جسے چاہے عزت دیدے جسے چاہے ذلیل کر دے (فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ ‎۸۹/۱۶)، قرآن کہتا ہے کہ (كَلَّا ‎۸۹/۱۷) بالکل غلط۔ یہ ان کا فریبِ نفس ہے، جو حقیقت کو سامنے نہیں آنے دینا چاہتا۔ اور اپنی زندگی کی غلط روش کے نتائج کو خدا کی طرف منسوب کر کے اپنے آپ کو اطمینان دے لینا چاہتا ہے۔ ان کی یہ حالت اس لئے نہیں ہوئی کہ خدا نے خواہ مخواہ ایسا کر دیا۔ یہ اس لئے ہوتی ہے کہ انہوں نے معاشرہ ایسا بنا رکھا تھا جس میں کسی ایسے شخص کی عزت و تکریم نہیں ہوتی تھی جس کے متعلق سمجھ لیا جاتا تھا کہ وہ اکیلا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی پارٹی نہیں وہ بے یار و مددگار ہے۔ اس کا کوئی والی وارث نہیں۔ (كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ ‎۸۹/۱۷)

اور جس میں کوئی ایک دوسرے سے یہ نہیں کہتا تھا کہ جس شخص کی چلتی ہوئی گاڑی رک جائے۔ جس کی حرکت مبدل بہ سکون ہو جائے اس کے کھانے پینے کا بندوبست کرنا چاہیئے (وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ[1] (۸۹/۱۸) اس کے برعکس، ہر شخص چاہتا تھا کہ جو کچھ اُسے مردوں سے ہاتھ آئے سب کچھ سمیٹ کر رکھا جائے (۸۹/۱۹) اور ادھر اُدھر کا مال اکٹھا ہو کر اسی کے گھر پہنچ جائے (۸۹/۲۰)۔ اس معاشرہ کا انجام اگر جہنم کی تباہیاں نہ ہوتا تو اور کیا ہوتا؟ یہ آگ کہیں باہر سے نہیں آئی۔ وہی دولت جو انہوں نے جمع کر رکھی تھی، بند رہنے سے اس قدر گرم ہو گئی ہے کہ اس سے ان کے جسم کو داغا جا رہا ہے (۹/۳۵) یہ وہ آگ ہے جو انہوں نے بڑے بڑے لمبے چوڑے سہاروں اور بھروسوں کے ستونوں میں بند کر رکھی تھی۔ اب وہی آگ ان کے دلوں پر چڑھ رہی ہے (۱۰۴/۷)۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ لوگ درحقیقت انسانیت کی سطح تک پہنچے ہی نہیں تھے۔ اُن کی زندگی حیوانی سطح (Animal Level) پر ہی تھی جو کھاتے پیتے ہیں اور اس کے بعد طبعی موت سے مرجاتے ہیں۔ اور اس زندگی کا نتیجہ یہ جہنم ہے۔ (۴۷/۱۲)

کلّی مفادکا نظریہ اس کے برعکس دوسرا نظریۂ زندگی ہے جسے حیاتِ آخرت یا کلّی مفاد یا مستقبل کی خوشگواریوں کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اگر پہلا نظریہ بُخل (Arrested interests) کا ہے تو یہ دوسرا نظریہ انفاق Open Interests کا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خود لفظ انفاق جسے قرآن نے اس تکرار کے ساتھ اپنے ہاں استعمال کیا ہے۔ اس تصور کا صحیح صحیح مفہوم سامنے لے آتا ہے

---

[1] قرآن نے اس حقیقت کو متعدد مقامات پر دہرایا ہے۔ مثلاً دیکھئے (۶۹/۳۴ ; ۷۴/۴۴ ; ۱۰۷/۳ ; ۹۰/۱۴ ; ۱۰۷/۲) ان مقامات کے علاوہ اس نے سورہ والضحیٰ میں کہا ہے کہ فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ (۹۳/۹) جو معاشرہ میں اکیلا رہ جائے اسے استبداد سے ایسا کچلنے کی کوشش نہ کرو کہ وہ مجبور ہو کر ایسا نرم ہو جائے کہ تم سے نگل جاؤ (قھر کے معنی ہیں گوشت کو پکا پکا کر نرم کر دینا) اور اس کے بعد ہے وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ (۹۳/۱۰) اور ضرورتمند کے متعلق یہ نہ سمجھ کہ اس کا مقام وہ جگہ ہے جہاں کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا ہے (تَنْهَرْ) معاشرہ میں اسے اس کا صحیح مقام دو۔

جیسا کہ سابقہ باب میں لکھا جا چکا ہے۔ نفق کے معنی ہیں ایسی سرنگ جو دونوں طرف سے کھلی ہو۔ (برخلاف سرب کے جس میں صرف اندر داخل ہونے کا راستہ ہو آگے نکلنے کا راستہ نہ ہو) اسی لئے مُنتَفَق شلوار کے نیفے کو کہتے ہیں۔ جو راستہ دوسری طرف سے نکل جائے (یعنی طریق النافذ) اسے بھی نفق کہتے ہیں۔ منافق کو اسی لئے منافق کہتے ہیں کہ وہ دین میں ایک طرف سے داخل ہوتا ہے اور دوسری طرف سے نکل جاتا ہے۔ اسی طرح جو شے زیادہ رواج پذیر ہو جائے اسے بھی نفق سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور اشیائے نافقہ وہ چیزیں ہوتی ہیں جو عام طور پر ہر جگہ مل جائیں۔ انفق زیادہ فروخت ہونے والے مال کو کہتے ہیں اور نافق اس منڈی کو جس میں کاروبار عام ہو۔ انفاق کے معنی کسی چیز کا ختم کر دینا۔ (یعنی دوسری طرف سے باہر نکال دینا) ہے۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ انفاق کے معنی "کھلا رکھنے" یا "عام کرنے" کے ہیں۔ "انفاق" کا ترجمہ عام طور پر "خرچ کرنا" کیا جاتا ہے۔ لیکن آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس لفظ کے بنیادی معانی کی رو سے "خرچ کرنا" اس کے مفہوم کو صحیح طور پر ظاہر نہیں کرتا۔ "انفاق فی سبیل اللہ" کا صحیح ترجمہ ہونا چاہیئے "مفادِ عامہ کے لئے کھلا رکھنا"۔ قرآن میں انفاق درحقیقت بخل کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے۔ بخل سے مراد ہے اپنی ذات تک محدود رکھنا۔ روک لینا۔ جمع کرنا۔ اس کے برعکس، انفاق سے مراد ہے، مفادِ عامہ کے لئے کھلا رکھنا۔ عام کر دینا۔ روک اور حدبندیاں اٹھا دینا۔ لہٰذا جس معاشرہ کی بنیاد "انفاق فی سبیل اللہ" کے اصول پر ہوگی اس میں ہر فرد معاشرہ اپنی محنت کے ماحصل کو مفادِ عامہ کے لئے کھلا رکھے گا۔ اس پر حدبندی نہیں کرے گا۔ اسے عام کرے گا۔ یہی وہ معاشرہ ہے جس میں ہر فرد معاشرہ دوسروں کی ربوبیت (Development) کی فکر میں رہتا ہے اور دوسروں کے مفاد کو اپنے مفاد پر ترجیح دیتا ہے۔

يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹/۹)

(اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ خود تنگی کی حالت میں ہوں)

آپ نے کبھی ایسا منظر بھی دیکھا ہے کہ سخت گرمی کا دن ہو۔ پانی کی کمی ہو۔ کسی جگہ ایک ہی نل ہو جس میں سے تھوڑا تھوڑا پانی ٹپک رہا ہو۔ پانی پینے اور لینے والوں کی کثرت ہو۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایسے وقت میں کس طرح ہر شخص دوسرے شخص کو پیچھے ہٹانے اور خود آگے بڑھ کر پانی لینے کی فکر کرتا ہے۔ عربی زبان میں اسی ذہنیت کا نام "شحِ نفس" ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس معاشرے میں جس میں ہر فرد دوسرے کے مفاد کو اپنے مفاد پر ترجیح دیتا ہے، انسان "شحِ نفس"

سے بچ جاتا ہے۔ اور جو شخص شحّ نفس سے بچ جائے تو اس کی ذات کی تربیت (Development of Personality) اس طرح ہوتی ہے جس طرح کھیتی پروان چڑھ جاتی ہے۔

وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۵۹/۹)

اور جو شخص "شحّ نفس" سے بچ جائے تو سمجھئے کہ اس کی کھیتی پروان چڑھ گئی۔

انفاق اپنے ہی لئے ہے

دوسرے مقام پر ہے کہ انفاق (اپنی محنت کے ماحصل کو ربوبیتِ عامہ کے لئے کھلا رکھنے میں) بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ ہم دوسروں کے لئے خرچ کر رہے ہیں لیکن یہ درحقیقت اپنی ذات کے لئے خرچ کرنا ہوتا ہے اسی سے نفسِ انسانی کی ربوبیت ہوتی ہے۔ (وَ اَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۶۴/۱۶)) قرآن نے اس حقیقت کو بڑی شدت اور تکرار سے دل نشین کرایا ہے کہ جو کچھ تم کھلا رکھتے ہو اس کے متعلق یہ نہ سمجھو کہ وہ دوسروں کے کام آیا۔ تمہیں اس سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ درحقیقت خود تمہاری اپنی ہی ذات کے کام آتا ہے۔ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ (۲/۲۷۲) مال و دولت میں سے جو کچھ تم کھلا رکھتے ہو، وہ درحقیقت تمہاری اپنی ہی ذات کیلئے ہوتا ہے۔ اس سے تمہاری اپنی ذات کی نشو و نما ہوتی ہے (۳۵/۱۸) اس سے تم خوف اور حزن سے بچ جاتے ہو (۲/۲۷۴) اس کا ذرہ ذرہ تمہیں واپس مل جاتا ہے۔ (يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ (۲/۲۷۲)

اسی کو قرآن نے دیگر مقامات پر قرض سے تعبیر کیا ہے۔ ویسے تو قرض اس مال کو کہتے ہیں جو دیا ہی واپس لینے کیلئے جائے۔ لیکن اس واپسی میں ایک خاص نکتہ بھی ہے۔ آپ نے کسی جگالی کرنے والے جانور کو دیکھا ہے؟ خام چارہ کا گولہ معدہ سے ابھر کر منہ میں آجاتا ہے۔ اسے دانت آہستہ آہستہ چبا کر قابلِ ہضم بنا دیتے ہیں اور اس کے بعد اسے پھر معدے میں لوٹا دیتے ہیں اُسے قریض کہتے ہیں۔ انفاق سے متعلق آیت میں کہا گیا ہے کہ تم جو کچھ دوسروں پر خرچ کرتے ہو، بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ اسے تم دوسروں کو دے رہے ہو۔ لیکن اس کی مثال تو قریض کی سی ہے تم جو کچھ خام شکل میں دیتے ہو نظامِ ربوبیت اسے قابلِ ہضم صورت میں تمہیں لوٹا دیتا ہے۔ اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ (۶۴/۱۷) اگر تم معاشرہ کا توازن قائم کرنے کے لئے کچھ دیتے ہو تو وہ تمہیں دگنی شکل میں واپس مل جاتا ہے۔ (وَ يَغْفِرْ لَكُمْ (۶۴/۱۷) اور تمہاری حفاظت کا سامان بن جاتا ہے۔ یاد رکھو! خدا کا نظامِ ربوبیت خود کچھ نہیں

رکھ لیتا بلکہ تمہاری محنتوں کو اس طرح خوشگوار نتائج سے بھرپور کر دیتا ہے جیسے بکری کے تھن، جو اس طرح دودھ سے لبریز ہوں کہ ان میں سے دودھ کے قطرے ٹپک رہے ہوں (وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ۶۴/۱۷) شکر کے یہی معنی ہیں۔ اور اس طرح تمہاری ذات کی ربوبیت سے تمہاری کیفیت اس اونٹ کی سی ہو جاتی ہے جو قوئی کے اعتدال سے ایسا تنومند اور بھاری بھرکم ہو جائے کہ یوں ہی ذرا ذرا سی بات پر بدک نہ اُٹھے (حلم کے یہ معنی ہیں) یہ اس لئے کہ تمہارے سامنے تو صرف محسوس و مشہود نتائج ہی آتے ہیں، جیسے جسم کی پرورش۔ لیکن قانونِ خداوندی ان محسوس نتائج کے علاوہ ان نتائج کا حامل بھی ہوتا ہے جو تمہاری آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہیں اور جو تمہاری مستقبل کی زندگی کو سنوارتے ہیں (عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۶۴/۱۸) پھر اس کا بھی یقین رکھنا چاہیئے کہ اس کا قانونِ ربوبیت بڑی قوتوں کا مالک ہے (عزیز) اس لئے یہ نہیں ہو سکتا کہ دنیا کی کوئی اور قوت اس پر غالب آجائے اور اسے نتائج مرتب کرنے سے روک دے۔ نہ ہی وہ خود اپنی جگہ سے ہل سکتا ہے (حکیم) اس لئے خدا کے اس محکم اور غالب قانونِ ربوبیت کے مطابق مستقبل کے ان دیکھے نتائج پر یقین رکھتے ہوئے اپنی محنت کے ماحصل کو اس نظام کے سپرد کر دینا چاہیئے۔

سورۂ سبا میں ہے کہ رزق کی بست وکشاد خدا کے قانونِ ربوبیت کے مطابق ہوتی ہے۔ قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ (۳۴/۳۹) اس قانونِ مشیت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ تم جس قدر مفادِ کلی کے لئے کھلا رکھو اسی قدر رزق میں کشائش ہو گی (جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے) مال و دولت کو نوعِ انسانی کی ربوبیت کے لئے کھلا رکھنے میں بظاہر نظر آتا ہے کہ مال ہاتھ سے گیا۔ لیکن درحقیقت یہ جاتا نہیں، نہایت خوشگوار شکل میں واپس آجاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ تم نے خزاں کے موسم میں درختوں کو دیکھا ہوگا۔ ان کے پتے کس طرح جھڑ جاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب یہ تروتازگی سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئے۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد وہ درخت حسین شادابیوں کا سروِ لبِ جوئبار بن جاتا ہے۔ ربوبیت عامہ کے لئے اپنی محنت کے ماحصل کو کھلا رکھنے والے کی یہی مثال سمجھو (وَمَا اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ۳۴/۳۹) اَخْلَفَ الشَّجَرُ کے معنی ہیں درخت کے پتے جھڑ جانے کے بعد پھر سرسبز ہو جانا۔ یا اس کی مثال اس بیج کی سی ہے جس کے ایک پودے میں سات بالیں آئیں اور ہر بال میں سو سو دانے ہوں كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ

مِّائَةُ حَبَّةٍ (۲/۲۶۱) اس لئے جو کچھ بھی نوعِ انسانی کی ربوبیت (رب العالمین کو مشہود کرنے) کے لئے کھلا رکھا جائے گا، وہ خود تمہارے ہی فائدے کے لئے ہے (وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ۔ ۲/۲۷۲) یہ تمہیں پورا پورا واپس مل جائے گا۔ اس میں ذرا بھی کمی نہیں ہوگی (يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۲/۲۷۲) اس لئے کہ اس سے تمہاری ذات میں پختگی پیدا ہو جائے گی۔ تَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ۔ ۲/۲۶۵) اس سے تمہاری نگاہوں میں فراخی اور ظرف میں وسعت آجائے گی۔ اور اس طرح تمہاری ذات، حدود فراموش ہوتی چلی جائے گی۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (۳/۹۱)

اگر تم وسعت وکشادگی چاہتے ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی محنتوں کا عزیز ترین ماحصل ربوبیت عامہ کے لئے کھلا چھوڑ دو۔

اسی لئے دوسری جگہ کہا ہے کہ وہ انفاق جس سے دل میں کبیدگی پیدا ہو اور طوعًا و کرھًا کیا جائے اس کا نتیجہ کچھ نہیں (وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ۹/۵۴ نیز ۲/۲۶۴؛ ۳/۱۱۶؛ ۴/۳۸) ربوبیت عامہ کے لئے انفاق کی صورت یہ ہوتی ہے کہ نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی امید لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۷۶/۹) اس لئے کہ جو انفاق قانونِ خداوندی کی ربوبیتِ اعلیٰ کے لئے ہوتا ہے (ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۹۲/۲۰) اس کا صلہ انسان کی اپنی ذات کی نشو و نما ہوتا ہے۔ (اَلَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى۔ ۹۲/۱۸) اس لئے اس کے بدلہ میں دوسروں سے صلہ اور ستائش کا کیا سوال، اسی لئے سورۂ مدثر میں ہے کہ (وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۷۴/۶) اس خیال سے دوسروں کو نہ دو کہ وہ تمہیں اس کے بدلے میں اس سے زیادہ دیں گے۔ دوسروں کی کمی (Deficiency) ... ... کو پورا کرنے کا صلہ یہ ہے کہ اس سے خود تمہاری کمی پوری ہو جاتی ہے (هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ۵۵/۶۰)

یہ ہے انفاق کا صحیح مفہوم۔ قرآن ایک ایسے معاشرے کی تشکیل چاہتا ہے جس میں تمام افراد معاشرہ اس قسم کے انفاق (اپنی محنتوں کے ماحصل کو ربوبیتِ عامہ کے لئے کھلا چھوڑ دینے) کو اپنی زندگی کا نصب العین

؎ Crystal=lisaton of self

بنائیں۔ وہ اس قسم کے مثالی معاشرہ (ideal society) کو جنّت[1] کہہ کر پکارتا ہے۔ اس جنت کی خصوصیت رزق کی فراوانی ہے۔ ہم قصۂ آدم کے ضمن میں پہلے دیکھ چکے ہیں کہ جنت کی زندگی میں کیفیت یہ تھی کہ انسان جہاں سے جی چاہے سیر ہو کر کھا سکتا تھا۔ (رَغَدًا حَیۡثُ شِئۡتُمَا ۲/۳۵) آدم سے کہا گیا تھا کہ اگر

جنّت کی زندگی

تم نے ابلیس (غیر خدائی قانون) کی بات مان لی تو وہ تمہیں اس جنّت سے نکال دے گا جہاں تمہیں "نہ بھوک کا فکر ہے نہ لباس کا۔ نہ پیاس کی تکلیف ہے نہ مکان کی" (۲۰/۱۱۸)۔ تمام ضروریات زندگی نہایت اطمینان سے پوری ہو جاتی ہیں۔ اگر تم نے اس معاشرہ کو چھوڑ کر غیر خدائی قانون کے مطابق زندگی اختیار کر لی تو یاد رکھو! زندگی کے بلند مقاصد تو ایک طرف، تمہیں ان معاشی ضروریات کے حصول کے لئے بھی بڑی مشقت اٹھانی پڑے گی۔ (فَتَشۡقٰی ۲۰/۱۱۷) آدم نے اس تصورِ حیات کو چھوڑ دیا اور مشقت میں پڑ گیا۔ آدم اس جنّت سے کس طرح نکلا اور اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ اسے قرآن نے بڑے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ اس جنت میں آدم کی حالت یہ تھی کہ جہاں سے جی چاہے سیر ہو کر کھاتا پیتا تھا (وَکُلَا مِنۡهَا رَغَدًا حَیۡثُ شِئۡتُمَا ۲/۳۵) اس سے کہا یہ گیا تھا کہ (وَلَا تَقۡرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ ۲/۳۵) تم اس شجر کے قریب نہ جانا۔ یہ شجر کیا تھا؟ اس کے متعلق بہت کچھ کہا گیا ہے لیکن اس کے معنی خود اس لفظ کے اندر پوشیدہ ہیں۔ شجر کے معنی ہیں انسانوں کا الگ الگ رہنا۔ باہمی اختلاف پیدا ہونا۔ ایک دوسرے کا دشمن ہو جانا۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ شجر "الگ الگ مفاد کی اختلافی زندگی" تھی۔ آدم، ابلیس کے فریب میں آ گیا۔ اور اس سے جنت کی زندگی چھن گئی۔ اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ (بعضکم لبعض عدو ۲/۳۶) افرادِ آدم ایک دوسرے سے الگ الگ ہو گئے۔ اجتماعی مفادِ کلی کی بجائے انفرادی مفاد کی زندگی شروع ہو گئی۔ دوسری جگہ ہے کہ ابلیس نے آدم سے کہا کہ آ! میں تمہیں بتاؤں کہ حیاتِ جاوداں حاصل کرنے کا راز کیا ہے (قَالَ یٰۤاٰدَمُ هَلۡ اَدُلُّكَ عَلٰی شَجَرَةِ الۡخُلۡدِ

[1] جو معاشرہ خدا کے قانونِ ربوبیت کے مطابق متشکل ہوتا ہے اس سے اس دنیا میں جنت کی زندگی مل جاتی ہے اور جو معاشرہ غیر خدائی قوانین کے مطابق قائم ہوتا ہے اس میں انسان جہنم کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ چونکہ قرآن کی رو سے زندگی کا سلسلہ غیر منقطع ہے جو موت کے بعد بھی بدستور آگے چلتا ہے، اس لئے جنت اور جہنم بھی اسی طرح آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ مرنے کے بعد کی زندگی میں چونکہ زمان و مکان کا موجودہ تصور بدل جائے گا اس لئے وہاں کی جنت اور جہنم کی کیفیات ہم اپنے موجودہ شعور سے نہیں سمجھ سکتے۔

وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى (20/119)۔ اُس نے آدم سے کہا کہ تم اپنی اولاد کے ذریعے حیاتِ جاوید حاصل کرسکتے ہو، تم اپنی موت کے بعد اپنی اولاد کی شکل میں جیتے رہ سکتے ہو۔ اس لئے حیاتِ جاوداں کا راز اولاد پیدا کرنے میں ہے۔ فَأَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْآتُهُمَا...... (20/121) اُن کے شرم کے مقامات ظاہر ہو گئے۔ یعنی جنسی شعور بیدار ہو گیا۔ اس سے آدم ایک قدم آگے بڑھا۔ یعنی پہلے تو خود اپنی ذات ہی کے مفاد سامنے آئے تھے۔ اب اپنی ذات سے آگے بڑھ کر، اولاد کے مفاد کا تحفظ بھی مقصدِ زندگی بن گیا۔ اس سے انفرادی مفاد کی ایسی نفسا نفسی پڑ گئی کہ آدم کی جنت بہت دور چلی گئی اور فرزندانِ آدم میں باہمی بُعد پیدا ہو گیا (بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ 20/123)۔ اب اس کے بعد، پھر سے اسی جنتی معاشرہ کی تشکیل، اسی فردوسِ گم گشتہ کی بازیابی، مقصدِ زندگی ہے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ابنِ آدم اپنے معاشرہ کو خدا کے قانونِ ربوبیت کے مطابق متشکل کرلے۔ (فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ 2/38)

سورۃ طٰہٰ کی ان آیات کے بعد جنہیں اوپر درج کیا گیا ہے فرمایا کہ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى (20/123) یعنی جنت سے نکلنے کے بعد آدم کی حالت یہ ہو گئی کہ وہ سامانِ رزق (کھانے۔ پینے۔ لباس مکان) کی فکر میں مارا مارا پھرتا تھا (فَتَشْقٰى 20/117) اب اس سے کہا گیا کہ اگر تم اپنی زندگی کو وحیِ الٰہی کے تابع

قرآن چھوڑ دینے سے رزق کی تنگی

لے آؤ گے تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ "تشقیٰ" کی حالت ختم ہو جائے گی اور پھر وہی رزق کی فراوانیاں حاصل ہو جائیں گی۔ لیکن اگر اس کے بعد پھر اس ضابطہ سے روگردانی کی تو پھر تمہاری معاش تنگ ہو جائے گی۔

وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا..... (20/124)

اور جس نے میرے ضابطۂ قانون سے اعراض برتا تو اس کی معیشت تنگ ہو جائیگی۔

دوسرے مقام پر ہے کہ جب انسان نے پھر سے اپنے معاشرہ کو ان ہی خطوط پر مرتب کر لیا تو پھر وہی جنتی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ اس جنت میں رزق کی فراوانی ہو گی۔ (وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا۔ 19/62) اس میں ان کے لئے سامانِ معیشت غیر منقطع ہو گا۔ وہاں رزق کے حصول کے لئے نہ کوئی پریشانی ہو گی نہ مصیبت نہ مشقت ہو گی نہ تشویش۔ (لَا يَمَسُّنَا فِيهَا نَصَبٌ وَّلَا يَمَسُّنَا فِيهَا لُغُوبٌ 35/35) وہاں فکرِ معاش کا خیال

نہیں ستائے گا۔ (وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْۤ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ۳۵/۳۴) اس معاشرہ کے افراد قانونِ خداوندی کی مدح وستائش میں زمزمہ بار ہوں گے جس نے انہیں ان کی اوران کی اولاد کی معیشت کی فکر سے آزاد کردیا ہوگا۔ چونکہ اس معاشرہ میں رزق کے لئے باہمی چھینا جھپٹی نہیں ہوگی، اس لئے دلوں میں عداوت اور کینہ بغض اور حسد کے شعلہ بار جذبات بھی نہیں اٹھیں گے۔ (وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ۔ ۴۷/۱۵) ان کے سینے جذباتِ بغض وکدورت سے صاف ہوں گے۔ ہر طرف سے امن اور سلامتی کی ہوائیں چلیں گی (اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِیْنَ۔ ۴۶/۱۵) وہ سب ایک ہی دسترخوان پر آمنے سامنے بیٹھ کر کھائیں گے (اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ ۱) اس معاشرہ میں فراوانیٔ رزق کی یہ کیفیت عارضی نہیں ہوگی بلکہ ہمیشہ ایسی ہی حالت رہے گی۔ (وَمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِیْنَ۔ ۴۸/۱۵) وہاں کے باغات میں ہر وقت نہریں جاری رہیں گی تاکہ ان کی سرسبزی اور شادابی میں کمی نہ آنے پائے۔ بڑے سے بڑا حادثہ بھی ان کی اس زندگی میں انتشار پیدا نہیں کرسکے گا۔ (لَا یَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ ۱۰۳/۲۱) اس معاشرہ میں وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ خدا کی صفتِ رب العالمینی (تمام کائنات کی پرورش وربوبیت) کس طرح مشہود شکل میں سامنے آجاتی ہے۔ (وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۱۰/۱۰) یہ ہے مختصر سا نقشہ اس معاشرہ کا جو خدا کے قانونِ ربوبیت کے ماتحت متشکل ہوتا ہے۔ اس معاشرہ کے پورے خط وخال اور تفصیلی کوائف دیکھنے ہوں تو قرآن کے ان مقامات کو سامنے لائیے جن میں جنت کی تفاصیل دی گئی ہیں، حقیقت اُبھر کر سامنے آجائے گی کہ اس معاشرہ میں انسان کس قسم کی شگفتہ اور شاداب زندگی بسر کرے گا۔ لیکن جب انسان ضابطۂ خداوندی کو پھر چھوڑ دے گا تو پھر وہی معاشی پریشانیاں شروع ہوجائیں گی۔ یعنی جب انسان اپنے معاشرے کو اپنے بنائے ہوئے قانون کے مطابق متشکل کر لیگا تو اس میں (انسانی ذات کی نشوونما کا تو ذکر ہی کیا) روٹی کے مسئلہ کا حل بھی کہیں نظر نہیں آئے گا۔ لیکن اگر اس معاشرہ کو قانونِ ربوبیت کے مطابق متشکل کرلے گا تو نہ صرف یہ کہ اس کے تمام معاشی مسائل خودبخود حل ہوجائیں گے

---

۱ اَخ کے معنی بھائی ہیں۔ لیکن درحقیقت اَخ ان مویشیوں کو کہا جاتا ہے، جو ایک ہی کھونٹے سے باندھے جائیں اور اس طرح ایک ہی تھان پر مل کر کھائیں۔

بلکہ اس کی ذات کی نشو ونما بھی ہوتی چلی جائے گی۔ اس سے آپ نے یہ بھی دیکھ لیا کہ نظامِ ربوبیت نہ محض "روحانی" مسئلہ ہے اور نہ ہی محض "معاشی"۔ اس میں معاشی اور روحانی دونوں مسائل حل ہو جاتے ہیں۔

قریبی مفاد (حیات الدنیا) اور مستقبل کے مفاد (حیاتِ آخرت) کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے دونوں نظریئے ہمارے سامنے آگئے۔ اور ہم نے یہ بھی دیکھ لیا کہ ان دونوں نظریوں کے ماتحت جس قسم کے معاشرے متشکل ہوتے ہیں ان میں انسانی زندگی کس شکل سے بسر ہوتی ہے۔ اب یہ دیکھئے کہ قرآن ان دونوں نظریوں اور معاشروں کو کس کس انداز سے مقابلہ کرتے ہوئے سامنے لاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ چونکہ قرآن کی ساری تعلیم کا منتہیٰ ومقصود قانونِ ربوبیت کے مطابق معاشرے کا قیام ہے اس لئے پورا قرآن ان ہی تفاصیل سے بھرا پڑا ہے۔ کہیں ان نظریوں کے اصول ومبانی کا ذکر ہے۔ کہیں آفاقی کائنات کی مشینری کی مثالوں سے سمجھایا گیا ہے کہ وہاں یہی قانونِ ربوبیت کس نظم وضبط اور حسن وخوبی سے کارفرما ہے۔ کہیں اُممِ سابقہ کی تاریخی یادداشتوں سے بتایا گیا ہے کہ دیکھو! انفرادی مفاد زندگی پر مبنی معاشرہ کا انجام کیا ہوا۔

قرآن کے دعاوی علیٰ وجہ البصیرت

قرآن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے کسی دعوے کو اندھے عقیدے کے طور پر منوانا نہیں چاہتا۔ وہ ہر دعوے کی تائید میں دلیل وبرہان پیش کرتا ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ تم میرے دعاوی کو علم وبصیرت کی میزان میں تولو اور پھر دیکھو کہ ان کا وزن کیا نکلتا ہے اگر یہ اس میزان پر پورے اتریں تو انہیں مانو۔ اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہے کہ جب میں کسی دعوے کو بلا دلیل وبرہان نہیں منواتا تو تمہارے لئے بھی یہ مناسب نہیں کہ تم ان کا انکار بلا دلیل وبرہان یوں ہی سر ہلا کر کر دو اگر تم ان دعاوی کو جھٹلاتے ہو تو (هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۶۴/۲۷) تم اپنے دعوے کی تائید میں دلیل پیش کرو۔ اسے اپنے دعاوی کی صداقت پر اس قدر محکم یقین ہے کہ وہ اس کے ساتھ ہی کہہ دیتا ہے کہ جاؤ! جتنی جی چاہے کوشش کر دیکھو، تمہیں ان دعاوی کے خلاف علم کی بارگاہ سے کوئی دلیل نہیں مل سکے گی (لَا بُرْهَانَ لَهُ ۱۱۷/۲۳) کتنا بڑا ہے یہ دعویٰ اور کس قدر حتم ویقین کے ساتھ اسے پیش کیا گیا ہے! یہ اس لئے کہ وہ کہتا ہے کہ) قرآنی دعاوی محض ظن وقیاس پر مبنی نہیں، علم وحکمت پر مبنی ہیں؛ اس لئے اسے علم کی شہادت آ

گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بار بار ان لوگوں کو زجر و توبیخ کرتا ہے جو علم و برہان سے کام نہیں لیتے اور محض ظن و تخمین یا اسلاف کی تقلید کی بنا پر قرآنی دعاوی سے انکار کر دیتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد اب آگے بڑھیے اور دیکھئے کہ ان دونوں نظریوں کے متعلق قرآن کیا کہتا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ "انفرادی مفاد" کے نظریے کی علت "لینا" (To Receive) ہے اس کے برعکس نظام ربوبیت کا مدار "دینے" (To Give) پر ہے۔ دیکھئے، وہ اس تفریق و تمیز کو کتنے واضح الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے

دونوں نظریوں کا تقابل

کہ تم اس جہانِ کارزار میں بڑی جدوجہد کرتے ہو۔ لیکن تمہاری کوششوں کے رخ مختلف سمتوں میں ہوتے ہیں (اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى۔ ۹۲/۴) ان مختلف سمتوں کی چھوٹی چھوٹی شاخیں کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہوں، آخر الامر یہ دو بڑی شاخوں میں بٹ جاتی ہیں۔ ایک شاخ ہے "دینے" کی۔ اور ایک شاخ ہے "لینے" کی۔ سو یاد رکھو جس نے دینا سیکھا اور اس طرح اپنی محنت کے ماحصل کو خدا کے قانون ربوبیت کے ساتھ ہم آہنگ کر لیا (فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۹۲/۵) اور یوں معاشرہ کے توازن کو برقرار رکھ کر اپنے نظریۂ زندگی کو سچ کر دکھایا (وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى۔ ۹۲/۶) تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس پر فراوانی اور آسانی کی راہیں کھول دی جائیں گی۔ (فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى۔ ۹۲/۷) یہ ہے ایک نظریہ اور اس کا نتیجہ۔ اس کے برعکس، جس نے دوسرا نظریۂ زندگی اختیار کیا اور سب کچھ سمیٹ کر اپنے لئے رکھنے کی فکر میں لگ گیا اور سمجھ بیٹھا کہ میں اب ہر شے سے بے نیاز ہو چکا ہوں (وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۹۲/۸) اور اس طرح اس نے اپنے معاشرہ کے توازن کو بگاڑ دیا۔ (وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۹۲/۹) تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اس پر مشقت اور عسرت کی راہیں آسان ہو جائیں گی۔ (فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۹۲/۱۰) لیکن اس قسم کا ناہموار معاشرہ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکے گا۔ اس میں انقلاب آ کر رہے گا۔ جب انقلاب آئے گا تو اس وقت جمع کردہ مال اس کے کسی کام نہ آ سکے گا۔ (وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰى ۹۲/۱۱) اس نے یہ نظریۂ زندگی اس لئے اختیار کیا تھا کہ اس نے سمجھ لیا تھا کہ زندگی کا مقصد کھانا، پینا، جسم انسانی کی پرورش ہے جس کے لئے انسان کے اپنے رجحانات (خواہ وہ جبلت (Instinct) پر مبنی ہوں اور خواہ انفرادی عقل پر) کافی ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی کی نشوو ارتقاء کے لئے انسان کے خود ساختہ قوانین کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے یہ فریضہ ہم نے (خدا نے) اپنے

ذمّہ لے رکھا ہے کہ وہ انسانی زندگی کی ربوبیت کے لئے (جس میں جسم اور انسانی ذات دونوں کی نشوونما شامل ہے) ضابطۂ ہدایت (راہنمائی کے اصول) خود متعین کرے۔ (اِنَّ عَلَیْنَا لَلْھُدٰی 92/12) یہ اس لئے کہ انسان کے سامنے صرف اس کے انفرادی مفاد ہوتے ہیں۔ وہ پیش پا افتادہ قریبی مفاد ہی کو دیکھ سکتا ہے۔ اس کی نگاہ دور تک نہیں جاتی۔ وہ اس لئے نوعِ انسانی کے مفادِ کلّی کو نہیں دیکھتا اور نہ ہی اپنی مستقبل کی زندگی کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔ اس کے برعکس ہمارے (خدا کے) سامنے قریب اور بعید، حال اور مستقبل، فرد اور نوعِ انسانی، سب کے مفاد ہوتے ہیں (اِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَۃَ وَالْاُوْلٰی 92/13) لہذا تم ان لوگوں کو ان کے انفرادی نظریۂ زندگی کے مآل و عواقب سے آگاہ کر دو اور انہیں بتا دو کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہاری زندگی کی کھیتی جھلس کر رہ جائے گی۔ (فَاَنْذَرْتُکُمْ نَارًا تَلَظّٰی 92/14) یہ جہنم اس معاشرے کا نتیجہ ہے جس میں ہر فرد، دوسرے فرد سے الگ رہتا ہے اور اس طرح خدا کے قانونِ ربوبیت کے علی الرغم گریز کی راہیں تلاش کرتا ہے (لَا یَصْلٰھَآ اِلَّا الْاَشْقَی الَّذِیْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی 92/15-16) ان کے برعکس وہ معاشرہ ان ہلاکتوں سے محفوظ رہے گا، جس میں ہمواریاں پیدا ہوں گی اور اس طرح تمام افراد کامل ہم آہنگی سے مفادِ کلّی کے حصول میں منہمک رہیں گے۔ (وَسَیُجَنَّبُھَا الْاَتْقَی۱ 92/17) اس معاشرہ میں ہر فرد کی کوشش یہ ہوگی کہ وہ اپنی محنت کا ماحصل دوسروں کو دے اور اس طرح اُن کی نشوونما کا سامان بہم پہنچائے اور بالواسطہ خود اپنی ذات کی نشوونما کرے (اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَہٗ یَتَزَکّٰی 92/18) اس معاشرہ میں کوئی شخص خدا کی بخشائش (نعمائے خداوندی) کا معاوضہ نہیں چاہے گا۔ بلکہ انہیں نوعِ انسانی کی ربوبیتِ اعلیٰ کے مقصد کے حصول میں صرف کرتا جائے گا (وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَہٗ مِنْ نِّعْمَۃٍ تُجْزٰٓی اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْہِ رَبِّہِ الْاَعْلٰی 92/19-20) اس معاشرہ کے حسین و درخشندہ نتائج فوراً سامنے آجائیں گے۔ (وَلَسَوْفَ یَرْضٰی ۔ 92/21)

---

۱ تقویٰ کے معنی عام طور پر پرہیزگاری کئے جاتے ہیں لیکن اس سے قرآن کی اس عظیم اصطلاح کا صحیح مفہوم سامنے نہیں آسکتا۔ تقویٰ کا مادہ وقی ہے جس کے معنی نگہداشت اور حفاظت کے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان زندگی کے ہر شعبے میں قوانینِ خداوندی کی نگہداشت رکھے اور ان سے کامل ہم آہنگی کی زندگی بسر کرے۔

آگے بڑھنے سے پہلے ایک نکتہ پر مزید غور کرنا ضروری ہے جو اوپر کی آیات میں بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ تمہاری عقل تمہاری راہنمائی کے لئے کافی نہیں۔ راہنمائی ہمیں دے سکتے ہیں۔ اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى (۹۲/۱۲) یہ نکتہ قرآنی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ ہے اور یہیں سے وحی کی ضرورت واضح ہو جاتی ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہر فرد کی عقل کا تقاضا اس کے اپنے مفاد کا تحفظ ہے۔ اور اسی طرح ہر قوم (گروپ) کا تقاضا، اس قوم (گروپ) کے مفاد کا تحفظ ہے (حقیقت یہ ہے کہ فرد، اپنے آپ کو گروپ کے ساتھ متمسک ہی اس لئے کرتا ہے کہ وہ دیکھتا ہے کہ گروپ کے ساتھ رہنے میں وہ زیادہ محفوظ ہو جاتا ہے) نہ فرد کی عقل کسی دوسرے فرد کا مفاد سوچ سکتی ہے اور نہ قوم (گروپ) کی عقل کسی دوسری قوم (گروپ) کے مفاد کا خیال رکھ سکتی ہے۔ مفادِ غیر کا تحفظ عقل کے بس کی چیز نہیں۔ جس طرح میری آنکھ صرف مجھے دکھا سکتی ہے۔ میرے کان صرف مجھے سنا سکتے ہیں۔ میری زبان صرف مجھے ذائقہ کا علم دے سکتی ہے۔ اسی طرح میری عقل صرف میرے مفاد کا تحفظ کر سکتی ہے۔ لہٰذا کسی فرد یا افراد کے مجموعہ (قوم) کی عقل کے بس کی بات نہیں کہ وہ نوعِ انسانی (یعنی اپنے سے باہر دیگر افراد یا اقوام) کے مفاد کے لئے کوئی نظام وضع کر سکے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان کو کسی ایسے مقام سے راہنمائی ملے جو انسانی جذبات سے بلند ہو۔ یعنی وہ سرچشمۂ ہدایت یکسر خارجی (Objective) ہونا چاہیئے اسے قرآن کی اصطلاح میں وحی کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے کہا ہے کہ اس قسم کا نظام ربوبیت قائم

وحی کی ضرورت

---

[1] یاد رکھئے جب عقل کائناتی امور میں تجسس کرتی ہے تو وہاں صرف انکشافِ حقیقت (Discoveries) کا سوال پیش ہوتا ہے اس لئے وہاں عقل صحیح کام کرتی ہے۔ لیکن انسانوں کی دنیا میں چونکہ ایک انسان کے مفاد کا تصادم دوسرے انسان کے مفاد سے ہوتا ہے۔ اس لئے اس میں عقل ہمیشہ اپنا مفاد سوچتی ہے اس سے الگ ہو ہی نہیں سکتی انسانوں کی دنیا میں اگر عقل کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو اس سے خالص ابلیسی معاشرہ وجود میں آجاتا ہے جس میں ہر انسان دوسرے انسان کا دشمن ہو جاتا ہے (بعضکم علی لبعض عدو) اسی لئے اقبال نے کہا ہے کہ:-

گو فکر خداداد سے روشن ہے زمانہ آزادیِ افکار ہے ابلیس کی ایجاد

لیکن دیگر امور میں اگر عقل سے کام نہ لیا جائے تو قرآن کے الفاظ میں، انسان، حیوانات سے بدتر ہو جاتا ہے اور سیدھا جہنم میں جا پہنچتا ہے۔

کرنے کے لئے تمہاری عقل (جذبات) کی راہنمائی کافی نہیں۔ یہ راہنمائی ہماری طرف ہی سے مل سکتی ہے (اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ۹۲/۱۲) اور یہ اس لئے کہ تم صرف اپنا اپنا مفاد دیکھ سکتے ہو۔ اور ہم مفادِ کُلّی کو سامنے رکھ سکتے ہیں۔ اقبالؔ کے الفاظ میں:

عقل خود بیں غافل از بہبودِ غیر — سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر
وحیِ حق بینندۂ سودِ ہمہ — در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ

اب آپ پھر اسی موضوع کو سامنے لایئے جو پیچھے سے چلا آرہا تھا۔ اس حقیقت کو قرآن نے سورۂ روم میں دوسرے انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ قریبی مفادِ خویش، اس قدر پیش پا افتادہ اور اُبھرے ہوئے ہوتے ہیں کہ لوگ ان کی طرف کشاں کشاں چلے جاتے ہیں اور مستقبل کے مفاد کا تصور ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ (یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ۳۰/۷) لیکن اگر یہ ذرا بھی غور و فکر سے کام لیں اور اپنے میلانات و قیاسات سے کام لینے کی بجائے علم و تحقیق کی بارگاہ سے پوچھیں تو انہیں وہاں سے یہی جواب ملے گا کہ زندگی کا راز، مستقبل کے مفادِ کُلّی کے نظریہ میں ہے نہ کہ انفرادی مفاد کے پروگرام میں۔ دنیا میں یوں تو علوم و فنون کے سینکڑوں شعبے ہیں لیکن اگر آپ انہیں سمٹالیں تو یہ تین اصولی شاخوں میں بٹ جاتے

کائنات اسی اصول پر چل رہی ہے

ہیں۔ علم خویش (یعنی انسان کا اپنے جسم اور ذات سے متعلق علم۔ اس میں میڈیسن۔ فلسفہ اور سائیکالوجی وغیرہ آجاتے ہیں) علم کائنات (جس میں سائنس کے تمام شعبے آجاتے ہیں) اور نوعِ انسانی کی تاریخ۔ قرآن کہتا ہے کہ علم کے ان تین شعبوں میں تحقیق کرو اور پھر دیکھو کہ یہ کارگہِ عالم "لینے" کے انفرادی نظریہ کے ماتحت چل رہا ہے یا "دینے" کے عالمگیر اجتماعی نظریہ کے مطابق۔ سب سے پہلے انسان کی اپنی ذات کو لیجئے (اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۳۰/۸) ذرا دیکھو کہ جسمِ انسانی میں کس طرح ہر عضو اور اس کا ہر حصہ اس کوشش میں لگا ہوا ہے کہ جو کچھ اس کے پاس آئے وہ اسے دوسروں تک پہنچا دے۔ معدہ، جگر، پھیپھڑے، دل، دماغ، شریان، وریدیں، حتیٰ کہ ذرا ذرا سے خلیے (cells) سب کے سب، دن اور رات، اسی کوشش میں سرگرداں ہیں کہ جو کچھ ان کے پاس آئے، اس میں اپنی محنت کو شامل کر کے جلد سے جلد دوسروں تک پہنچا دیں۔ یہ نظام اسی نظریے کے ماتحت قائم ہے۔ اگر کبھی

(مثلاً) معدہ، اس قانونِ انفاق کی بجائے نظریۂ بخل کو اپنا مسلک بنالے اور جو کچھ اس میں داخل ہو اسے وہیں روک لے، تو دیکھئے، یہ ساری مشینری کس طرح رک جاتی ہے۔ اگر دل ایک ثانیے کے لئے بھی "دینے" (اعطیٰ) کے اصول کو چھوڑ کر خون کو اپنے اندر روک لے، تو دیکھئے! کس طرح ایک ثانیہ میں موت واقع ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی ورید یا شریان، ایک ذرۂ خون (Clot) کو آگے پاس (Pass) نہ کرے تو دیکھئے! کس طرح پورا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ غور کیجئے کہ جسم کی زندگی اور پرورش کا دار و مدار کس طرح "دینے" کے نظام پر ہے۔

انسانی جسم سے آگے بڑھو اور خارجی کائنات پر غور کرو۔ دیکھو وہاں بھی کس طرح یہی نظامِ انفاق و ایتاء کارفرما ہے۔ زندگی کا دار و مدار حرارت اور روشنی پر ہے۔ دیکھو سورج کس طرح روشنی اور حرارت مسلسل و متواتر دیئے چلا جاتا ہے۔ وہ اس معاملے میں ذرا بھی بخل نہیں برتتا۔ یہی حال دیگر عناصرِ کائنات کا ہے ہر ایک "دینے" اور دوسرے کی ربوبیت کے سامان بہم پہنچانے کی فکر میں سرگرداں ہے۔ اسی نظام کا اثر ہے کہ کائنات میں تعمیری نتائج مرتب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ورنہ اگر عناصرِ کائنات میں سے کوئی ایک عنصر ایک لمحہ کے لئے بھی، بخل سے کام لے تو یہاں تخریب ہی تخریب رونما ہو جائے (مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ (۳۰/۸))

اس سے آگے بڑھو تو انسانیت کی تاریخ پر غور کرو۔ جن قوموں نے صرف معاشی زندگی کے انفرادی نظریہ کو سامنے رکھا۔ وہ تباہ و برباد ہو گئیں۔ جس وقت تک کسی قوم میں مفادِ عامہ کا تصوّرِ نظام غالب رہا، وہ قوم زندگی اور اس کی عیش سامانیوں سے متمتع ہوتی چلی گئی۔ جب یہ تصوّر بدلا، معاشرے میں ناہمواریاں اور مفاد پرستیاں شروع ہو گئیں۔ اور وہ قوم تباہ و برباد ہو گئی۔

تاریخی شہادات

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (۳۰/۹)

کیا یہ لوگ دنیا میں چل پھر کر نہیں دیکھتے کہ جو قومیں ان سے پہلے گزر چکی ہیں ان کا انجام کیا ہوا؟ انہوں نے ان سے بھی زیادہ قوت و شوکت کا سامان اکٹھا کر رکھا تھا (كَانُوْا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً (۳۰/۹)) اور معاشی وسائل سے بھی خوب نفع اندوز ہوتے تھے (وَ اَثَارُوا الْاَرْضَ (۳۰/۹)) اس لئے ان کی بستیاں

بڑی آباد اور بارونق تھیں (وَعَمَرُوْهَآ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا ۳۰/۹) لیکن ان کا نظریہ زندگی غلط تھا۔ ان کی طرف خدا کے فرستادگان صحیح نظریۂ حیات لے کر آئے لیکن انہوں نے اپنی روش میں تبدیلی پیدا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کا معاشرہ تباہ و برباد ہو گیا (وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۳۰/۹) اس لئے کہ خدا کا یہ اٹل قانون ہے کہ جو قوم اپنے معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرتی ہے، خود ان کی زندگی میں ناہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں اور اس کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ اور چونکہ زندگی کا دار و مدار توازن اور اعتدال پر ہے اس لئے اس عدمِ توازن سے ان کی زندگی کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ ۳۰/۱۰۔ جب تک اس قسم کا ہلاکت انگیز انقلاب نہیں آتا، ایسا دکھائی دیتا ہے کہ مفاد پرست گروہ کے افراد کم از کم آپس میں، ایک دوسرے کے ساتھ ہیں لیکن جب اس قسم کا جھٹکا آئے جس سے ان کے مفاد کی عمارت متزلزل ہوتی دکھائی دے تو اس وقت یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ یہ لوگ در اصل خود آپس میں بھی ایک دوسرے کے بہی خواہ نہیں تھے۔

وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآئِهِمْ شُفَعٰٓؤُا وَكَانُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ كٰفِرِيْنَ ۳۰/۱۳

اس وقت سب شریک کار (Partners) الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ اور کوئی کسی کے ساتھ کھڑا نہیں ہوتا۔

سب اپنے اپنے مفاد کے تحفظ کی راہوں پر الگ الگ چل نکلتے ہیں وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ (۳۰/۱۴) یہ تو تھا ایک نظریۂ زندگی۔ اس کے برعکس جو لوگ خدا کے نظامِ ربوبیت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائیں اور پھر اسی نظام کے قیام و استحکام کے لئے عملی پروگرام پر گامزن ہوں تو ان کے معاشرہ کی کیفیت یوں سمجھئے جیسے کسی پانی کے خوشگوار چشمے کے گرد سدا بہار پھول مہک رہے اور کھیتیاں لہرا رہی ہوں فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ (۳۰/۱۵)

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قرآن دنیاوی زندگی اور اس کی آسائشوں کو بڑی اہمیت دیتا ہے لیکن وہ کہتا ہے

کہ ان کی یہ اہمیت اسی صورت میں ہے جبکہ نظریہ حیات 'ربوبیت عالمینی (تمام نوعِ انسان کی ربوبیت) اور مستقبل کی زندگی کی نشوو ارتقاء ہو
اگر اسکے خلاف نظریہ زندگی "مفادِ خویش" ہو جائے تو پھر ان معاشی آسائشوں کی کوئی قیمت نہیں رہتی بلکہ یہ اُلٹا نقصان کا موجب بن جاتی
ہیں۔ اس نظریہ کے ماتحت دنیاوی زندگی کی قیمت لہو و لعب سے زیادہ نہیں رہتی۔ لہو ہر اس جاذبیت کو کہتے ہیں جو انسان کو اس کے مقصد سے

دنیاوی زندگی لہو ولعب

غافل کر دے۔ اور لعب اس پروگرام کو کہتے ہیں جس میں حرکت (Movement) تو ہو
لیکن اس سے انسان منزل کے قریب نہ پہنچ سکے۔ جیسے بھنور میں پھنسی ہوئی کشتی، کہ وہ ہر وقت حرکت میں تو رہتی ہے لیکن ساحل
کے قریب نہیں پہنچتی۔ لہٰذا انفرادی نظریہ حیات میں زندگی کی جدوجہد انسان کو اس کی منزلِ مقصود (ربوبیت ذات اور حصولِ حیاتِ
جاوداں) کی طرف نہیں لے جاتی۔ سورہ حدید میں ہے (اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّلَہْوٌ وَّزِیْنَۃٌ ۵۷/۲۰) یعنی مفادِ خویش کے
نظریہ کے ماتحت زندگی کی معاشی جدوجہد بے مقصد حرکت اور منزل سے غافل کر دینے والی جاذبیتوں سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔ اس سے
آگے بڑھئے تو اس جدوجہد کا مقصد یہ رہ جاتا ہے کہ انسان (یا اقوام) بڑا بن کر دکھائی دے۔ اور دولت اور جتھابندی میں ایک دوسرے
سے آگے بڑھ جائیں (وَتَفَاخُرٌ بَیْنَکُمْ وَتَکَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۵۷/۲۰) فخر کہتے ہیں ایسے بالکھ (Udder) کو جو
دکھائی تو دے بہت بڑا لیکن اس میں دودھ بالکل نہ ہو۔ اور اگر دودھ بہت کم ہو تو اسے غرور کہتے ہیں۔ لیکن اس نہج زندگی کے معاشی
فوائد پر خوش ہونا ایسا ہی ہے جیسے کوئی کسان ایسی روئیدگی (Vegetable) پر خوش ہو جائے جو بارش کے ہلکے سے
چھینٹے سے یوں ہی اُگ آئے اور اس کی جڑیں اوپری اوپر ہوں کَمَثَلِ غَیْثٍ اَعْجَبَ الْکُفَّارَ نَبَاتُہٗ (۵۷/۲۰) اس
قسم کی کھیتی کی زندگی کے دن ہوتی ہے؟ ذرا دھوپ پڑی اور مرجھا گئی اور خشک ہو کر ریزہ ریزہ ہو گئی
ثُمَّ یَہِیْجُ فَتَرٰىہُ مُصْفَرًّا ثُمَّ یَکُوْنُ حُطَامًا (۵۷/۲۰) ایسی کھیتی پر آس لگا کر بیٹھنے والے کا انجام معلوم
ہے۔ اس کا مستقبل ایک دردناک اور عبرت انگیز عذاب کے سوا اور کیا ہوگا۔ (وَفِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابٌ شَدِیْدٌ
۵۷/۲۰) اس قسم کی مایوسیوں سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ انسان اپنی محنت کو خدا کے قانون کے ساتھ
بالکل ہم آہنگ کر دے۔ (وَمَغْفِرَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانٌ ۵۷/۲۰) اگر ایسا نہ کیا جائے اور زندگی کا مقصد محض مفادِ خویش رکھا جائے تو جیسا کہ
پہلے کہا جا چکا ہے اس روش کا ماحصل ایسی متاع ہے جو صرف دیکھنے میں بڑی نظر آتی ہے حقیقت میں کچھ نہیں (وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ)
اس سے آگے قرآن کہتا ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ ایک دوسرے سے بڑھ جانے کا جذبہ تمہارے دل کی
گہرائیوں میں جاگزیں ہے۔ ہم اس جذبہ کو کچلنا نہیں چاہتے۔ اس لئے کہ اس میں استحکام خودی کا راز پوشیدہ ہے۔

لیکن ہم اس کے لئے میدان دوسرا تجویز کرتے ہیں۔ ایک دوسرے سے آگے بڑھنا چاہتے ہو تو اس نظام کے قیام کی کوشش میں آگے بڑھو جو ربوبیتِ عامہ کی بنا پر تمام انسانیت کی حفاظت کا سامان بہم پہنچائے[1] (سَابِقُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۵۷/۲۱) اور اس طرح، وہ جنّت تمہارے سامنے مشہود ہو جائے جو زمان و مکان کی حدود سے بے نیاز ہے (وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۵۷/۲۱) اور جو اس نظام کا عملی نتیجہ ہوتی ہے جو خدا کے بھیجے ہوئے قانون کے ذریعے متشکل ہوتا ہے۔ (اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۵۷/۲۱) اس قسم کی معاشی خوش حالیاں کسی خاص گروہ کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر اس قوم کو مل سکتی ہیں جو خدا کے قانون کے مطابق اسے حاصل کرنے کی آرزومند ہو (ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۵۷/۲۱) اس لئے کہ اللہ کا قانون وہ اصل و بنیاد ہے جس پر حقیقی معاشی خوش حالیوں کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ (وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۵۷/۲۱)

قرآن کہتا ہے کہ ہم نے جو یہ کہا ہے کہ وہ معاشرہ جو انفرادی مفادِ خویش کے نظریہ پر قائم ہوگا، تباہ و برباد ہو جائے گا۔ اور جس نظام کی بنیادیں نوعِ انسانی کے مفادِ کلّی پر ہوں گی، وہی انسانیت کی ربوبیت کا ضامن اور انسانی ذات کی نشو و ارتقا کا کفیل ہوگا، تو یہ دعویٰ ایک عظیم الشان حقیقت پر مبنی ہے۔ اور وہ حقیقت یہ ہے کہ تمام کائنات میں ایک ہی قانون کارفرما ہے۔ اس لئے یہ ہو نہیں سکتا کہ تم اپنے معاشی کاروبار کو کائناتی قانون سے الگ کرکے کامیاب ہو جاؤ۔ جو معاشرہ اپنے معاشی معاملات کے لئے الگ قاعدے مقرر کرے گا اور انہیں اخلاقی دنیا کے (کائناتی) قوانین کے ساتھ ہم آہنگ نہیں رکھے گا اس کا انجام تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ قرآن اس بنیادی دعوے کو بڑے شد و مد سے پیش کرتا ہے اور مختلف طریقوں سے اسے اجاگر کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس خدا کا قانون

کائنات میں ایک ہی قانون

---

[1] قرآن میں دوسری جگہ ہے کہ باہمی منافست چاہتے ہو تو "جنت کی زندگی" اور اس کی خوش حالیوں اور شادکامیوں کے حصول میں منافست کی کوشش کرو۔ (وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ - ۸۳/۲۶) سورۂ بقرہ میں (نیز کئی ایک دوسرے مقامات میں) ہے کہ آگے بڑھنا چاہتے ہو تو نوعِ انسانی کی بہبود کے کاموں میں آگے بڑھو (فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۲/۱۴۸) "نیکی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جاؤ نہ کہ 'لینے' میں (۲۳/۶۰-۶۱)

ربوبیت، کائنات میں جاری و ساری ہے، اسی خدا کا قانونِ ربوبیت، انسانوں کی معاشی دنیا میں بھی کارفرما ہونا چاہیئے۔ جو شخص انسانوں کی معاشی دنیا میں کسی اور قانون اور ضابطہ کی اتباع چاہتا ہے، وہ درحقیقت شرک کا مجرم ہے۔ (اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ۲۱/۲۱) "کیا ان لوگوں نے اپنی معاشی زندگی (ارض) کیلئے الگ قوانین تجویز کر رکھے ہیں جن کی یہ اطاعت کرتے ہیں اور ان کے سہارے اپنے معاشی پروگرام کو عام کرنا چاہتے ہیں؟" اگر ان کی یہی روشِ زندگی ہے تو انہیں سن رکھنا چاہیئے کہ اگر انسان کی معاشی زندگی میں کوئی اور قوانین نافذ ہوں اور کائناتی زندگی میں اور، تو اس کا نتیجہ فساد کے سوا کچھ اور نہ ہوگا۔ (لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۲۱/۲۲) تمام کائنات اور انسانوں کی دنیا کی مرکزی ربوبیت کا مالک و قادر، ایک خدا ہے جس کا عالمگیر قانون ہر جگہ نافذ العمل ہے۔ وہ خدا ان لوگوں کے اس قسم کے "مشرکانہ تصورات سے بہت بلند ہے۔ (فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۲۱/۲۲)

یہ دعویٰ کہ کائنات میں ایک ہی قانون کارفرما ہے، دورِ حاضرہ کے مفکرین کے نزدیک ایک حقیقتِ ثابتہ بن چکا ہے۔ اس باب میں (Hans DreisCh) اپنی کتاب (The Problem Of Individualaty) میں لکھتا ہے:

> **وحدتِ قانون** یہ نظریہ کہ تمام کائنات ایک منظم وحدت ہے، وحدتِ نظم (Monism of Order) کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وحدتِ نظم کا یہ تصور کائنات کے متعلق دیگر تمام تصورات کو منسوخ کر دیتا ہے۔ اس کی رُو سے کائنات کے مختلف شعبوں میں الگ الگ نظام باقی نہیں رہتے۔ تمام کی تمام کائنات وحدتِ نظم کی مظہر بن جاتی ہے۔
>
> اس وحدتِ نظم کے پیشِ نظر قوانینِ فطرت کے تصور میں بھی تبدیلی ضروری ہو جاتی ہے کیونکہ اس صورت میں فطرت میں متعدد قوانین نہیں بلکہ ایک ہی قانون کارفرما نظر آئے گا۔

پروفیسر جونز (جس کا تعارف پہلے کرایا جا چکا ہے) اس باب میں لکھتا ہے:

> جوں جوں ہم، عناصر اور ان کے مرکبات کے متعلق قوانین کا مطالعہ کرتے ہیں، یہ حقیقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ساری کائنات میں ایک ہی قانون نافذ العمل ہے (Design And Purpose)

لہذا یہ تصور کہ کائناتی زندگی میں اور قانون کارفرما ہے اور انسان کی معاشی زندگی کسی اور قانون کے تابع ہونی چاہیئے بکسر باطل ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس قسم کا تصور رکھنے والے لوگ صرف وہی نہیں جو خدا کی ہستی کے منکر......

(Atheists) ہیں۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو یہ تو مانتے ہیں کہ کائنات میں خدا کا

صرف منکر ہی نہیں

قانون نافذ ہے لیکن اپنی معاشی زندگی کو اپنے (خودساختہ) قوانین کے تابع رکھتے ہیں۔ سورۂ عنکبوت میں ہے کہ اگر ان لوگوں سے پوچھو کہ کائنات کو کس نے پیدا کیا ہے اور چاند اور سورج کس کے قانون کے تابع مصروفِ خرام ہیں۔ تو یہ کہہ دیں گے کہ یہ سب کچھ اللہ کے قانون کے مطابق ہو رہا ہے۔ (۲۹/۶۱) اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ جب یہ لوگ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں تو ان سے پوچھو کہ تم انسان کی معاشی زندگی کے لئے قوانین کی تلاش میں اور طرف کیوں جاتے ہو؟ وہاں بھی اسی کا قانون کیوں نہیں تسلیم کرتے؟ (۲۹/۶۲) اس سے اگلی آیت میں ہے کہ اگر ان سے پوچھو کہ بارش کس کے قانون کے مطابق ہوتی ہے اور زمین سے کھیتی کس کے نظام کے ماتحت اگتی ہے تو یہ کہہ دیں گے کہ اللہ کے (۲۹/۶۳)، اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ جب یہ لوگ اس حقیقت کو بھی تسلیم کرتے ہیں تو ان سے پوچھو کہ تم انسان کی معاشی دنیا میں انسان کا خودساختہ نظریۂ حیات (جس میں ہر فرد اپنے ہی مفاد کو پیش نظر رکھتا ہے) کیوں جاری کرنا چاہتے ہو؟ اور اس نظریہ پر کیوں عمل پیرا نہیں ہوتے جس کی رو سے انسانیت کا مفادِ کلی اور انسان کے مستقبل کی زندگی کی کامرانیاں، مقصود و منطوق بنتی ہیں؟

وہ کہتا ہے کہ خدا کو ماننا ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ جن مستقل اقدار (Permanent Values) کی مظہر اس کی صفات (اسماء) ہیں، ان سب اقدار کو بنیادی اور اٹل تسلیم کیا جائے۔ اسی سے تمہاری ذات اور معاشرہ کے اندر حسن و نظم قائم رہ سکتا ہے۔ یہ انداز غلط ہے کہ اس کی بعض صفات کو آگے بڑھا دیا جائے اور دوسری صفات کو پیچھے ہٹا دیا جائے۔ یہ الحاد ہے۔ الحاد کے معنی ہیں ایک طرف ہٹ جانا (جس طرح لحد ایک طرف ہٹا کر بنائی جاتی ہے) چنانچہ سورۂ اعراف میں ہے کہ

وَلِلّٰہِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْہُ بِھَا وَذَرُوا الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اَسْمَآئِہٖ (۷/۱۸۰)

صفاتِ خداوندی میں حسن کارانہ توازن ہے۔ اس لئے اسے ان تمام صفات کے ساتھ پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو ان میں ایک طرف ہٹ جاتے ہیں۔

یعنی وہ عالمِ آفاق میں خدا کے قانون کو تسلیم کرتے ہیں لیکن عالمِ انسانیت میں دوسرے قوانین کی طرف جھک جاتے ہیں۔ یا انسان کی دنیا میں بعض شعبوں میں خدا کے قانون کو آگے رکھتے ہیں اور دوسرے شعبوں میں اس سے الگ ہو جاتے

ہیں۔ جو لوگ معاشی دنیا میں خدا کے قانون کی جگہ اپنے قوانین کو نافذ کرنا چاہتے ہیں، انہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ مفادِ خویش کے نظریہ کے ماتحت دنیاوی زیست کا ساز و سامان لہو و لعب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ حقیقی زندگی اسی نظریہ سے حاصل ہوتی ہے جس میں نگاہ مستقبل اور پوری انسانیت پر رہے۔ وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (۲۹/۶۴) لہٰذا صحیح روشِ زندگی یہ ہے کہ جس خدا کا قانون کائنات میں کارفرما ہے، اسی خدا کا قانون انسان کی معاشی اور عمرانی زندگی میں کارفرما رہے۔ وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ (۴۳/۸۴) یہ انسان کی کوتاہ نگہی ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ کائنات ایک بے جان مشینری ہے اور میں صاحبِ اختیار و ارادہ ہوں اس لئے میری معاشی زندگی پر کائناتی قوانین کیوں نافذ ہوں۔ یہ اس کی غلط بینی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ خدا کے جس قانونِ تخلیق (فطرت اللہ) کے مطابق

فطرت اللہ

باقی کائنات وجود میں آئی ہے، اسی قانون کے مطابق انسان کو بھی پیدا کیا گیا ہے (۳۰/۳۰)

اوسپنسکی کے الفاظ میں:

> یہ ناممکن ہے کہ ہم انسان کا مطالعہ کئے بغیر کائنات کا مطالعہ کر سکیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ناممکن ہے کہ ہم انسان کا مطالعہ، کائنات کا مطالعہ کئے بغیر کر سکیں۔ انسان تو کائنات کا عکس ہے۔ اس کی تخلیق انہی قوانین کی رو سے عمل میں آئی ہے جن قوانین کی رو سے کائنات کی تخلیق عمل میں آئی ہے۔ لہٰذا یہ اپنی ذات کے مطالعہ سے کائنات کا مطالعہ کر سکتا ہے۔ یعنی ان تمام قوانین کا مطالعہ جن کے تحت سلسلۂ کائنات چل رہا ہے اس کے ساتھ ہی یہ کائنات اور اسکے قوانین کا مطالعہ کرے گا جن کے تابع اس کی اپنی زندگی بسر ہونی چاہیئے۔
>
> (in search of the miraculous)

یعنی انسان کی تخلیق ان ہی قوانین کے مطابق عمل میں آئی ہے جن کے مطابق کائنات کی تخلیق ہوئی ہے۔ اللہ کے قانونِ تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ ایک محکم، بنیادی اور توازن بدوش نظام ہے لیکن اس کی کنہ و حقیقت صرف علم کے ذریعے سمجھ میں آسکتی ہے۔ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۰/۳۰) اگر تم غور کرو تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی کہ کائنات کے نظام کو قائم رکھنا، انسانی تخلیق کے مقابلے میں بہت بڑا کام ہے۔ لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

اَکْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (۴۰/۵۷) اس لیے یہ سمجھنا غلطی ہے کہ اس قدر عظیم اور محیر العقول کارگہ کائنات تو خدا کے قانون کی گرفت میں ہے لیکن انسان اپنی دنیا میں اپنے خود ساختہ قانون کو نافذ کرلے اور اس کے بعد توقع یہ رکھے کہ اس سے وہی نتائج مرتب ہوجائیں جو کائنات میں مرتب ہو رہے ہیں! یہ خیالِ خام ہے۔ قرآن واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ جو لوگ نظامِ ربوبیت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائیں اور اس کے بعد ایسا پروگرام مرتب کریں جو انسانوں میں ہمواریاں پیدا کرنے کا موجب ہو۔ اور ان کے برعکس وہ لوگ جو معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کریں تو ان دونوں کی زندگی کبھی یکساں نہیں ہوسکتی۔ جس طرح ایک اندھے اور دیکھنے والے کی زندگی ایک جیسی نہیں ہوسکتی۔ (وَمَا یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَالْبَصِیْرُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَلَا الْمُسِیْٓءُ (۴۰/۵۸)) اگر تم (اور نہیں تو کم از کم) انسانی تاریخ ہی کو سامنے رکھو تو یہ حقیقت تم پر واشگاف ہوجائے گی۔ لیکن تم تو اتنا بھی نہیں کرتے (قَلِیْلًا مَّا تَتَذَکَّرُوْنَ ۴۰/۵۸) اگر تم انسانی تاریخ کا مطالعہ کرو تو تم دیکھو گے کہ جن لوگوں نے قانونِ خداوندی سے سرکشی برتی اور ایسے پروگرام بنائے جن سے معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا ہوگئیں تو ان کی ان تدبیروں کا وبال خود ان ہی کے اوپر آپڑا۔ (اِسْتِکْبَارًا فِی الْاَرْضِ وَمَکْرَ السَّیِّیِٔ وَلَا یَحِیْقُ الْمَکْرُ السَّیِّیُٔ اِلَّا بِاَھْلِہٖ۔ ۳۵/۴۳)۔ یہ خدا کا کائناتی قانون ہے۔ یہ سنت اللہ ہے۔ اور سنت اللہ (خدا کے قانون) میں نہ کبھی تبدیلی ہوتی ہے اور نہ ہی وہ کبھی اپنی سمت بدلا کرتا ہے (وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَحْوِیْلًا ۳۵/۴۳)

لہٰذا انسان اپنے خود ساختہ معاشی نظام کی رو سے کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ کامیابی کا راز خدا کے اس قانون کی اتباع میں ہے جس میں حال اور مستقبل، فرد اور نوعِ انسان سب کی خوشگواریوں کا لحاظ رکھا گیا ہے (اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰی۔ فَلِلّٰہِ الْاٰخِرَۃُ وَالْاُوْلٰی ۵۳/۲۴-۲۵) لہٰذا جو لوگ صرف پیش پا افتادہ، مفادِ عاجلہ ہی کو سامنے رکھتے ہیں اور مستقبل کا خیال چھوڑ دیتے ہیں وہ کس طرح کامیاب ہوسکتے ہیں (کَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَۃَ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَۃَ ۷۵/۲۰-۲۱ ؛ ۷۶/۲۷ ؛ ۸۷/۱۶ ؛ ۹۲/۱۳ ؛ ۹۳/۴) جو لوگ صرف قریبی مفاد کے لئے جد و جہد کرتے ہیں، قانونِ فطرت کے مطابق انہیں ان کی کوششوں کا پورا پورا بدلہ مل جاتا ہے (۱۱/۱۵) لیکن یہ شعلۂ مستعجل ہوتا ہے۔ اس کی زندگی بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ ان معاشی فراوانیوں میں پائیداری نہیں ہوتی (۴۲/۳۶) پائیداری خدا کی ربوبیتِ عالمینی کے نظام ہی کے لئے ہے۔ (۴۲/۳۶) قریبی مفاد ہی کو پیشِ نظر رکھنے والوں کے لئے

مستقبل کی خوشگواریوں میں کوئی حصہ نہیں ہو سکتا (فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۲/۲۰۰) لیکن جو لوگ اس نظریۂ زندگی کو اپنا نصب العین بناتے ہیں، جس کی رو سے حال اور مستقبل دونوں توازن بدوش خوشگواریوں کے حامل ہو جاتے ہیں تو یہ وہ معاشرہ ہے جو تباہیوں سے بچ سکتا ہے اور اس میں ہر ایک کی محنت، صحیح صحیح نتیجہ مرتب کر سکتی ہے۔ (وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۔ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۲/۲۰۱-۲۰۲) خدا کے نظامِ ربوبیت میں حال اور مستقبل دونوں کی خوشگواریاں حاصل ہو جاتی ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے کہ

> جو صرف مفادِ عاجلہ کو چاہتا ہے تو ہم اپنے کائناتی قانون کے مطابق اسے عاجلہ مفاد دیدیتے ہیں۔ لیکن (مستقبل کی خوشگواریوں میں اس کے لئے کوئی حصہ نہیں ہوتا) اس کا انجام جہنم ہوتا ہے، جس میں وہ خاسر و ناکام اور محروم و نامراد جلتا رہتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس جو مستقبل کے مفاد پر نگاہ رکھتا ہے اور اس کے لئے پوری جدوجہد کرتا ہے اور اسے اپنی جدوجہد کے نتائج پر یقین کامل ہوتا ہے تو ان کی ساعی بھرپور نتائج کی حامل ہو جاتی ہیں۔ (۱۷/۱۸-۱۹)

سورۂ کہف میں ان دونوں نظریوں کے حاملین کا تقابل "باغ والوں کی مثال" سے کیا گیا ہے جس میں ایک شخص اپنی محنت کے نتائج اپنے خود ساختہ قوانین کے تابع رکھنا چاہتا ہے اور دوسرے کی نگاہ قانونِ خداوندی پر رہتی ہے۔ اول الذکر کو قریبی مفاد تو حاصل ہو جاتے ہیں لیکن آخر الامر اس کے حصے میں تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں رہتا (۱۸/۳۲-۴۲) اسی طرح سورۂ یونس میں کھیتی کی مثال سے بتایا کہ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ کھیتی پیدا تو خدا کے قانون کے مطابق ہوتی ہے لیکن اس کے مصرف کے لئے ان کے اپنے فیصلوں سے بلند اور کوئی قانون نہیں تو ان کھیتوں کا ایسا حشر ہو جاتا ہے کہ کوئی شخص انہیں دیکھ کر نہیں کہہ سکتا کہ ابھی کل تک ان میں کھیتی لہلہاتی تھی (۱۰/۲۴) اس تقابل کے بعد وہ کہتا ہے کہ انجام کار کی سلامتی صرف خدا کے قانونِ ربوبیتِ عامہ کے مطابق ہی مل سکتی ہے (وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ۱۰/۲۵) اسی لئے وہ بار بار کہتا ہے کہ صحیح نشو و نما کا سامان حال اور مستقبل دونوں کی ہم آہنگی ہی سے مل سکتا ہے۔

وَاِذَا قِیْلَ لَھُمُ اتَّقُوْا مَا بَیْنَ اَیْدِیْکُمْ وَمَا خَلْفَکُمْ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ (۳۶/۴۵)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ تمہارے سامنے ہے (حال کے قریبی مفاد) اور جو کچھ بعد میں آنے والا ہے (مستقبل) ان دونوں میں ہم آہنگی رکھو۔ تاکہ تمہیں وہ قالب (Pattern) مل جائے جس میں تمہاری نشو و نما ہو سکے (رحم وہ قالب جس میں جنین کی نشو و نما ہوتی ہے۔)

سورۂ بقرہ میں ہے کہ (یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ۲/۲۱۹) "یہ لوگ پوچھتے ہیں کہ نظامِ ربوبیت میں کس قدر حصہ مفادِ عامہ کے لئے کھلا رکھنا ہوگا؟ اس کے جواب میں کہا گیا کہ ان سے کہدو کہ اس میں پوچھنے کی بات کونسی ہے۔ جو کچھ تمہاری اپنی ضرورت (پرورش) سے زیادہ ہے وہ سب کا سب مفادِ عامہ کے لئے کھلا رہے گا۔ (قُلِ الْعَفْوَ ۲/۲۱۹) اس کے بعد کہا کہ" ہم ان باتوں کو اس لئے واضح طور پر بیان کرتے ہیں تاکہ تم اپنے حال اور مستقبل دونوں کو نگاہ میں رکھ سکو۔ لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْنَ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ ۲/۲۱۹) یہی وہ معاشرہ ہے جس میں انسانی زندگی اس شجرِ طیب کی طرح ہو جاتی ہے جس کی جڑیں پاتال میں ہوں اور شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں (کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُھَا فِی السَّمَآءِ ۱۴/۲۴) اور جو خدا کے قانونِ ربوبیت کے مطابق ہمیشہ پھلوں سے لدا رہے (تُؤْتِیْٓ اُکُلَھَا کُلَّ حِیْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّھَا۔ ۱۴/۲۵) اس طرح اللہ کا قانون۔ ان لوگوں کو حال اور مستقبل دونوں میں ثبات عطا کر دیتا ہے (یُثَبِّتُ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ ..... ۱۴/۲۷) اس لئے صحیح روشِ زندگی یہ ہے کہ انسان اپنی نگاہ مستقبل پر رکھے (وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۵۹/۱۸) اگر وہ ایسا کرے گا تو اس کا حال اور مستقبل دونوں روشن ہو جائیں گے (۲/۱۴۴) جو لوگ محض قریبی مفاد پر نگاہ رکھتے ہیں انہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ وہی نظریۂ زندگی خوشحالیوں کا ضامن اور باقی رہنے والا ہے جس میں نگاہ مستقبل پر رہے (بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی ۸۷/۱۶-۱۷ ؛ ۹۳/۱۳ (۹۳/۴)) یہ صرف خدا کا نظامِ ربوبیت ہے جس میں حال اور مستقبل (آغاز اور انجام) دونوں محمود ہو جاتے ہیں۔

وَھُوَ اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ لَہُ الْحَمْدُ فِی الْاُوْلٰی وَالْاٰخِرَۃِ وَلَہُ الْحُکْمُ وَاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ (۲۸/۶۹-۷۰)

قانون صرف ایک خدا کا قانون ہے۔ اس کے سوا کسی اور کا قانون نہیں۔ اسی قانون کے مطابق زندگی کا نظام

آغاز اور انجام دونوں میں محمود ہوتا ہے۔ کائنات میں ہر مقام ہی کا اقتدار (Control) ہے اس لئے تمہاری زندگی کی ہر حرکت کو بھی اس کے گرد گھومنا ہوگا۔

یعنی تم کسی طرح بھی اس کے قانون کی گرفت سے نکل نہیں سکتے۔ اس کا قانون یہ ہے کہ اگر یوں زندگی بسر کرو تو اس کے نتائج یہ ہوں گے۔ اور اگر دوسری طرح زندگی بسر کرو تو اس کے نتائج وہ ہوں گے۔ یہ تو تمہارے اختیار میں ہے کہ تم کس قسم کی زندگی بسر کرو۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ تم زندگی ایک نہج کی بسر کرو اور اس کے نتائج دوسری قسم کے برآمد ہو جائیں ایسا ہونا ناممکن ہے۔

یہ ہے قرآن کا نظامِ ربوبیت۔

باب ششم

ایک بنیادی اعتراض ــــ حقِ ملکیت

گذشتہ صفحات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ایک نظریۂ زندگی وہ ہے جس کی رو سے ہر انسان اپنے اپنے مفاد کا تحفظ چاہتا ہے۔ اسے دوسرے کے مفاد سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ دوسرا نظریۂ زندگی وہ ہے جس کے مطابق ہر شخص نوعِ انسانی کی ربوبیت کی فکر کرتا ہے اور رزق کے سرچشموں کو عام کرنے کے لئے مصروفِ سعی و عمل رہتا ہے چونکہ تحفظِ خویش (Preservation Of Self) کا جذبہ حیوانات کی جبلّت (Instinct) میں داخل ہے اس لئے ایسا دکھائی دیتا ہے گویا پہلا نظریۂ زندگی انسان کی "فطرت" میں داخل ہے۔ ہر شخص اپنے ذاتی مفاد کی طرف لپکتا ہے۔ اس کی عقل اسے ہر وقت اسی پر آمادہ کرتی رہتی ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں عقلِ بیباک کا نام ابلیس یا شیطان ہے (یعنی وہ عقل جو خدا کے قوانین کی روشنی میں نہیں چلتی بلکہ خود اپنے انفرادی مفاد کے تقاضوں کی رُو سے فیصلے کرتی ہے) اس عقل کا مسلسل وعظ یہ ہوتا ہے کہ تم زیادہ سے زیادہ سمیٹ کر اپنے پاس جمع رکھو۔ اگر تم نے اپنی محنت کی کمائی دوسروں کو دیدی تو تم تنگدست ہو جاؤ گے۔

عقل کا تقاضا

اور وقت پڑنے پر پچھتاؤ گے۔ اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَ یَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ[۱] (۲/۲۶۹) شیطان تمہیں محتاجی کے

---

[۱] فَحْشَآء کے معنی بخل (یعنی سمیٹ کر اپنے لئے جمع رکھنے) کے ہیں۔ چونکہ اس نظریۂ زندگی کے ماتحت انسان کے اندر ایسی کمینہ خصلات پیدا ہو جاتی ہیں جو عربوں جیسی کشادہ ظرف ذہنیت کے نزدیک شرافت کے یکسر منافی تھیں، اس لئے انہوں نے بے حیائیوں کے لئے بھی اس لفظ فحش کا استعمال کیا۔

خوف سے ڈراتا رہتا ہے اور اس طرح بخل کا تقاضا کرتا رہتا ہے۔ یہ عقلِ خود بیں (شیطان) انسان کے اموال و اولاد میں دخیل کار ہو جاتی ہے (وَشَارِكْهُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ۔ ۱۷/۶۴) اور اس طرح نسلِ انسانی کی نکیل پکڑ کر اسے جس طرف چاہتی ہے لیئے لیئے پھرتی ہے (لَأَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهُ إِلَّا قَلِيلًا ۱۷/۶۲)۔ حنک کا لفظ غور طلب ہے۔ جب کسی جانور، گدھے یا گھوڑے کو لگام نہ دی جائے بلکہ اس کے منہ کو رسی سے کس کر باندھ دیا جائے اور پھر اس رسی کو آگے سے پکڑ کر اسے کھینچا جائے تو اسے احتناک کہتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ عقلِ خود بیں انسان کے منہ کو مفادِ خویش کی رسی سے باندھ کر جہاں جی چاہے کشاں کشاں لئے پھرتی ہے۔ اندریں حالات انسان کے دل سے یہ خیال نکال کر، اسے اس پر آمادہ کرنا کہ وہ مفادِ خویش کی بجائے "مفادِ ہمہ" کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائے، یعنی اپنی عقل کو خود بینی کی بجائے جہاں بینی[1] سکھائے بڑا ہمت طلب مرحلہ ہے۔ ایسا ہمت طلب کہ قرآن نے اسے "نہایت بلند، دشوار گذار پہاڑ پر چڑھنے سے تعبیر کیا ہے (فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۹۰/۱۱)۔

انسان کی عقل اپنے اس مسلک کے جواز میں سب سے بڑی دلیل یہ پیش کرتی ہے کہ مختلف انسانوں میں کمانے کی استعداد (Earning Capacity) مختلف ہوتی ہے۔ جو شخص زیادہ کماتا ہے اسے اپنی کمائی پر پورا پورا حق ملکیت حاصل ہونا چاہیئے۔ اس سے اس کی کمائی چھین کر دوسروں کو دیدینا، ظلم اور غصب ہے۔ جو شخص دن میں بیس روپے کماتا ہے، اس سے یہ کہنا کہ تم چار روپے رکھو، اور سولہ روپے دوسروں کو دیدو، اگر جور و استبداد نہیں تو اور کیا ہے! حق و انصاف کا کونسا قانون ہے جس کی رو سے آپ اس کی محنت کا ماحصل چھین سکتے ہیں۔ اگر وہ اپنی کمائی میں سے کچھ رقم خیرات کرنا چاہے تو یہ اور بات ہے۔ آپ اس کے حق ملکیت میں تصرف نہیں کر سکتے!

سرمایہ پرستی کی دلیل

آپ غور کریں گے تو یہ حقیقت آپ کے سامنے آجائے گی کہ مفاد پرستی اور سرمایہ داری کے پورے نظام کی عمارت اسی "دلیل" پر قائم ہوئی ہے۔ قرآن نے (بنی اسرائیل کے) قارون کو نظامِ سرمایہ داری کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ سورۂ قصص میں ہے کہ جب اس پر اعتراض کیا جاتا کہ اس کے پاس اس کی اس روش کا کیا جواز (Justification) ہے کہ اس نے اس قدر دولت کے

---

[1] عقل خود بیں دگر و عقل جہاں بیں دگر است　(اقبال)

خزانے بھر رکھے ہیں اور غریب بھوکے مر رہے ہیں۔ تو وہ اس کے جواب میں کہتا

إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِي (۲۸/۷۸)

میں نے جو کچھ کمایا ہے اپنی ہنرمندی سے کمایا ہے۔

اس لئے کسی کو کیا حق ہے کہ میری ملکیت میں دست اندازی کرے! قرآن کہتا ہے کہ یہی دلیل ہر مفاد پرست اور سرمایہ دار گروہ پیش کرتا چلا آرہا ہے اور یہی دلیل اس تمام فتنہ و فساد کی جڑ ہے (بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ ۚ قَدْ قَالَهَا الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۳۹/۴۹-۵۰ نیز ۳۴/۳۵ : ۱۶/۵۳) قرآن نہایت حسن و خوبی سے اس دلیل کا تجزیہ کرتا ہے اور حقائق کو سامنے لاکر اس کی کمزوری کو بے نقاب کرتا ہے۔ سنئے اس باب میں وہ کیا کہتا ہے۔

ذرا غور کرو۔ تم بھی صبح سے شام تک کام کرتے ہو اور ایک مزدور بھی صبح سے شام تک کام کرتا ہے۔ تمہارا دن بھر کا کام اتنا پیدا کرتا ہے جس کی قیمت (مثلاً) بیس روپے ہے اور مزدور اتنا پیدا کرتا ہے جس کی قیمت (مثلاً) دو روپے ہے[1]۔ تم دونوں کی کمائی میں دو عنصر شامل ہیں (i) محنت اور (ii) کمائی کی استعداد کا فرق۔ شق (i) دونوں میں مشترک ہے فرق شق (ii) میں ہے اور یہی فرق کی بنا پر تمہاری پیداوار (Production) کی قیمت (مزدور کی پیداوار سے) اٹھارہ روپے زیادہ ہے۔ تم کہتے ہو کہ تمہاری استعداد کی زیادتی، تمہاری اپنی ہے اس لئے اس سے پیداشدہ کمائی بھی تمہاری اپنی ہونی چاہیئے۔ اس دلیل کی بنا پر تم اس زائد کمائی کو اپنی ملکیت میں رکھتے ہو۔ اس سے سرمایہ جمع ہو جاتا ہے۔ اس سرمایہ سے تم بہت سی چیزوں کو خرید کر اپنی ملکیت میں لے آتے ہو (مثلاً زمین۔ وسائل آبپاشی۔ بہترین رہائش کے اسباب و ذرائع وغیرہ) اس سے تمہاری آمدنی اور زیادہ ہو جاتی ہے [پھر یہی جمع شدہ سرمایہ تمہاری اولاد کو ورثتاً مل جاتا ہے۔ انہیں نہ محنت کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ ہی کمانے کی استعداد کی حاجت۔ وہ بغیر کام کئے اس سرمایہ پر عیش کرتے ہیں لہذا اس دلیل کی ابتدا اسی سے ہوتی ہے کہ جس شخص میں کمانے کی استعداد زیادہ ہے اسے اپنی زیادہ کمائی پر حق ملکیت حاصل ہے]

[1] اس وقت ہمیں اس مسئلہ سے بحث نہیں کہ یہ قیمتیں بھی خود معاشرہ ہی کی متعین کردہ ہوتی ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ ذرا ان دونوں چیزوں کا تجزیہ کرو۔ یعنی (i) تمہاری ذہنی استعداد اور (ii) سرمایہ کے ذریعے خرید کردہ وسائلِ پیداوار۔ اور پھر دیکھو کہ ان میں تمہارا حصہ کس قدر ہے!

ایک انسان کی ذہنی استعداد کی تخلیق و تعمیر میں حسبِ ذیل عناصر کارفرما ہوتے ہیں۔

(i) دماغی خلیات (Brain-Cells) کی ساخت جس کا تعلق پیدائش سے ہے۔

(ii) ابتدائی ماحول

(iii) تعلیم و تربیت

(iv) ذہنی استعداد کے استعمال کے موزوں مواقع (Opportunitiss)

ان سب کا تعلق اس معاشرے سے ہے جس میں بچہ پیدا ہوتا ہے۔

آپ غور کیجئے کہ ان تمام عناصر میں سے وہ کونسا عنصر ہے جو آپ کا اپنا پیدا کردہ ہے۔ یا جس میں آپ کے کسب و ہنر کا دخل ہے؟ اگر آپ کا دماغ اچھا ہے تو یہ چیز آپ کی اپنی پیدا کردہ نہیں بلکہ وہبی ہے (یا یوں کہئے کہ پیدائشی ہے)۔ اگر آپ کی تربیت اچھے ماحول میں ہوئی ہے تو اس میں بھی آپ کی ذاتی کاریگری (تو ایک طرف اختیار و ارادہ) کو بھی کوئی دخل نہیں۔ اگر اتفاق سے آپ کا ماحول خراب ہوتا تو آپ کیا کر لیتے؟ اسی طرح، اگر آپ کی تعلیم کے لئے اچھی درسگاہیں موجود تھیں تو اس میں بھی آپ کی اپنی کاریگری کا کوئی دخل نہیں۔ اگر اس علاقے میں، جہاں آپ پیدا ہوئے تھے کوئی اسکول ہی نہ ہوتا یا اسکول میں تعلیم کا اچھا انتظام نہ ہوتا تو آپ کی تعلیم ناقص رہ جاتی۔

اب لیجئے وہ وسائلِ پیداوار جنہیں آپ اپنے سرمایہ سے خرید کر ان کے اجارہ دار بن جاتے ہیں۔ ان میں سب سے بنیادی وسیلہ ارض (زمین) ہے۔ [یہی وجہ ہے کہ قرآن نے معاشی زندگی کے لئے بھی

ؔ اس لئے وہ کہتا ہے کہ انسان کو اس قابل ہمیں نے بنایا ہے کہ وہ علم حاصل کر سکے۔ (۹۶/۵) لیکن انسان اس کے بعد خود ہمارے قانون ہی سے سرکشی اختیار کر لیتا ہے (۹۶/۶) اور اپنے علم و ہنرمندی کی بنا پر اپنے آپ کو مستغنی تصور کرنے لگ جاتا ہے۔ (۹۶/۷)

ارض کی اصطلاح استعمال کی ہے کیونکہ تمام معاشی وسائل کی اُم (ماں) ارض ہی ہے] - قرآن کہتا ہے کہ یہ بتاؤ کہ ارض کی تخلیق اور اس کے ذریعہ رزق ہونے میں تمہاری ہنرمندی کو کیا دخل ہے ؟ یہی صورت پانی، حرارت روشنی ہوا، معدنیات وغیرہ کی ہے۔ قرآن نے اس بنیادی حقیقت کو اپنے مخصوص دل کش انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ذرا اس کھیتی پر غور کرو جس کے ماحصل کے تم واحد مالک بننا چاہتے ہو (اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ 56/63) تم اتنا ہی کرتے ہو نا! کہ ہل چلا کر بیج ڈال دیتے ہو۔ اس کے بعد، کیا یہ قوت بھی تمہیں حاصل ہے کہ اس بیج کو زمین سے اگا کر پودا بنا دو؟ کیا یہ کچھ تم کرتے ہو؟ یہ ہمارا قانون کرتا ہے جس پر تمہیں کوئی قدرت حاصل نہیں۔ (ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ 56/64) اگر ہم اس کھیتی کو پروان نہ چڑھائیں اور اسے پکنے سے پہلے ہی چورا چورا کر دیں (جیسا کہ خشک سالی یا دیگر حوادث سے اکثر ہو جاتا ہے) تو فصل کا گھر لے جانا تو ایک طرف، تمہاری محنت اور بیج کی قیمت کی بھی تم پر چٹی پڑ جائے

اس میں تمہارا حصہ کتنا ہے؟

(لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ - اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ 56/65-66) اس سے آگے بڑھو اور اس پانی پر غور کرو جس پر تمہاری فصلوں کا اور خود تمہاری اپنی زندگی کا دار و مدار ہے (اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ 56/68) کیا اس پانی کو تم بادلوں سے برساتے ہو یا ہمارا قانون برساتا ہے۔ (ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ 56/69) فرض کرو ہم ایسا انتظام نہ کرتے کہ سورج کی شعاعیں عملِ کشید سے صاف اور مقطر پانی اوپر لے جائیں اور سمندر کے تمام نمک (جس سے اس کا پانی نہ پینے کے قابل ہوتا ہے اور نہ ہی زراعت کے کام آسکتا ہے) سمندر ہی میں باقی رہ جائے تو بتاؤ اس میں تم کیا کر لیتے (لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ 56/70) اور آگے بڑھئے اور اس آگ پر غور کیجئے جس پر کھانے پینے کی اشیاء اور زندگی کا دار و مدار ہے کیا اس میں حرارت تمہاری پیدا کردہ ہے یا ہماری؟ (اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ 56/71) کیا یہ درخت تمہاری ہنرمندی سے پیدا ہوئے ہیں جن سے آگ روشن کی جاتی ہے؟ (ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُوْنَ۔ 56/72) ذرا سوچو کہ اس سارے کاروبار میں تمہاری ہنرمندی اور کاریگری کا کتنا دخل ہے اور ہمارے کائناتی قانونِ ربوبیت کا کس قدر حصہ ہے؟ سوچو کہ

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟ کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟ خاک یہ کس کی ہے۔ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟ موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟

یہ سب کچھ ہمارے قانون کا کیا ہوا ہے۔ اس میں تمہاری صرف محنت تھی۔ باقی سب کچھ ہمارا تھا۔ اب بات یوں بنی کہ یہ ایک مشترکہ کاروبار تھا۔ جس میں تمہاری محنت تھی اور ہمارا سرمایہ (capital) اس کاروبار کے منافع (پیداوار) کو اسی نسبت سے بانٹ لینا چاہیئے۔ تم اپنی محنت کا معاوضہ لے لو اور ہمیں ہمارے سرمایہ کا حصہ دیدو ہم نے اپنا حصہ، انسانیت کی ربوبیت عامہ کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ اس لئے اسے ان تک پہنچا دو (نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ۔ ۵۶/۷۳) ہم نے اسے بھوکوں کے لئے وقف کر رکھا ہے (مقوین کے یہی معنی ہیں) اور اس حقیقت کو اس لئے بیان کیا ہے کہ تم اسے ہمیشہ نگاہوں کے سامنے رکھو] اور اس طرح خدا کی ربوبیت عامہ (عظیم ربوبیت) کے قیام و استحکام میں سرگرم عمل رہو (فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ۵۶/۷۴)[1] سبح کے معنی ہیں پوری پوری ہمت اور توانائی سے سرگرم عمل رہنا۔ اسم کے معنی ہیں " خدا کی صفت " یعنی اپنے اللہ کی عظیم ربوبیت کی صفت کو مشہود کرنے کے لئے سرگرم عمل رہو۔

اسی طرح سورۂ عبس میں ہے کہ انسان ذرا اپنی خوراک پر غور کرے جس پر اس کی زندگی کا دارومدار ہے۔

---

[1] قرآن میں رَبِّكَ الْعَظِيْمِ اور رَبِّكَ الْاَعْلٰى کی اصطلاحات غور طلب ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ تم میں سے ہر شخص اپنی اپنی پرورش کی فکر کرتا ہے یا اپنے بال بچوں کی پرورش کی فکر۔ یہ بھی ربوبیت ہے۔ لیکن اس ربوبیت میں انسان اور حیوان سب برابر ہیں۔ حیوان بھی اپنی اور اپنے بچوں کی پرورش کرتے ہیں۔ لہٰذا اس ربوبیت کی سطح بہت نیچی ہے۔ اس کا دائرہ بہت تنگ ہے۔ یہ ربوبیت صغریٰ یا ربوبیت ادنیٰ ہے۔ اس کے برعکس خدا کی ربوبیت میں تمام نوعِ انسانی کی ربوبیت شامل ہے (وہ رب العالمین ہے) اس لئے اس کی ربوبیت عظیم اور اعلیٰ ہے۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ تمہیں اس کی صفتِ ربوبیت عظمیٰ یا ربوبیت اعلیٰ کا مظہر بننا چاہیئے (سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى۔ یا سبح باسم ربک العظیم) یعنی نظام ربوبیت کے قیام میں سرگرم عمل رہنا چاہیئے۔

اور سوچے کہ اس میں کس قدر حصہ اس کی کاریگری کا ہے اور کتنا حصہ ہمارا ہے (فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ إِلَىٰ طَعَامِهِ) ہمارا قانونِ ربوبیت بارش برساتا ہے۔ پھر اسی قانون کے مطابق زمین پھٹتی ہے اور اس میں سے کونپل پھوٹتی ہے (۸۰/۲۴-۲۷) پھر اس سے بالیں بنتی ہیں اور ان میں دانے پڑتے ہیں۔ پھر اس طرح انگور اور ترکاریاں، زیتون اور کھجور اور طرح طرح کے پھلوں کے گھنے باغات اور چارہ پیدا ہوتا ہے (۸۰/۲۵-۳۱) یہ پھل اور چارہ کس مقصد کے لئے ہے تمہاری اور تمہارے مویشیوں کی پرورش کے لئے (مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ ۸۰/۳۲) (نیز دیکھئے ۳۶/۳۵ ؛ ۲۳/۱۲-۱۸ ؛ ۱۴/۳۲)۔

سورۂ ق میں ہے کہ ہم نے زمین کو اس طرح پھیلا دیا اور اس میں پہاڑ پیدا کر دیئے۔ اور اس نظام زراعت و آب رسانی کے ذریعے طرح طرح کی خوشنما چیزیں اگا دیں۔ اس نظام میں ہر شخص کے لئے جو اپنی توجہات کو اس طرف منعطف کرے گا سامانِ بصیرت و تذکیر ہے (۵۰/۷-۸)۔ پھر ہم نے بادلوں سے مینہ برسایا جس سے بڑے بڑے باغات اگائے اور کھیتی بھی۔ نیز کھجوروں کے تہ بہ تہ خوشے۔ یہ سب کچھ انسانوں کی پرورش کے لئے ہے (رِزْقًا لِّلْعِبَادِ ۵۰/۱۱)۔

ان حقائق کو سامنے لانے کے بعد قرآن ایک سوال کرتا ہے اور وہ یہ کہ بتاؤ کہ تمام وسائل معیشت کس کے پیدا کردہ ہیں؟ (أَمَّنْ هَٰذَا الَّذِي يَرْزُقُكُمْ ۶۷/۲۱) اور اس کے بعد کہتا ہے کہ یہ بتاؤ کہ اگر وہ اس رزق کو روک لے تو تمہاری ہنرمندی کیا کرے؟ (إِنْ أَمْسَكَ رِزْقَهُ ۶۷/۲۱) اگر وہ ایک پانی ہی کو نیچے لے جائے اور سطح زمین سے اوپر نہ آنے دے تو تم کیا کر لو (۶۷/۳۰) وہ کہتا ہے کہ سوچو کہ یہ بات کس قدر صاف اور واضح ہے۔ ہم نے زمین کو پھیلایا۔ ہم نے آسمان کو بلند کیا اور اس میں سے پانی برسایا۔ ہم نے اس میں سے پھل اور غذا کی دوسری چیزیں پیدا کیں (۲/۲۲) یہ سب کچھ تو ہم نے کیا لیکن تم ہو کہ بجائے اس کے کہ اس متاع (سامانِ معیشت) کو ہمارے قانونِ ربوبیت کے مطابق استعمال میں لاؤ، اس قانون کی بجائے اپنے ہی قاعدے اور قانون بنا لیتے ہو اور رزق کی تقسیم ان کے مطابق کرنے لگ جاتے ہو؟ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَندَادًا وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ (۲/۲۲)

اپنا حصہ لے لو

اس تمام کاروبار میں تمہارا حصہ محنت کا ہے۔ وہ تم لے لو اور باقی حصہ ہمارے سرمایہ کا ہے وہ ہمیں دے دو (وَآتُوا حَقَّهُ

يَوْمَ حَصَادِهٖ (6/142) سورۂ حجر میں ہے کہ اس پیداوار میں صرف تمہارے لئے ہی سامانِ معیشت نہیں بلکہ ان کے لئے بھی ہے جن کے متعلق تم (بزعم خویش اپنے معاشی نظام کے ماتحت) سمجھتے ہو کہ ان کا اس میں کچھ حق نہیں؛ (وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرَازِقِيْنَ 15/20) ہم نے اس سامانِ معیشت کو تمام نوعِ انسانی (بلکہ انسان کے علاوہ دوسری مخلوق) کے لئے وجہِ ربوبیت بنایا ہے (وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ 55/10) اور اس کے ساتھ ہی میزان (خدا کا وہ ضابطۂ قوانین جس کی رو سے رزق کی صحیح صحیح تقسیم ہوتی ہے اور معاشرہ کا توازن قائم رہتا ہے) بھی بھیجی ہے۔ اس لئے میزان کو انصاف کے ساتھ قائم رکھو اور کسی کے حصے میں کمی بیشی نہ کرو (وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ 55/9)۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آ گئی کہ وسائلِ پیداوار خدا کی بخشائش ہیں جن کا مقصد تمام نوعِ انسانی کی ربوبیت ہے۔ اس لئے کسی کو حق نہیں کہ ان کی حد بندی کر کے انہیں اپنی ملکیت میں لے لے۔

وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (17/21)

اور جو کچھ تیرے رب کی طرف سے بطور بخشش عطا ہوا ہے اسے روکا نہیں جا سکتا۔

زمین کی انفرادی ملکیت جائز نہیں

یہ ظاہر ہے کہ ان معاشی وسائل میں جو خدا کی طرف سے بطور بخشش (تمام نوعِ انسانی کو مفت) عطا ہوئے ہیں، زمین کی حیثیت بنیادی ہے۔ اس لئے زمین کے متعلق اور بھی واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ اسے عام ضرورتمندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے۔ اس پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ سورۃ حٰم السجدہ میں ہے:

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (41/9)

اُن سے کہہ دو کہ کیا تم اس خدا کے قانونِ ربوبیت سے انکار کرنا چاہتے ہو جس نے زمین کو دو مدارج ... (Periods) میں (ربیہ پیدائش کے تابع) بنایا۔ اس لئے کہ وہ تمام کائنات کا ربوبیت کرنے والا ہے۔ لیکن تم اپنے قوانین کو اس کے قانونِ ربوبیت کا ہمسر بنا دیتے ہو؟

اس کے بعد ہے۔

وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِن فَوْقِهَا وَبَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِّلسَّائِلِينَ (۴۱/۱۰) (نیز ۱۵/۱۹-۲۰؛ ۳۱/۴۱-۳۲)

اور اس نے اس کے اوپر پہاڑ کھڑے کر دیئے (تاکہ آب رسانی کا سلسلہ ٹھیک ٹھیک کام کرے) اور زمین میں سامانِ رزق کی بہتات پیدا کر دی۔ اور چار موسموں میں اس کی پیداوار کے اندازے مقرر کر دیئے۔ تمام ضرورتمندوں کے لئے یکساں طور پر۔

یہ بنیادی ذریعہ پیداوار (زمین) خدا کی طرف سے بلاقیمت عطا ہوئی ہے تاکہ اس سے تمام نوعِ انسانی کی پرورش ہو سکے۔ زمین پر لکیریں کھینچ کھینچ کر اسے ذاتی ملکیت قرار دے لینا، خدا کے خلاف سرکشی اور اس کے قانونِ ربوبیت سے بغاوت ہے۔ جو کچھ خدا کی طرف سے بلامزد و معاوضہ تمام انسانوں کو یکساں طور پر ملا ہے، قرآن کی رو سے اُن پر انفرادی ملکیت کا تصور ہی باطل ہے۔ ہوا۔ پانی۔ روشنی۔ حرارت۔ زمین۔ سب انسانی زندگی اور اس کی پرورش کے اسباب و ذرائع ہیں، جو خدا کی صفتِ ربوبیت کی وجہ سے مفت عطا ہوئے ہیں۔ انہیں انسانوں کی پرورش کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے۔

اس حقیقت کو پھر دہرایئے کہ انسان کی کمائی میں تین عناصر شامل ہوتے ہیں۔[1]

(i) وسائلِ پیداوار

(ii) ذہنی استعداد

(iii) محنت

انہیں نمبروار نیچے سے اوپر لیجئے۔

محنت کا صلہ

محنت کے معنی ہیں اپنی وسعت کے مطابق پوری پوری کوشش کرنا۔ اس میں تین قسم کے افراد آ جائیں گے:

[1] چونکہ سرمایہ، کمائی کی جمع شدہ شکل کا نام ہوتا ہے اس لئے اسے ان عناصر میں شامل نہیں کیا گیا۔

(i) وہ افراد معاشرہ جو اس کام کی سر انجام دہی میں جو ان کے سپرد کر دیا جائے اپنی وسعت کے مطابق پوری پوری کوشش کریں۔

(ii) وہ لوگ جو وسعت کے باوجود محنت نہ کریں۔

(iii) وہ لوگ جو کسی حادثہ یا پیدائشی نقص کی وجہ سے محنت سے معذور ہو جائیں۔

ظاہر ہے کہ شق (i) کے تمام افراد، محنت کے معاوضے میں یکساں ہوں گے۔ (فرق اکتسابی استعداد کا ہوگا جس کا ذکر بعد میں آئے گا) ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت نہیں ہوگی۔ اگر ایک مزدور، اپنی وسعت کے مطابق باہر میدان میں چھ گھنٹے کام کرتا ہے اور ایک انجینیر میز پر بیٹھا، اپنی وسعت کے مطابق چھ گھنٹے کام کرتا ہے، تو جہاں تک ان کی محنت کا تعلق ہے دونوں برابر ہیں۔ اس لئے دونوں (اپنی محنت کے لئے) یکساں معاوضے کے مستحق ہیں۔

شق (ii) کے لوگ کسی معاوضے کے مستحق نہیں۔ (اگر وہ وسعت کے باوجود کم محنت کرتے ہیں تو وہ کم معاوضے کے مستحق ہوں گے)۔ اس لئے کہ (لَيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ ۵۳/۳۹) (معاوضہ بمقدار محنت) کائنات کا قانون ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص محنت نہ کرے اور اس کی ذمہ داریوں کا بوجھ دوسرے لوگ اٹھائیں۔ أَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۵۳/۳۸) کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔ یہی عدل کا تقاضا ہے۔ قرآنی نظام ربوبیت میں ان مترفین کے لئے کوئی جگہ نہیں جو استطاعت کے باوجود محنت نہ کریں اور دوسروں کی محنت پر گزارہ کرنا چاہیں۔ اس نظام میں میسرہ کھیلنا جائز ہے۔ اس لفظ کا مادہ یُسر ہے۔ لہٰذا میسرہ کے معنی ہیں آسانی سے ہاتھ آجانے والا مال (ایسا مال جو آسانی سے ہاتھ آجائے)۔ یعنی دولت بلا محنت۔

اب رہے تیسری شق کے لوگ۔ سو عدل کی رو سے یہ کسی معاوضے کے مستحق نہیں۔ لیکن قرآن کے نظام ربوبیت میں عدل کے ساتھ احسان بھی ہے۔ احسان کے معنی یہ ہیں کہ معاشرے میں جہاں کہیں (جس شخص میں) کوئی کمی (Deffieieney) آجائے اس کمی کو پورا کر کے، معاشرے کے توازن (حسن) کو قائم رکھا جائے۔

اکتسابی استعداد

یہ تو صورت ہوئی محنت کے اعتبار سے اب اکتسابی استعداد (Earning Capacity) اور ضروریاتِ زندگی کو لیجئے اس کی رُو سے بھی افرادِ معاشرہ کی تین شقیں ہو جائیں گی:۔

(i) وہ لوگ جو اپنی استعداد کی زیادتی کی وجہ سے، اپنی ضروریات سے زیادہ پیدا کر لیں۔

(ii) وہ لوگ جو استعداد کی کمی کی بنا پر اپنی ضروریات سے کم پیدا کر سکیں۔

(iii) وہ لوگ جو فقدانِ استعداد کی بنا پر کچھ بھی پیدا نہ کر سکیں (یاد رہے کہ وہ طبقہ جو استعداد کے باوجود محنت نہ کرے، خارج از بحث ہے۔)

قرآن کہتا ہے کہ استعداد کی زیادتی، تمہاری اپنی پیدا کردہ نہیں۔ اس کے اسباب و علل، تمہاری ذاتی حدود امکان سے باہر تھے (وَمَا بِكُم مِّن نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ ۱۶/۵۳) اس لئے اس پیداوار کے تم بطور استحقاق مالک نہیں ہو سکتے۔ (وَاللَّهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۱۶/۷۱) تمہیں حصولِ رزق کی استعداد میں ایک دوسرے پہ جو فضیلت حاصل ہے وہ ہماری طرف سے ہے۔ اس لئے اس استعداد کے ما حصل کے بھی "ہم" مالک ہیں۔ یہ فاضلہ پیداوار، ہمارے قانونِ ربوبیت کے مطابق صرف ہوگی۔ اس کا مصرف شق نمبر (ii) کے لوگ ہیں (جنہیں قرآن کی اصطلاح میں سائل کہا جاتا ہے۔ یعنی ضرورتمند) اور شق نمبر (iii) کے لوگ (جنہیں قرآن محروم کہہ کر پکارتا ہے)

وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ (۵۱/۱۹)

اُن کے مال میں سائل اور محروم کا حق ہے۔

"ان کے مال میں سائل و محروم کا حق ہے" حق کے لفظ پہ غور کیجئے۔ یعنی یہ لوگ اس مال کو بطور حق[1] (as of Right) طلب کر سکتے ہیں۔ بطور خیرات نہیں بلکہ بطور استحقاق۔ اس لئے کہ یہ مال جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے "خدا" کی ملکیت ہے اور خدا نے اسے "سائل و محروم" کے لئے مختص کر رکھا ہے۔

وسائلِ پیداوار

اب رہا تیسرا عنصر یعنی وسائلِ پیداوار۔ سو ان کے متعلق ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہ سب "نعمۃ من اللہ" ہیں۔ اس لئے ان پر کسی کے حق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یہی وجہ ہے

---

[1] قرآن میں باطل کے مقابلہ میں بھی حق کا لفظ آیا ہے۔ اور جو چیز بطور استحقاق مل جائے اس کے لئے بھی حق کا لفظ آیا ہے۔ انگریزی زبان میں بھی (wrong) کے مقابلہ میں (Right) ہے اور یہی لفظ (Right) استحقاق کیلئے ہے۔

کہ قرآن کہتا ہے کہ تم اسے ربوبیت عامہ کے لئے کھلا کیوں نہیں رکھتے۔ (وَمَا لَكُمْ أَلَّا تُنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ ۵۷/۱۰)
کیونکہ ارض و سما کی میراث خدا ہی کی ہے تمہاری نہیں۔

وَلِلّٰهِ مِيرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (۵۷/۱۰)

اب اس بنیادی اعتراض کو پھر سامنے لائیے جس سے آغازِ سخن ہوا تھا یعنی جن لوگوں میں کمانے کی استعداد زیادہ ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ ہماری اپنی ہنرمندی کا نتیجہ ہے (اوتیتہ علیٰ علم عندی) اس لئے ہم اس کے مالک ہیں۔ اور چونکہ ہم اسی سرمایہ سے زمینیں اور جائدادیں خرید (اوربنا) لیتے ہیں، اس لئے ہم اُن کے بھی "جائز" مالک ہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، سرمایہ داری کے نظام کی ساری بنیاد اسی "دلیل" پر قائم ہے۔ اس "دلیل" کو سامنے رکھئے اور اس کے بعد اس جواب کو جو قرآن نے دیا ہے۔ بات بالکل واضح ہوجائے گی۔

استعداد میں تفاوت کیوں ہے؟

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ذہنی استعداد کے ماحصل کا مالک انھیں متعلقہ نہیں ہوتا تو انسانوں میں اس قدر ذہنی تفاوت رکھا کیوں گیا ہے؟ اللہ نے تمام انسانوں کو ایک سی ذہنی استعداد کیوں نہیں دیدی تاکہ معاشی ناہمواریوں کا سوال ہی پیدا نہ ہو۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ قرآن اس سوال کا جواب بھی دیتا ہے۔

آپ حیوانات کو دیکھئے۔ ان کی کسی ایک نوع میں استعداد کا فرق نہیں ہوتا۔ مثلاً تمام ہرن ایک جیسی استعداد رکھتے ہیں۔ اس لئے ان میں معاشی ناہمواریوں کا تصور نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی دیکھئے کہ ان کی زندگی کا مقصد سوائے جینے اور مرجانے کے کیا ہوتا ہے؟ (زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ افزائشِ نسل کر کے مرجاتے ہیں)۔ وہ جس حالت میں دنیا میں آتے ہیں، دنیا کو اسی حال میں چھوڑ کر مرجاتے ہیں۔ وہ دنیا کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا کر سکتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انسان کو قوتِ تخلیق (creative-Faculties) بھی دی ہیں۔ وہ دنیا میں آتا ہے اور اپنی قوتِ تخلیق سے دنیا کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے۔ یہ انسان کی قوتِ تخلیق ہی کے کرشمے ہیں کہ یہ مٹی کا گھروندا اس قدر متنوع جاذبیتوں اور حسین وجمیل مرصع کاریوں کا مجموعہ بن رہا ہے۔ انسان فطرت کی خام پیداوار کو لیتا ہے اور اپنی ندرت کاریوں سے اسے ایک نئی

دنیا میں تبدیل کر دیتا ہے۔ لیکن آپ غور کیجئے کہ ان تخلیقی مراحل (Creative Process) میں کس قدر مختلف نوعیتوں کے کام درپیش ہوتے ہیں۔ کوئی کام لیجئے۔ اس میں پہلا مرحلہ تدبیر (Planning) کا ہوگا ظاہر ہے کہ اس کے لئے قوتِ فکر کی ضرورت ہوگی۔ اس کے بعد اگلا مرحلہ اس تدبیر (Plan) کو بروئے کار لانے (Execute کرنے) کا ہوگا۔ اس کے لئے جسمانی قوتوں (Physical Labour) کی زیادہ ضرورت ہوگی۔ اگر تمام انسانوں کی استعداد ایک جیسی ہو، تو دنیا میں تقسیمِ عمل (Division of labour) ناممکن ہو جائے۔ یہ ہے وہ مقصد جس کے لئے مختلف افراد کی استعداد میں فرق ہے۔

وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُم بَعْضًا سُخْرِيًّا (۴۳/۳۲)

اور ہم نے مدارج کا یہ اختلاف اس لئے رکھا ہے تاکہ معاشرے کے تمام افراد ایک دوسرے کے ساتھ بندھے ہوئے (Knitted together) چلیں۔

قرآن کا یہ دعویٰ کہ ذہنی استعداد کا اختلاف، تقسیمِ کار کا موجب اور انسانی دنیا میں تخلیقی ندرت کا ذریعہ بنا ہوا ہے۔ ایک ایسی حقیقت ہے جسے ہر جگہ تسلیم کیا جاتا ہے (MUMFORD) اپنی کتاب (The conduct of Life) میں لکھتا ہے کہ

> ارسطاطالیس نے کہا ہے کہ نوعِ انسان ایسے افراد کا مجموعہ ہے جنہیں ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔ اس ضرورت کے دو سبب ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس طرح فرد اپنے آپ کو معاشرے کا جزو محسوس کر کے، اپنی محدودیت کو بے کرانی میں بدل دیتا ہے یہ اس ضرورت کا روحانی پہلو ہے۔ دوسرے اس لئے کہ اس طرح افراد کی استعداد کے اختلاف سے مختلف افراد ایک دوسرے سے متمتع ہوتے رہتے ہیں۔ یہ اس کا عملی پہلو ہے۔

اسی طرح (Creative Freedom) کا مصنف (Mason) لکھتا ہے کہ

> انسانوں میں استعداد کا اختلاف، دنیائے انسانیت میں تنوع کا موجب ہے اسی سے حریتِ فکر اپنے سامنے وسیع میدان دیکھتی ہے۔

لیکن اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآن، افلاطون کے تصور کے مطابق، مختلف طبقات (classes) کی

مستقل تقسیم کا نظریہ پیش کرتا ہے۔ یا ہندوؤں کے دونوں (ذاتوں) کے نظریہ کے مطابق پیدائشی تفریق کا قائل ہے اس کی تعلیم اس کے یکسر خلاف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر انسانی بچہ، پیدائش کے لحاظ سے ایک ہی حیثیت رکھتا ہے۔ ان سب کا ایک ہی طبقہ (Class) ہوتا ہے۔ اس لئے ان سب کی پرورش، تعلیم و تربیت یکساں طور پر ہونی چاہیئے (اسی کو ربوبیت کہتے ہیں)۔ اس کے بعد، وہ اپنی اپنی استعداد اور قلبی رجحان کے اعتبار سے جس جس کام کے لئے زیادہ موزوں ہوتے جائیں، ان کے سپرد وہی کام کر دیئے جائیں۔ یہ طبقات (Classes) اگر انہیں طبقات کہنا مناسب ہو تو محض تقسیم کار کی رو سے ہیں۔ اس سے زیادہ ان کی حیثیت کچھ نہیں اس پر پیدائش کا کچھ اثر نہیں ہوگا۔ یہ نہیں ہوگا کہ مزدور کا بیٹا محض اس لئے کہ وہ مزدور کے ہاں پیدا ہوا تھا مزدور رہے اور انجنیئر کا بیٹا، انجنیئر کا بیٹا ہونے کی وجہ سے انجنیئر رہے۔ یہ دونوں بچے ابنِ آدم ہیں۔ انہیں تربیت و تعلیم کے یکساں مواقع بہم پہنچائے جائیں گے۔ اگر مزدور کا بیٹا ذہنی صلاحیتوں میں بلند ہوگا تو وہ انجنیئر بن جائے گا۔ اور انجنیئر کا بیٹا فکری طور پر پیچھے اور جسمانی قوت میں آگے ہوگا تو اس کے سپرد جسمانی قوت کا کام کیا جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی معاشرہ میں جو چیز تباہی کا باعث ہے وہ مختلف گھرانوں میں پیدا ہونے والے بچوں کو یکساں مواقع بہم نہ پہنچانا ہے، ان کی ذہنی استعداد کا تفاوت نہیں۔ بقول ہیٹسن۔

استعداد کا اختلاف نہیں بلکہ مواقع کا یکساں طور پر نہ ملنا تباہی کا باعث ہے۔

قرآن پیدائشی تفریق کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ وہ ہر فرزندِ آدم کو فرزندِ آدم تصور کر کے سب کے لئے یکساں مواقع بہم پہنچاتا ہے۔ تاکہ ہر ایک کی مضمر صلاحیتیں پورے طور پر نشوونما پاسکیں۔ لیکن یہ صرف اسی معاشرے میں ممکن ہے جس میں نظامِ ربوبیت رائج ہو۔

ذہنی اختلاف کیوں ہوتا ہے

اس میں شبہ نہیں کہ جب کسی معاشرہ میں تمام بچوں کی تعلیم و تربیت (ربوبیت) بہتر اور یکساں انداز سے ہوگی تو اس سے ان کی ذہنی صلاحیتیں بھی زیادہ بلند ہوتی جائیں گی۔ لیکن اس کے باوجود ذہنی استعداد قلبی رجحان اور افتادِ طبیعت کا فرق باقی رہے گا۔ یعنی اس سے معاشرہ کی ذہنی سطح (Intellectual Level) ضرور بلند ہوتا

جائے گا لیکن انفرادی استعداد و خصائص کی تفریق نہیں مٹ سکے گی۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے متعلق کسی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ مختلف افراد میں ذہنی استعداد کا فرق کیوں ہوتا ہے اور اس کے اسباب علل کیا ہیں۔ اس مسئلہ پر ہمارے دور کی علمی دنیا میں بہت سی تحقیق ہو چکی ہے (اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے) علم الحیات (BioLogy) کے محققین کہتے ہیں کہ مختلف انسانوں میں عقلی تفاوت ان کی دماغی ساخت کی بنا پر ہوتا ہے وہ مختلف دماغوں (Brain cells) کا حیاتیاتی تجزیہ (Biological anelysis) کر کے یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ فلاں دماغ کی ساخت میں کیا نقص تھا اور فلاں میں کیا کمی۔ لیکن یہ تحقیقات ابھی اپنے ابتدائی مراحل میں ہیں۔ اور کسی یقینی نتیجہ تک نہیں پہنچ سکیں۔ حتیٰ کہ "اوسپنسکی" کا تو یہ خیال ہے کہ دماغ کے خلیات (Brain Cells) مادے کے پیدا کردہ ہوتے ہی نہیں۔ بہر حال، دماغی ساخت

نابغہ کی پیدائش

کے متعلق ہمارے دور کی علمی تحقیقات کا درجہ جو بھی ہو' ان سب کی راہ میں ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جہاں ان کے تمام سلسلے اور کلیے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ یہ مقام ہے کہ ایک نابغہ (Genius) کی پیدائش کا۔ علم الحیات کے ماہرین (BioIogists) تو ایک طرف' اس مقام پر علم النفس کے ماہرین (Psychologists) بھی انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ علم النفس کی رو سے' ایک انسان موروثی اثرات' ابتدائی ماحول اور تعلیم و تربیت کا مجموعہ ہوتا ہے۔ لیکن (Genius) کے معاملے میں یہ اصول بھی سرنگوں ہو کر رہ جاتے ہیں۔ آپ کسی (Genius) کی زندگی کا مطالعہ کیجیئے۔ وہ "وراثت و ماحول" کے عام قانون کا حرفِ غلط نظر آئے گا (جیسا کہ معارف القرآن جلد دوم۔ باب وحی میں لکھا جا چکا ہے)۔ ایک کفش دوز کا بچہ' ایک عمر تک پھٹے پرانے جوتوں کی مرمت میں وقت گزارتا ہے۔ لیکن اچانک ایک موقعہ ایسا آتا ہے کہ وہ کود کر میدان جنگ میں جا پہنچتا ہے اور کوندے کی طرح' دیکھتے ہی دیکھتے' دنیا کے بلند ترین جرنیلوں کی صف میں کھڑا ملتا ہے۔ ایک کسان کا بیٹا مدت العمر تک ہل چلاتا ہے اور مویشیوں کے ماحول میں نیم حیوانی سی زندگی بسر کرتا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اس کے بعد جب اس کی فلم زندگی کا اگلا سین' پردۂ سیمیں پر سامنے آتا ہے تو وہ بساطِ سیاست کا فقید المثال شاطر دکھائی دیتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے اندر ایک خاص قسم کا جوہر تھا۔ جو ایک خاص وقت تک خوابیدہ رہا اور اس کے بعد وہ یک لخت آنکھیں مل کر اٹھ بیٹھا!

اٹھ بیٹھا اور مطلع عالم پر نیر درخشاں بن کر چمکنے لگا۔ اس قسم کے دل و دماغ کے متعلق نہ علمائے حیات کی سمجھ میں آسکا ہے کہ ان کی تخلیق کے اسباب و حوادث کیا ہیں اور نہ ہی حکمائے نفسیات بتا سکے ہیں کہ یہ خفتہ جوہر کہاں سے پیدا اور کس طرح بیدار ہوتے ہیں۔ وہ اس باب میں کچھ کہہ سکے ہیں تو فقط اتنا کہ یہ ایک ناگہانی یا فجائی ارتقاء (Emergent evolution) ہے جو میکانکی علل و اسباب کے سلسلے سے باہر ہے۔

تیس سال کے گہرے تجربہ نے اس امر کے لئے بیّن ثبوت بہم پہنچا دیا ہے کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ غیر مخلوط نسل کے انسانوں کے اندر اس قسم کے افراد پیدا ہو جاتے ہیں جن کے متوارث خصائص (اپنے آبا و اجداد سے) بالکل مختلف ہوتے ہیں۔

(The nature Of living Matter By L. HOGBen)

پروفیسر (TAYlOR) اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

ان تمام اسباب و علل کا جن سے کوئی شے وجود پذیر ہوتی ہے محاسبہ کر لینے کے بعد بھی یہ حقیقت باقی رہ جاتی ہے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ شے اپنی نشوونما کے بعد ایک ایسی خصوصیت کی حامل بن جائے جو ان عناصر میں کہیں بھی نہ ہو جن سے اس شے نے ترتیب پائی تھی۔ یہ خصوصیت ایسی ہوتی ہے کہ ان تمام عناصر کا علم حاصل ہو جانے کے بعد بھی اس نرالی خصوصیت کے متعلق پہلے سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

(EVOlUtion in the Light Of modern knowledge)

فجائی ارتقاء (Emergent Evolution) کے نظریہ کا امام لائڈ مارگن اس باب میں کہتا ہے کہ

اگر یہ پوچھا جائے کہ جس چیز کو تم فجائی (Emergent) کہتے ہو وہ بالآخر ہے کیا؟ تو اس کا مختصر جواب فقط اتنا ہے کہ ایک نئی قسم کا رابطہ ہے۔ اور اگر یہ پوچھا جائے کہ یہ رابطے کس اعتبار سے نئے ہوتے ہیں تو اس کا جواب اتنا ہی ہے کہ ان کی خصوصیات کے متعلق ان کے ظہور میں آنے سے پہلے کبھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

(Emergent Evolution By lloyd Morgan)

بہرحال ہمارے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ مختلف افراد میں ذہنی تفاوت کا مسئلہ ہمارے دور کی علمی تحقیقات کی رُو سے حل نہیں ہو سکا۔ ہم کسی معاشرہ کی ذہنی سطح کو کتنا ہی بلند کیوں نہ کر دیں انفرادی استعداد کا فرق باقی رہے گا

انسان کی غلط فہمی قرآن یہ کہتا ہے کہ انسان کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ اس نے ذہنی استعداد کے اس تفاوت کو معاشی تقسیم کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ حالانکہ اس کا مقصد فقط تقسیم کار تھا جو عملِ تخلیق (creative Process) کے لئے ضروری ہے۔ انسانی ذہن کی اس غلطی نے وہ تمام مفاسد پیدا کر دیئے جن سے یہ دنیا جہنم بن کر رہ گئی۔ انسان کی حماقت یہ ہے کہ وہ اپنی اس غلطی کو اس جہنمی معاشرہ کے وجود کیلئے بطور دلیل پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر زیادہ استعداد کے مالک، اپنی کمائی ان لوگوں کی طرف منتقل کر دیں جن کی استعداد کم ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ "گدھا گھوڑا سب برابر ہو جائیں گے"۔ یہ ان کی نگاہ کی بھول ہے ذہنی استعداد کی زیادتی کسی کی ذاتی پیدا کردہ نہیں۔ یہ خدا کی طرف سے مفت عطا ہوئی ہے۔ اس لئے اس استعداد کی کمائی بھی ان افراد کی ذاتی ملکیت نہیں، "خدا کی ملکیت" ہے۔ اور خدا نے اسے ان انسانوں کی ربوبیت کے لئے مختص کر دیا ہے جن میں ذہنی استعداد کم ہے یا جو ذہنی اور جسمانی استعداد سے کسی نہ کسی طرح محروم ہو گئے ہیں۔ اس فاضلہ کمائی کو اپنی ملکیت تصور کر لینا اور جن کا یہ حصہ ہے انہیں نہ دینا، اس امر کا اعلان ہے کہ ذہنی استعداد خدا کی نعمت نہیں، تمہاری اپنی پیدا کردہ ہے۔ دیکھئے قرآن نے اس اہم مسئلہ کو کس طرح چند الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِى الرِّزْقِ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّىْ رِزْقِهِمْ
عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (۱۶/۷۱)

مختلف افراد میں اکتسابی استعداد کا تفاوت خدا کی طرف سے ہے (تمہارا اپنا پیدا کردہ نہیں) جس کی وجہ سے محنتوں کے ماحصل (رزق) میں فرق ہوتا ہے۔ لیکن جن لوگوں کو اس طرح معاشی فضیلت حاصل ہو جاتی ہے وہ اس زائد پیداوار (یا سرمایہ) کو ان لوگوں کی طرف نہیں لوٹاتے جنہیں اس لئے کم استعداد دی گئی ہے کہ وہ ان کی زیرِ نگرانی کام کریں۔ وہ ایسا اس لئے نہیں کرتے کہ ان کا ذہن اس تصور کو قبول نہیں کرتا کہ اس طرح معاشرہ میں سب برابر ہو جائیں۔ یہ ذہنیت درحقیقت خدا کی طرف سے دی ہوئی نعمتوں کے خلاف محاذ پیدا کرنے کے مرادف ہے۔ (جس کا نتیجہ تباہی ہے)

آپ نے دیکھا کہ قرآن نے اس اہم مسئلہ کو کس خوبصورتی سے حل کر کے رکھ دیا ہے! قرآن میں جہاں یہ آیا ہے کہ رزق

کی بست و کشاد، مشیت خداوندی کے مطابق ہوتی ہے (یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یَقْدِرُ) تو اس کے معنی یہ ہیں کہ رزق کی کمی اور بیشی (ذہنی استعداد کی کمی بیشی) یا خارجی قوانینِ کائنات) کے مطابق ہوتی ہے جو تمہارے پیدا کردہ نہیں بلکہ ہمارے قانونِ مشیت کے مطابق مرتب ہوتے ہیں۔ اس لئے رزق کی زیادتی سے تم کس طرح مالک بن سکتے ہو! ایسا کرنے والے ہمارے قانونِ ربوبیت کی تکذیب کرتے ہیں۔

اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ۔ فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ۔ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ (۱۰۷/۱-۳)

کیا تُو نے اس شخص کی حالت پر غور نہیں کیا جو ہمارے قانونِ مکافات کو جھٹلاتا ہے (جس سے اس کا کردار یہ بن جاتا ہے کہ) وہ خود یتیم (وہ افراد جو تنہا رہ گئے ہوں) کو دھکے دیتا ہے اور دوسروں کو مسکین کی پرورش کی ترغیب نہیں دیتا۔

وہ کہتا ہے کہ ابھی تو یہ غنیمت ہے کہ زمین سے رزق ایک اندازے کے مطابق نکلتا ہے اور یہ انسان کے اختیار کی بات نہیں کہ زمین میں چھپے ہوئے رزق کے خزانوں کو بیک وقت باہر نکال لے۔ ورنہ اگر کہیں اس پر بھی اسے اختیار ہوتا تو زیادہ ذہنی استعداد کے مالک نہ معلوم کیا کر گزرتے؟ (۴۲/۲۷)

ان تصریحات سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آ گئی کہ قرآن کی رو سے، انسان اپنی کمائی میں سے صرف اپنی محنت (Labour) کی نسبت سے حصہ لے سکتا ہے۔ ذہنی استعداد کی فراوانی، یا وسائلِ پیداوار کی (بزعمِ خویش) ملکیت کی بناء پر کچھ نہیں لے سکتا۔ یہ سب "خدا کا حصہ" ہے اور نوعِ انسانی کی ربوبیت کے لئے وقف۔ لہٰذا نظامِ سرمایہ داری کی یہ دلیل کہ جو شخص اپنی استعداد کی زیادتی کی بناء پر زیادہ کما سکتا ہے وہ اپنی کمائی کا مالک ہے، نگاہ کا فریب ہے، مبنی علی الحقیقت نہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں۔ سرمایہ دارانہ ذہنیت کی اس دلیل کا جواب وہ نظام کبھی نہیں دے سکتا جو نہ خدا کو مانتے اور نہ ہی مستقل اقدار کو تسلیم کرے۔ جو نہ نفسِ انسانی کی ہستی کا اقرار کرے اور نہ ہی حیاتِ جاوداں پر ایمان رکھے۔ یہی وجہ ہے کہ مارکس اس اعتراض کا جواب نہیں دے سکا کہ زائد استعداد کا مالک اپنی استعداد کا ماحصل کو اس شخص کو کیوں دیدے جس کی استعداد کم ہے؟ اس کا جواب صرف وہ شخص دے سکتا ہے جو نفسِ انسانی کی حقیقت اور اس کی ربوبیت کا قائل ہو۔ اس کے لئے خدا اور آخرت

پر ایمان لاینفک ہے۔ نظامِ سرمایہ داری اپنی ہنرمندی کی دلیل کو اپنی ہی طرف سے پیش نہیں کرتا بلکہ اُسے مذہب کے علمبرداروں کی طرف سے بھی پیش کراتا ہے جو خود نظامِ سرمایہ داری کے پیدا کردہ ہوتے ہیں (یعنی خدا کی طرف سے نازل شدہ دین نہیں بلکہ انسانوں کا خود ساختہ مذہب[1])۔ وہ کہتے ہیں کہ ہر شخص کو اپنی کمائی اور اس کمائی سے پیدا کردہ (یا خرید کردہ) جائیداد پر پورا پورا حق ملکیت ہوتا ہے اور اس کی ہی ملکیت، اس کی اولاد کو وراثتاً ملتی ہے۔ اسے اس ملکیت سے محروم کرنا شرعاً جائز نہیں۔" شرعاً" سے مراد ہوتی ہے وہ شریعت جو دورِ ملوکیت و مفاد پرستی کی پیدا کردہ ہوتی ہے (نہ کہ منزل من اللہ کتاب)۔ اس کے ساتھ ہی وہ یہ دلیل بھی پیش کرتے ہیں کہ اگر تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی پوری ہوتی جائیں تو غریبوں اور محتاجوں کا وجود ختم ہو جائے گا اور اس طرح خیرات اور صدقات کے لئے گنجائش ہی نہیں رہے گی۔ یعنی ان کے نزدیک غریبوں اور محتاجوں کا باقی رہنا اس لئے ضروری ہے کہ اس سے دولت مند لوگ خیرات و صدقات سے 'ثواب' حاصل کر سکتے ہیں اور اگر ملکیت نہ رہے تو وراثت کے احکام کی گنجائش نہیں رہتی۔ یہ تو ذرا آگے چل کر بتایا جائے گا کہ صدقہ و خیرات اور وراثت کے احکام سے مقصود کیا ہے؟ اس وقت اس دلیل کے بودے پن کو ملاحظہ کیجئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ لوگوں کی صحت کا خیال قطعاً نہیں رکھنا چاہیے، ایسی کوشش بالکل نہیں کرنی چاہیے جس سے لوگ تندرست و توانا رہیں۔ اس لئے کہ اگر لوگ تندرست و توانا رہے اور بیمار نہ پڑے تو ہسپتال بند کرنے پڑیں گے۔ دوائیوں کی ضرورت نہیں رہے گی۔ ڈاکٹر بیکار ہو جائیں گے۔ مذہب پرست گروہ کے اس فریب کا پردہ چاک کرنے کے لئے قرآن نے یہودیوں کی ایک ذہنیت کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان کی حالت یہ تھی کہ یہ پہلے اپنے کمزور اور نادار لوگوں کو گھروں سے نکال دیتے۔ جب وہ فریقِ مخالف کے ہاتھوں گرفتار ہو جاتے تو پھر انہیں فدیہ دے کر چھڑا لیتے (کیونکہ ان کے ہاں قیدیوں کو فدیہ دے کر چھڑانا ثواب کا کام تھا) یعنی حصولِ ثواب" کی خاطر خود اپنے میں سے ایک ایسی جماعت (class) پیدا (create) کر لیتے جو قیدی بن جائیں۔ یہ ذہنیت اس مفاد پرست گروہ کی ہے جو اپنے میں سے ایک مستقل طبقہ محتاجوں اور غریبوں کا رکھنا چاہتے ہیں تاکہ انہیں خیرات دے کر ثواب حاصل کریں۔ قرآن کہتا ہے کہ اس ذہنیت کا نتیجہ، حال کی رسوائیوں

یہودی ذہنیت

---

[1] دین اور مذہب کے فرق کے لئے میرا مقالہ "اسبابِ زوالِ امت" (شائع کردہ طلوعِ اسلام) ملاحظہ کیجئے۔

اور مستقبل کی تباہیوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا (فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ یُرَدُّوْنَ اِلٰٓی اَشَدِّ الْعَذَابِ (۲/۸۵) آج مسلمانوں کی بھی یہی حالت ہے۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔ ان اعتراضات کا جواب ذرا آگے چل کر دیا جائے گا۔

بابِ ہفتم

بنیادی اصول

زندگی کے دونوں نظریوں کے متعلق جو کچھ قرآن نے کہا ہے وہ گذشتہ اوراق میں آپ کے سامنے آچکا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مقصودِ حیات یہ ہے کہ انسان کا حال بھی خوشگوار ہو اور مستقبل بھی تابناک۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہر انسان، دوسرے انسانوں کی ربوبیت (پرورش) کی فکر کرے۔ اس نظریۂ زندگی کے ماتحت، سرمایہ داری اور مفاد پرستی کی وہ تمام لعنتیں ختم ہو جاتی ہیں جنہوں نے دنیا کو اس طرح جہنم بنا رکھا ہے۔ مارکس[۱] نے بھی چاہا تھا کہ دنیا سے سرمایہ داری کا نظام ختم ہو جائے۔ لیکن اسے اس کے لئے کوئی محکم بنیاد نہیں مل سکی۔ اس لئے کہ وہ خود زندگی کی محکم بنیادوں کا منکر تھا۔ وہ نہ تو خدا کے قانونِ ربوبیت کا قائل تھا نہ مستقل اقدار کا۔ نہ وہ حیات بعد الممات کو تسلیم کرتا تھا نہ قانونِ مکافاتِ عمل کو۔ دنیا سے نظامِ سرمایہ داری کے ختم کرنے کی آرزو بڑی مقدس ہے۔ لیکن مقدس آرزوئیں صرف حقائق کی محکم بنیادوں کے سہارے پروان چڑھ سکتی ہیں۔ مارکس کے پاس کوئی محکم سہارا تھا نہیں اس لئے اسے تاریخی وجوب (Historical necessity) کا خود ساختہ

---

[۱] میں نے اس کتاب میں مارکسزم یا کمیونزم کی تفصیلات سے بحث نہیں کی۔ کیونکہ یہ اس کتاب کا موضوع نہیں ہے اس کے لئے میری کتاب "سلیم کے نام خطوط" ملاحظہ کیجئے۔

سہارا نظر آسکا پڑا۔ چنانچہ (L. Laurat) اپنی کتاب (Marxism And Democracy) میں لکھتا ہے کہ

> مارکس اور انجلز نے اشتراکی آرزوؤں کی بنیاد تمدنی ترقی کے معاشی قانون پر رکھی۔ ایسا کرنے میں انہوں نے اپنی اشتراکی آرزوؤں کا جواز اخلاقی بنیادوں پر نہیں رکھا۔ بلکہ یہ کہا کہ اشتراکیت، تاریخی وجوب کا تقاضا ہے۔

لیکن یہ سہارا ایسا نہ تھا جس پر اتنی بڑی عمارت قائم ہو سکتی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہ سہارا چار قدم تک بھی ساتھ نہ دے سکا اور مارکس کے جانشین لینن ہی نے اسے چھوڑ دیا اور اپنے پروگرام کے لئے ایک دوسری راہ اختیار کر لی۔ لینن کے بعد اسٹالن آیا اور اس نے اشتراکیت کے بنیادی تصورات تک بدل دیئے۔ لینن اور اسٹالن نے اپنی تحریک کی بنیاد جذبات نفرت اور انتقام پر رکھی۔ چنانچہ یہی وہ "دلیل" ہے جس کے زور پر کمیونسٹ اپنا پروپیگنڈہ کرتے ہیں۔ "سرمایہ داری لعنت ہے"۔ "سرمایہ دار غریبوں اور مزدوروں کا خون چوستے ہیں۔" "مزدورو اٹھو اور ان سے انتقام لو"۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ تو محض جذبات انگیزی ہے حقائق پروری نہیں۔ قرآن اپنی دعوت (Movement) کی بنیاد یکسر حقائق پر رکھتا ہے۔

تاریخی وجوب کا فلسفہ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، مارکس کا تاریخی وجوب کا فلسفہ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی نظام علیٰ حالہ قائم نہیں رہ سکتا۔ ہر نظام کچھ وقت کے لئے قائم رہتا ہے۔ اس کے بعد اس کے اندر سے، اس کی ضد ایک دوسرا نظام اگنا شروع ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ نیا نظام چھا جاتا ہے۔ اور سابقہ نظام ختم ہو جاتا ہے۔ یہ سلسلہ شروع سے چلا آرہا ہے اور اسی طرح چلا جائے گا۔ یہ سب کچھ تاریخ کی اندھی قوت میکانکی طور پر کرتی رہتی ہے۔ اسے اس سے غرض نہیں کہ کوئی نظام اچھا ہے یا برا۔ اچھا ہو یا برا، وہ ہر موجودہ نظام کو بدل کر اس کی جگہ، اس کی ضد دوسرا نظام لے آتی ہے۔ آج کل سرمایہ داری کا نظام ہے۔ تاریخی وجوب اسے مٹا کر اس کی جگہ مزدوروں اور کسانوں کا نظام لے آئے گا۔ اس کے بعد، یہی تاریخی وجوب اس نظام کو مٹا دے گا اور اس کی جگہ، اس کی ضد دوسرا (یعنی پھر سرمایہ داری کا) نظام لے آئے گا۔

قرآنی تصور قرآن کی رو سے یہ تصور مضحکہ انگیز اور حقائق کُش ہے وہ کہتا ہے کہ یہ کائنات اندھی قوتوں کے تحت نہیں چل رہی۔ ایک خدائے علیم و حکیم کے پروگرام کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ اس کی ہر گردش قانون کے مطابق اور ہر حرکت ضابطہ کے ماتحت ظہور میں آتی ہے اور ان تمام گردشوں اور حرکتوں کا رُخ تعمیر اور ارتقاء کی طرف ہے، تخریب اور انحطاط کی طرف نہیں۔ کائنات میں تعمیری اور تخریبی دونوں قوتیں (حق اور باطل) مصروفِ عمل ہیں (اس لئے کہ ارتقاء ہمیشہ کشمکش سے ظہور میں آتا ہے) ان کی کشمکش جاری ہے، لیکن اس کشمکش میں ہمیشہ تعمیری قوت غالب رہتی ہے۔

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُونَ۔ (۲۱/۱۸)

ہم تعمیری قوتوں سے تخریبی قوتوں پر نشانہ بازی کرتے رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تعمیری قوتیں، تخریبی قوتوں کا مغز توڑ دیتی ہیں۔ اور ثانی الذکر نیست و نابود ہو جاتی ہیں۔ (یہ ہے حقیقت، اس کے علاوہ) تم جس قسم کا کوئی اور قانون مانتے ہو اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہے۔

یہ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل یونہی اتفاقی طور پر عمل میں نہیں آجاتا۔ بلکہ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، یہ سب کچھ خدا کے اٹل قانون کے مطابق ہوتا ہے (وَيَمْحُ اللَّهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ ۴۲/۲۴)

کائنات کے اس بنیادی قانون کو بیان کرنے کے بعد قرآن کہتا ہے کہ اب انسانوں کی دنیا کی طرف آؤ۔ اس میں تم دو قسم کے نظریئے دیکھو گے۔ ایک یہ کہ ہر فرد اپنے مفاد کے تحفظ میں سرگرداں و پریشاں ہے۔ یہ تخریبی نظریہ ہے۔ اس لئے اس کے لئے بقا نہیں ہے۔ اس کے برعکس دوسرا نظریہ یہ ہے کہ انسان تمام نوعِ انسانی کی بہبود و منفعت کے لئے کوشاں رہے۔ یہ نظریہ کائنات کے قانونِ ربوبیت کے مطابق ہے اس لئے حق ہے۔ اس نظریہ کے لئے بقا ہے۔ دیکھئے قرآن نے اس حقیقتِ ثابتہ کو کیسے نکھرے اور ابھرے ہوئے انداز سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے آؤ تمہیں یہ حقیقتِ مجردہ (Abstract Truth) ایک محسوس مثال کے ذریعے سمجھائیں۔ تم دیکھتے ہو کہ جب مینہ برستا ہے تو ادھر اُدھر کا خس و خاشاک پانی کی سطح پر آجاتا ہے۔ حیات بخش پانی تو زمین میں جذب ہو جاتا ہے اور خس و خاشاک سیلاب کے ساتھ بہہ جاتے ہیں

(أَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ۱۳/۱۷)
یہی حق و باطل کی مثال سمجھو۔ سیل کچیل کی جھاگ جو کسی کام کی نہیں ہوتی رائیگاں چلی جاتی ہے (كَذٰلِكَ
يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۱۳/۱۷)

بنیادی اصولِ بقا

اور
وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (۱۳/۱۷)
اور جس چیز (نظام یا نظریہ یا تصور) میں نوعِ انسانی کی منفعت ہوتی ہے وہ دنیا میں باقی رہ جاتی ہے۔
یہ ہے انسان کی معاشی اور معاشرتی دنیا میں فنا اور بقا کا اصول۔

(۱) جو چیز (نظام یا نظریہ) انفرادی مفاد پر مبنی ہوتا ہے مٹ جاتا ہے۔ اور
(۲) جس نظام کا مطمحِ نگاہ نوعِ انسانی کی منفعت ہوتا ہے۔ باقی رہ جاتا ہے۔

یہ ہے وہ اصولِ کلی جس کے ماتحت یہاں کا کاروبار چلتا ہے۔ باقی وہ رہ سکتا ہے جو انفرادی مفادِ خویش کی بجائے، کلی مفادِ انسانیت کا حامل ہو۔ یہاں ہر شے تغیر پذیر ہے۔ بجز اس قانونِ ربوبیت کے جو زندگی کی فراوانیوں اور خوش حالیوں کا ضامن ہے۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ (۵۵/۲۶-۲۷ نیز ۲۸/۸۸)

دنیائے فکر کا سب سے اہم مسئلہ خیر و شر (Good And Evil) کا مسئلہ ہے۔ یہ وہ مسئلہ ہے جسے انسانی فکر آج تک حل نہیں کر سکا۔ "خیر کسے کہتے ہیں۔ اور شر کیا ہے؟" جب سے انسان نے سوچنا شروع کیا ہے اس سوال نے اسے طلسمِ پیچ و تاب بنائے رکھا ہے۔

مسئلہ خیر و شر

قرآن کا اسلوب یہ نہیں کہ وہ اس قسم کے فلسفیانہ مسائل سے نظری طور پر بحث کرے۔ وہ زندگی کے حقائق سے بحث کرتا ہے اور ان مسائل میں اسی حد تک دلچسپی لیتا ہے، جس حد تک ان کا تعلق انسانی زندگی اور اس کے متعلقات سے ہے۔ چنانچہ وہ اس مسئلہ کے نظری پہلو سے تو بحث نہیں کرتا لیکن اس کے عملی پہلو کو نہایت آسانی سے حل کر دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کو جو کچھ بطور عطیۂ خداوندی ملتا ہے (یعنی اس کی استعداد اور تمام وسائلِ پیداوار) اسے نوعِ انسانی کی ربوبیت کے لئے عام کر دینا خیر ہے اور

اس کے برعکس اسے ذاتی مفاد کے لئے روک لینا شر۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ۔ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ...... (۳/۱۸۰)

جو لوگ عطیاتِ خداوندی کو اپنے ذاتی مفاد کے لئے روک رکھتے ہیں، وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ یہ روش ان کے لئے خیر کی روش ہے۔ نہیں! یہ شر کی روش ہے۔

یہ ہے مسئلہ خیر و شر کا حل اور یہ ہے انسانی سعی و کاوش کو پرکھنے کا معیار۔ آج کیلئے بھی خیر و شر کی یہی تعریف کرتا ہے جب وہ کہتا ہے کہ

خیر وہ ہے جس سے وحدت (انسانیت) پیدا ہوتی ہے اور شر وہ ہے جس سے افراد الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ (Ends And Meane)

آج ہر طرف سے یہ سوال پوچھا جاتا ہے کہ اسلام کی تعلیم کیا ہے؟ اس تعلیم کا ماحصل کیا ہے؟ اس پر عمل کرنے کا نتیجہ کیا ہوگا؟ یہ سوال ہر طرف سے اٹھتا ہے لیکن جو کچھ اس کے جواب میں کہا جاتا ہے اس کا نتیجہ اس کے

قرآنی تعلیم کا ماحصل ایک لفظ میں

سوا کچھ نہیں ہوتا کہ کثرتِ تعبیر سے خواب اور بھی پریشان ہو جاتا ہے۔ یہ سوال نیا نہیں۔ یہ اس وقت بھی اٹھا تھا جب قرآن پہلے پہل دنیا کے سامنے آیا ہے۔ جو لوگ قرآن کی دعوت پیش کرتے تھے، ان سے پوچھا جاتا تھا کہ اس کی تعلیم کیا ہے اور اس تعلیم کا نتیجہ کیا ہوگا؟ قرآن نے اس سوال اور اس کے جواب کو اپنے آغوش میں محفوظ کر لیا ہے۔ سورۃ النحل میں ہے،

وَقِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ (۱۶/۳۰)

جن لوگوں نے قرآن سے رشتہ جوڑ لیا ہے ان سے پوچھا جاتا ہے کہ تمہارے رب نے کیا نازل کیا ہے؟

یہ تھا سوال اور اس کا جواب؟ صرف ایک لفظ میں

قَالُوْا خَيْرًا (۱۶/۳۰)

وہ کہتے کہ ہمارے رب نے خیر نازل کیا ہے۔

جواب ہے کہ خدا نے خیر نازل کیا ہے۔ چونکہ قرآن نے اپنی ساری تعلیم کے ماحصل کو لفظِ خیر سے تعبیر کیا ہے، اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ کا مفہوم قرآن کے دیگر مقامات سے متعین کر لیا جائے۔ کیونکہ قرآن کا اپنا دعویٰ ہے کہ وہ تصریفِ آیات (آیات کو پھیر پھیر کر لانے) سے اپنے مفہوم کی وضاحت آپ کر دیتا ہے۔ سورۂ بقرہ میں وصیت کے حکم کے ضمن میں ہے (اِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۲/۱۸۰) "اگر مرنے والا مال و متاع چھوڑ کر مرے"۔ اس سے آگے انفاق کے حکم میں ہے (قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ ...... ۲/۲۱۵) "جو کچھ تم مال میں سے کھلا رکھو"۔ اسی طرح (۲/۲۷۲) میں بھی خیر کے معنی مال و دولت ہیں (وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ ...)۔ اسی طرح تمام معاشی خوش حالیوں کے لئے بھی خیر کا لفظ آیا ہے (اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ۷۰/۲۰-۲۱) جب انسان کو عسرت اور تنگدستی ستاتی ہے تو واویلا کرتا ہے اور جب خوشحال ہو جاتا ہے تو مال و دولت کو روک کر اپنے پاس رکھ لیتا ہے)۔ یہی معنی اس آیت میں ہیں (لَا يَسْئَمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَآءِ الْخَيْرِ وَاِنْ مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَئُوْسٌ قَنُوْطٌ ۴۱/۴۹) انسان اپنی راحت سامانیوں کو مانگتے ہوئے تھکتا ہی نہیں۔ لیکن جب اسے تنگی آتی ہے تو پھر مایوس ہو جاتا ہے۔ ان مقامات سے واضح ہے کہ خیر کے معنی ہیں مال و متاع، سامانِ زیست کی خوشگواریاں اور مرفہ الحالی، زندگی کی راحت۔ اس سے آگے بڑھئے۔ خیر اور اختیار کا مادہ ایک ہی ہے۔ اس لئے خیر کے معنی اختیارات کی وسعتیں بھی ہیں۔ چونکہ قرآن کی تعلیم انسان کی معاشی ضروریاتِ زندگی تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کی پوری کی پوری زندگی کو محیط ہے، اس لئے خیر کے معنی ہر قسم کی بھلائیاں ہیں۔ اس طبعی زندگی میں بھی اور اس کے بعد آنے والی زندگی میں بھی۔ یہ مفہوم قرآن کی اس آیت سے واضح ہے جس سے اس موضوع کا آغاز ہوا ہے۔ وہ پوری آیت یوں ہے:

وَقِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۚ قَالُوْا خَيْرًا ۚ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۚ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ۚ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ۱۶/۳۰

جن لوگوں نے قرآن سے رشتہ جوڑ لیا ہے اُن سے پوچھا جاتا ہے کہ تمہارے رب نے کیا نازل کیا ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے رب نے خیر نازل کیا ہے۔ یعنی جو لوگ اس کے متوازن پروگرام پر عمل کریں گے ان کا حال

بھی خوشگوار رہے گا اور مستقبل بھی بہتر۔ اس پروگرام پر عمل کرنے والوں کی زندگی کس قدر عمدہ ہوگی!

اس تمام تفصیل کو اگلی آیت کے ان چار لفظوں میں سمیٹ کر رکھ دیا جہاں فرمایا کہ (لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ ۳۴/۱۶) وہ جو چاہیں گے انہیں ملے گا۔" ان کی ہر آرزو پوری ہوگی۔ یہ ہے خیر کا مفہوم جس کی طرف دعوت دینے کے لئے اُمتِ مسلمہ کو پیدا کیا گیا تھا (وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ .... ۳/۱۰۴) اور جس سے روکنے والوں کو جہنمی بتایا گیا ہے (مَنَّاعٍ لِلْخَيْرِ ۵۰/۲۵)۔

یہ ہے قرآنی تعلیم کا ماحصل۔ فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ۔ حال بھی خوشگوار اور مستقبل بھی خوشگوار۔ اس پروگرام پر عمل کرنے والے حقیقی مومن ہیں (أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ۸/۴)۔ اور ان ہی کے لئے بلند درجات، تباہی اور بربادی سے حفاظت اور عزت کی روزی" ہے (لَهُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ۸/۴) یہی قرآن کی تعلیم ہے اور یہی تعلیم ہر رسول کے ذریعے بھیجی گئی تھی۔ چنانچہ قرآن میں حضرتِ نوحؑ کے متعلق ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ اگر تم میرے پروگرام پر عمل کرو گے تو اللہ تمہارے لئے سامانِ پرورش کی فراوانی کر دے گا۔ تمہاری کھیتیاں سیراب ہوں گی (يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا ۷۱/۱۱)، تمہارے مال اور اولاد میں کشائش ہوگی (وَيُمْدِدْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ ۷۱/۱۲)، اور تمہیں پھلوں سے لدے ہوئے باغات اور انہیں سدا بہار رکھنے کے لئے انہار عطا کرے گا۔ (وَيَجْعَلْ لَكُمْ جَنَّاتٍ وَيَجْعَلْ لَكُمْ أَنْهَارًا ۷۱/۱۲) یہی کچھ حضرت موسےٰؑ اور حضرتِ عیسےٰؑ کی قوموں سے کہا گیا۔

وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ مِنْ رَبِّهِمْ
لَأَكَلُوا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ ...... (۵/۶۶)

اور اگر یہ لوگ اس پروگرام پر عمل پیرا رہتے جو تورات اور انجیل اور دیگر کتبِ سماوی کی رو سے دیا گیا تھا تو ان پر اوپر اور نیچے سے رزق کے چشمے کھل جاتے۔

اور اس رزق سے تمام نوعِ انسانی کی پرورش ہوتی۔ لیکن ان کے مذہبی پیشواؤں (احبار و رہبان) نے انہیں کچھ اور ہی پٹی پڑھا دی اور خدا کے دین کو ایک اور ہی "دین" سے بدل دیا۔ اور اس کے بعد خود بھی دولت کے

انبار اپنے مفاد کے لئے جمع کرنے لگ گئے۔ اور ان کی دیکھا دیکھی قوم نے بھی ویسی ہی سرمایہ پرستانہ روش اختیار کرلی نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ سارا معاشرہ جنت کی بجائے جہنم میں بدل گیا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۔ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۔ يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنتُمْ تَكْنِزُونَ (۹ — ۳۴-۳۵)

اے ایمان والو! اس حقیقت سے آگاہ رہو کہ پیر اور مولوی لوگوں کا مال محض تخریبی نتائج کے لئے (مفت میں) کھاجاتے ہیں اور اس طرح اس مال کو ربوبیتِ عامہ میں صرف کرنے سے روکتے ہیں۔ یاد رکھو! جو لوگ سونے اور چاندی (کے ڈھیر) جمع کرتے رہتے ہیں اور انہیں نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے صرف نہیں کرتے، تو انہیں الم انگیز سزا سے آگاہ کردو (یہ سزا اس دور میں سامنے آئے گی) جب اس مال کو جہنم کی آگ میں گرم کیا جائے گا۔ اور پھر اس کے ساتھ ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پشت کو داغ دیا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ مال جو تم نے (نوعِ انسانی کی ربوبیت کے لئے کھلا رکھنے کی بجائے) اپنے ذاتی مفاد کے لئے جمع کر رکھا تھا۔ سو آج اس کا مزہ چکھو جو تم نے جمع کر رکھا تھا۔

خلاصۂ مبحث تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ قرآن ایک محکم اور بنیادی اصول بیان کرتا ہے اور وہ یہ کہ

مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ (۱۳/۱۷)

بقا اس نظام کے لئے ہے جس کا مقصد نوعِ انسانی کی منفعت ہو۔

یہ ہے وہ محور جس کے گرد قرآن کی ساری تعلیم گردش کرتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ تمام نوعِ انسانی ایک اُمت، ایک قوم، ایک جماعت[1] ہے۔ لیکن انفرادی مفاد پرستیوں نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے ہیں۔

---

[1] اس کی تفصیل ذرا آگے چل کر ملے گی۔

قرآنی تعلیم کا منشا یہ ہے کہ ان تفرقوں کو مٹا کر نوعِ انسانی کو پھر سے ایک امت بنا دیا جائے جس میں تمام انسان ایک گھرانے کے افراد سمجھے جائیں۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ہمارا پروگرام یہ نہ ہوتا (کہ تمام نوعِ انسانی کو پھر سے ایک امت بنا دیا جائے جس میں تمام انسان ایک گھرانے کے افراد بن جائیں۔) تو نظامِ سرمایہ داری۔ ہی انسانی معاشرہ کا مستقل اصول قرار پا جاتا اور دولت جمع کرنے والے (سرمایہ داروں کے گروہ) کی دولت دن بدن بڑھتی چلی جاتی۔ (وَلَوْلَا أَن يَكُونَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً ..... ۴۳/۳۳-۳۵) لیکن یہ نظریہ صرف قریبی مفاد کو پیش نظر رکھتا ہے۔ اس لئے اس سے نوعِ انسانی کی ربوبیت نہیں ہو سکتی اور اس لئے نوعِ انسانی اُمتِ واحدہ بھی نہیں بن سکتی۔ (ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ ۴۳/۳۶) لہٰذا ہمارا قانون یہی ہے کہ بقا اسی نظام کو ہو گی جس میں تمام نوعِ انسانی کی منفعت مقصود ہو۔ یہی حرفِ آخر ہے۔

باب ہشتم

عملی پروگرام

گذشتہ صفحات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ اگر انسان کو علیٰ حالہٖ چھوڑ دیا جائے اور اس کی راہ نمائی کسی خاص راستے کی طرف نہ کی جائے تو ہر انسان اپنے لئے وہی راہ تجویز کرے گا جس سے سب کچھ سمٹ کر اس کے پاس آجائے۔ وہ اسے اپنے لئے جمع رکھے گا۔ اور اس کی قطعاً پرواہ نہیں کرے گا کہ کسی دوسرے انسان پر کیا گزرتی ہے۔ اس کی عقل اسے بار بار سمجھائے گی کہ اسی متاع پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے جو اپنے پاس موجود ہو۔ دنیا میں کوئی کسی کا نہیں بنتا۔ سب کھانے کے یار ہیں۔ اگر کل کو تم پر کوئی بُرا وقت آپڑا تو کوئی تمہاری مدد نہیں کرے گا۔ تم بھی تباہ ہو جاؤ گے اور تمہاری اولاد بھی روٹی تک کی محتاج ہو جائے گی۔ عقل کے دلائل محض قیاسی اور فرضی نہیں ہوتے۔ وہ اپنے بیان کی تائید میں بیسیوں مثالیں پیش کر دیتی ہے۔ بات ہے بھی ٹھیک۔ جس معاشرے میں ہم رہتے ہیں اس کا یہی چلن ہے۔ دنیا میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ جس پر مصیبت پڑتی ہے اس کا کوئی ساتھی نہیں بنتا۔ اس وقت وہی پیسہ کام دیتا ہے جو انسان کی اپنی جیب میں ہو۔

ظاہر ہے کہ اس معاشرے میں رہنے والے انسان کو یہ سمجھانا بڑا مشکل ہے کہ زندگی کا صحیح چلن وہ نہیں جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ صحیح روشِ انسانیت یہ ہے کہ ایک فرد جو کچھ کماتا ہے اس میں اس کا حصہ صرف اس قدر ہے جس سے اس کی ضروریات پوری ہوں۔ باقی سب کچھ دوسرے انسانوں کی پرورش کے لئے ہے۔ اور یہ بھی

ظاہر ہے کہ جب موجودہ معاشرہ کے انسان کو اس جدید نظریۂ زندگی کا سمجھانا اس قدر مشکل ہے، تو اسے عملاً اس مقام تک لانا کس قدر مشکل ہوگا! قرآن اس حقیقت سے بے خبر نہیں۔ اس کی تعلیم کا خاصہ یہ ہے کہ وہ حقائق کا سامنا کرتا ہے

دشوار گذار راستہ

ان سے پہلو تہی نہیں کرتا۔ چنانچہ اس نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ انسان کے سامنے یہ دونوں راستے کھلے طور پر آجانے کے بعد بھی، انسان اس دوسرے راستے (معاذِ کُلّی) کو اختیار کرنے کی ہمت نہیں کرے گا۔ اسے یہ راستہ بڑا دشوار گذار اور پہاڑ کی سی چڑھائی کا مشقت آمیز اور حوصلہ شکن راستہ دکھائی دے گا۔ سورۃ البلد میں ہے کہ ہم نے انسان کو دونوں راستے دکھا دیئے ہیں (وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ 90/10) ان دونوں راہوں میں سے ایک راستہ بظاہر بڑا آسان نظر آتا ہے۔ وہ اسے اختیار کر لیتا ہے۔ دوسرا راستہ پہاڑ کا سا دشوار گزار دکھائی دیتا ہے۔ وہ اس پر چڑھنے کی ہمت نہیں کرتا۔ (فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ 90/11) تمہیں معلوم ہے کہ یہ پہاڑ کا سا دشوار گزار راستہ کونسا ہے؟ (وَمَا أَدْرٰكَ مَا الْعَقَبَةُ 90/12) یہ راستہ وہ ہے جس میں انسانوں کو ان زنجیروں سے رہا کرایا جاتا ہے جن میں وہ معاشی مجبوریوں کی بنا پر جکڑ دیئے جاتے ہیں (فَكُّ رَقَبَةٍ 90/13)۔ یا معاشی بدحالی کے دور میں جب بھوک اور مشقت عام ہو جائے، ان ناداروں اور بے کسوں کی روزی کا فکر کرنا جو معاشرے کے دیگر افراد کے قریب ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو تنہا محسوس کریں۔ حتیٰ کہ ان چھوٹے چھوٹے دائروں میں بھی ایسا نہیں کیا جاتا جو رشتہ داری یا ہمسائیگی وغیرہ کی بنا پر بنتے ہیں۔ (أَوْ إِطْعٰمٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ 90/15) یا ان مزدوروں کی بہبود کا انتظام کرنا جنہیں ہمیشہ مٹی میں لت پت رکھا جاتا ہے تاکہ اُن کی صلاحیتوں کی نشو و نما رکی رہے (أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ 90/16) ظاہر ہے کہ اس کی شکل یہی ہے کہ اس معاشرہ کی جگہ وہ معاشرہ قائم کیا جائے جس کی تاکید قرآن نے کی ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنے کے مرادف دشوار گذار راستہ کو اختیار کرنے کے لئے انسانوں کو کس طرح تیار کیا جائے! انہیں کس طرح موجودہ معاشرہ سے اس معاشرہ تک لیجایا جائے جس میں ہر فرد دوسرے فرد کی ربوبیت کا ذمہ دار بن جائے! یہ ہے اصل سوال۔ قرآن اس کا جواب نہایت شرح و بسط سے دیتا ہے وہ اس کے لئے ایک مفصل پروگرام مرتب کر کے دے دیتا ہے۔

اس پروگرام کی سب سے پہلی کڑی یہ ہے کہ انسان کے دل میں چند بنیادی تصورات کو بطور اصولی حقائق (Fundamental Principles) نقش

ایمان یعنی بنیادی تصورات

کرادیا جائے۔ اسے ایمان کہتے ہیں[1] (یعنی زندگی کا نصب العین) ان میں سب سے پہلا تصور یہ ہے کہ انسان کے پاس عقل کے علاوہ ایک اور ذریعۂ علم بھی ہے جسے وحی کہتے ہیں اور جس کے حامل انبیاء کے نام سے متعارف ہیں۔ برگساں اس باب میں کہتا ہے کہ

> اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ عقل، انسان کا امتیازی نشان ہے۔ یہ بھی ہر ایک کو تسلیم ہے کہ عقل متاعِ گراں بہا ہے۔ ایسے ہی جیسے فن لطیفہ کا کوئی شاہکار گراں بہا ہوتا ہے۔ لیکن یہ چیز محتاجِ وضاحت ہے کہ عقل کے فیصلے کس صورت میں مطلق اور واجب التعمیل قرار پاتے ہیں۔ عقل تو صرف دلائل فراہم کرتی ہے جن کی تردید دوسرے دلائل سے ہو سکتی ہے۔ اسی لئے اس پر اصرار کرنا غلطی ہے کہ ہماری اور آپ کی عقل ایسی گراں بہا ہے کہ وہ طوعاً و کرہاً ہم سے اپنی عظمت کا اعتراف کرالے اور اپنے فیصلوں کو منوالے۔ ہمیں اس کے ساتھ یہ بھی کہنا ہوگا کہ عقل و بصیرت کے پیچھے وہ انسان ہیں جنہوں نے نوعِ انسانی کو خدائی رنگ میں رنگ دیا اور اس طرح عقل کو لاہوتی سند عطا کردی۔ یہ وہ گراں قدر ہستیاں ہیں جو ہمیں ایک مثالی معاشرہ کی طرف کشاں کشاں لے جاتی ہیں۔
>
> (The Two Sources Of Religion And Morality)

اس کے بعد دوسرا مسلّمہ یہ ہے کہ اس کائنات میں ایک ہی قانون ہے جو انفس اور آفاق کی دنیا میں کارفرما ہے۔ یعنی وہی قانونِ ربوبیت جو خارجی کائنات میں از خود نافذ العمل ہے۔ اسے انسانی دنیا میں بھی نافذ العمل ہونا چاہیئے۔ انسان کسی دوسرے قانون کے ذریعے کامیاب زندگی بسر نہیں کر سکتا۔

---

[1] بنیادی حقائق وہ ہیں جنہیں مستقل اقدار (Permanent Values) یا ابدی صداقتیں (Eternal Truths) کہا جاتا ہے اور جو ناقابلِ تغیر و تبدل ہوتے ہیں۔ یہ صداقتیں صفاتِ خداوندی پر مبنی ہوتی ہیں اور زمانے کے اثرات سے ماورا۔ انہیں بطور مسلّمہ حقیقت کے ماننا ہوتا ہے۔ اسے ایمان کہتے ہیں۔

اس وحدتِ قانون (Unity Of Law) کے معنی ہیں وحدتِ خالق۔

وحدتِ خالق کا لازمی نتیجہ، وحدتِ مخلوق ہے۔ یعنی تمام نوعِ انسانی ایک عالمگیر برادری (One Single Community)۔ قرآن نے اس حقیقت پر بڑا زور دیا ہے۔ کیونکہ انسانی دنیا میں قانونِ ربوبیت کی تمام عمارت اسی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمام نوعِ انسانی کی تخلیق ایک نفسِ واحد (One Breath Of Life) سے ہوئی ہے (هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ۔ ۷/۱۸۹)۔ تمام انسان، ایک ہی درخت کی شاخیں، ایک ہی برادری کے افراد، اور ایک ہی جسم کے مختلف حصے ہیں۔ اس لئے ان سب کی تخلیق اور زندگی کی اٹھان، نفسِ واحد (One Single Soul) کی طرح ہونی چاہئے (مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ)۔ انسان کی ہوسناکیوں نے اس عالمگیر برادری کو ٹکڑے ٹکڑے کر رکھا ہے۔ لیکن وحی کا مقصود یہ ہے کہ ان امتیازات کو مٹا کر پھر سے نوعِ انسانی کو امتِ واحدہ بنا دیا جائے (كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِیّٖنَ...... ۲/۲۱۳)۔ اس وحدتِ

لہ یہ آیت قرآن کریم کی ان آیات میں سے ہے جن کے صحیح مفہوم کے متعلق اکثر غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ اس کا عام مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ شروع میں تمام انسان ایک ہی مذہب رکھتے تھے۔ پھر اللہ نے انبیاء کو بھیجا۔ تو ان کے بعد انسان مختلف مذہبوں اور فرقوں میں بٹ گئے۔ اس مفہوم سے ذہن میں جو اعتراض پیدا ہوتا ہے وہ واضح ہے۔

میری البصیرت کے مطابق اس کا یا تو مفہوم یہ ہے کہ چونکہ مقصودِ مشیت یہ تھا کہ نوعِ انسانی اپنے اپنے خود پیدا کردہ اختلاف چھوڑ کر ایک امت (One Nation) بن جائے اس لئے اللہ نے وحی کا سلسلہ جاری کیا کیونکہ یہ وحدتِ انسانیت وحی کی مدد کے بغیر ناممکن تھی۔

دوسرا مفہوم اس کا یہ ہے کہ شروع شروع میں انسان بالکل سادہ سی زندگی بسر کرتا تھا جس میں معاشرتی اور تمدنی ترقیاں کچھ نہیں ہوتی تھیں اور نہ ہی طبقاتی امتیازات تھے۔ اس کے بعد انبیاء آئے تاکہ وہ انہیں معاشرتی اور تمدنی ترقی کی راہیں سکھائیں۔ اور ان کی اخلاقی بنیادوں کو بھی درست کریں۔ اس سے ان کے ہاں معاشی فراوانیاں ہوگئیں۔ اگر وہ لوگ انبیاء کی ہدایت کے مطابق معاشرہ کو قائم رکھتے تو یہی معاشرتی فراوانیاں جنت بن جاتیں۔ لیکن ان میں سے بعض لوگوں نے دوسروں پر تغلب حاصل کرنے کیلئے

(بقیہ صفحہ ۱۵۶ پر)

انسانیت کا عملی طریقہ یہ ہے کہ خدا کی ربوبیتِ عامہ کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا جائے۔ انبیاء کرام کا مشن اسی طریق پر امتِ واحدہ متشکل کرنا تھا۔ اس کے لیے وہ خود سب سے پہلے ایک امت (امتِ واحدہ) بنتے تھے۔ (وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ۲۳/۵۲) قرآن وحدتِ انسانیہ پر کس قدر زور دیتا ہے، اس کا اندازہ سورۂ مائدہ کی اس ایک آیت سے لگایا جا سکتا ہے جس میں وہ کہتا ہے کہ جس شخص نے کسی ایک جان کو بھی ناحق قتل کر دیا تو یہ نہ سمجھو کہ اس نے ایک جان ضائع کر دی۔ یہ سمجھو کہ اس نے تمام نوعِ انسانی کو قتل کر دیا (مَنْ قَتَلَ نَفْسًاۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا۔ ۵/۳۲) اور اسی طرح جس نے کسی ایک شخص کی زندگی کا سامان بہم پہنچا دیا تو اس کے متعلق یوں سمجھو گویا اس نے تمام نوعِ انسانی کو زندگی عطا کر دی (وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا۔ ۵/۳۲)

وحدتِ انسانیہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے اب رفتہ رفتہ تمام دنیا تسلیم کرنے پر مجبور ہو رہی ہے۔ اس باب میں مفکرینِ مغرب کے سینکڑوں اقوال پیش کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس سلسلہ میں وہ آخری شہادت

(صفحہ ۱۵۵ کا بقیہ فٹ نوٹ) (بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ) اس ضابطۂ زندگی میں اختلافات شروع کر دیئے اور معاشی خوشگواریوں کو اپنے قانون کے مطابق تقسیم کرنے لگ گئے۔ اب اس کے بعد دو جماعتیں متوازی پیدا ہو گئیں۔ ایک انبیاء کی ہدایت کے مطابق چلنے والے اور دوسرے اس کے خلاف جانے والے۔ انبیاء کی ہدایت کا منشا یہی تھا کہ معاشی خوشگواریوں میں بھی ترقی ہوتی رہے اور اس کے ساتھ ساتھ انسانی معاشرہ میں ناہمواریاں بھی پیدا نہ ہوں۔ اب آخر الامر جب انسان پھر اسی روشِ زندگی کو اختیار کر لیں گے تو یہ راہ انہیں انسانی مساوات کی منزل تک لے جائیں گی۔

یہ خیال کہ حضرات انبیاء کرام محض اخلاقی تعلیم لے کر آتے تھے اور انسانی معاشرہ کے تمدنی اور معاشی حالات سے انہیں سروکار نہیں ہوتا تھا، قرآن کی رو سے غلط ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ انبیاء کرام اپنی قوم کی معاشرتی زندگی میں، زراعت، صنعت وغیرہ کی رو سے، خوشگوار اضافے کرنے میں عملی حصہ لیتے تھے اس لئے ان کی عملی تعلیم سے معاشی خوشگواریاں بھی بڑھ جاتی تھیں اور معاشرتی ناہمواریاں بھی مٹ جاتی تھیں۔ یہی قرآن کا منتہیٰ و مقصود ہے۔

سب کو اپنے اندر جمع کر لیتی ہے جس کا حال ہی میں (U.N.O) کی طرف سے اعلان ہوا ہے۔ (UNESCO) نے بڑے بڑے ائمۂ علوم و فنون کی ایک کمیٹی بٹھائی تھی (جس کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے) کہ وہ بتائیں کہ نوعِ انسانی کے متعلق ان کی تحقیقات کا ماحصل کیا ہے۔ انہوں نے اپنی رپورٹ میں کہا ہے کہ ہماری تحقیق یہ ہے کہ

نوعِ انسانی ایک ہے اور تمام انسان ایک ہی نوع کے افراد ہیں۔

قرآن اس حقیقت کو بطور بنیادی مسلمہ منوانا چاہتا ہے۔

چوتھا مسلمہ جسے بطور بنیادی حقیقت ماننا ضروری ہے یہ ہے کہ انسان کی زندگی اسی جسم اور اسی دنیا کے ساتھ وابستہ نہیں۔ اس کی زندگی کا سلسلہ موت کے بعد بھی آگے چلتا ہے۔ اس لئے جسم کی پرورش کے ساتھ ساتھ انسانی ذات (Personality) کی تربیت بھی نہایت ضروری ہے کیونکہ حیاتِ جاوید صرف متوازی شخصیت (Balanced Personality) کے حصے میں آسکتی ہے۔ اسی مسلمہ کا لازمی نتیجہ یہ بھی ہے کہ انسان کا کوئی کام بے نتیجہ نہیں رہ سکتا۔ ہر عمل کا نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ اور یہ نتیجہ زود یا بدیر ظہور میں آکر رہتا ہے۔ عملِ خیر اسے کہتے ہیں جس سے انسانی ذات میں نشوونما پیدا ہو۔ اور عملِ شر وہ جس سے انسانی ذات میں ضعف و انتشار (Disintegration) پیدا ہو۔

انسانی ذات کی تربیت کا راز اس میں ہے کہ انسان اپنی تمام صلاحیتوں کے ماحصل کو نوعِ انسانی کی تربیت و پرورش کے لئے عام کر دے۔ اور اس طرح خدا کی صفتِ ربّ العالمینی (ربوبیتِ عامہ) کا مظہر بن جائے۔

یہ ہیں وہ مسلمات جنہیں قرآن بطور حقیقت (Reality) انسان کے دل میں جاگزیں کراتا ہے۔ اسے ایمان کہا جاتا ہے۔ لہٰذا نظامِ ربوبیت کے قیام کے لئے جسے قرآن نے "پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنے" سے تعبیر کیا ہے، سب سے پہلی کڑی یہ ہے کہ انسان کے دل میں اس قسم کا ایمان پیدا کیا جائے۔

دوسری کڑی تعلیم و تدریس

اس نظام کی دوسری کڑی یہ ہے کہ جو لوگ ان مسلمات کو بطور حقیقت مان لیں (اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا — یعنی جو لوگ ایمان لے آئیں)

اُن کے سامنے اس ایمان کو، اس نظام کے ضابطہ (یعنی قرآن) کی تعلیم وتدریس کے ذریعے، پختہ تر کیا جائے۔ اور اس طرح ان کے اندر ربانی (ربوبیت کی ذمہ دار جماعت) بننے کی امنگ پیدا کی جائے۔ ان پر اس حقیقت کو بے نقاب کیا جائے کہ اس نظام میں حاکم اور محکوم کا کوئی تصور نہیں۔ تمہیں اپنے دل کی مرضی سے ایک ایسی جماعت بننا ہے جس کا مقصودِ زندگی نوعِ انسانی کی ربوبیت ہے۔ نوعِ انسانی کی ربوبیت سے خود تمہاری ذات کی نشوونما ہوتی جائے گی اور وہ رفتہ رفتہ صفاتِ خداوندی کی مظہر بن جائے گی۔ اس نظام میں اور تو اور، خود داعی نظام (یعنی رسول) کی حیثیت بھی کسی حاکم اور آمر کی نہیں ہوگی بلکہ جماعت کے ایک فرد کی ہوگی۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (۳/۷۸)

کسی انسان کے لئے یہ جائز نہیں کہ خدا اسے کتاب اور حکومت اور نبوت عطا کرے اور وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم قانونِ خداوندی کی بجائے میرے احکام کی اطاعت کرو۔ اس کا کہنا صرف یہ ہوگا کہ تم قانونِ خداوندی کی تعلیم سے اور اس تعلیم کے دل پر نقش کر لینے سے ایسی جماعت بن جاؤ جو ربوبیتِ انسانیہ کی ذمہ دار ہو۔

اس کے بعد ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ تم نے خود سمجھا ہے اسے دوسروں تک بھی پہنچاؤ اور انہیں بھی یہی کچھ سمجھاؤ۔ اس طرح اس نظام کے فکر کو عام کیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سعید روحیں جو اس نظام کی اہمیت کو سمجھ جاتی ہیں اور اس کے قیام کی تڑپ اپنے اندر پاتی ہیں، اس فکر سے ہم آہنگ ہو جاتی ہیں اور قلب ونظر کی اس تبدیلی سے رفتہ رفتہ بتدریج اس معاشرہ سے الگ ہوتی جاتی ہیں۔ اس طرح اسی معاشرہ کے اندر ایک اور معاشرہ کی تشکیل شروع ہو جاتی ہے۔ اس سے اگلا قدم یہ ہوتا ہے کہ اس جدید معاشرہ کے افراد میں اس قسم کا باہمی رابطہ پیدا کیا جائے جس سے اس جدید نظام کے اصول ومبادیات ہر وقت ان کے سامنے رہیں۔ وہ اپنے روز مرہ کے کاروبار میں ان ہی اصولوں کو سامنے رکھیں اور ان مقاصد کو اجاگر کرنے کے لئے ان کے وقتی اجتماعات منعقد کئے جائیں تاکہ اس طرح ایک فضا (Atmosphere) پیدا ہو جائے جس میں یہ فکر اس طرح غیر محسوس

طور پر پھیل جائے جیسے ہماری طبعی فضا میں ہوا کا وجود ہے۔ اس جدید فضا کی تخلیق کے لیے قرآن نے

قیامِ صلوٰۃ

قیامِ صلوٰۃ کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ آج جبکہ مسلمانوں میں صلوٰۃ کا مفہوم صرف نماز، پرستش یا ہندی زبان میں پوجا پاٹ ہو کر رہ گیا ہے، یہ سمجھنا ذرا دشوار ہے کہ قیامِ صلوٰۃ کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ ہمارے ہاں قیامِ صلوٰۃ کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ "نماز قائم کرو" اور اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ نماز کو پابندی کے ساتھ پڑھو۔ اور اس سے مقصود ہوتا ہے خدا کی پرستش۔ اس لئے آج یہ بات بمشکل سمجھ میں آسکتی ہے کہ اس "پرستش" کو "معاشی امور" سے کیا واسطہ؟ یہ شبہ کوئی نیا نہیں وحی کی طرف سے ہمیشہ دین (زندگی کا نظام) ملتا تھا لیکن اسے انسان رفتہ رفتہ مذہب (دھرم) میں بدل دیتے تھے۔ اس طرح دین کے وہ تمام عناصر جو نظامِ زندگی کے ستون تھے، رفتہ رفتہ پوجا پاٹ میں بدل جاتے تھے اور ان کا انسان کی زندگی سے کوئی واسطہ نہیں رہتا تھا۔ یہی کچھ سابقہ اقوام نے کیا اور یہی کچھ مسلمانوں سے ہوا۔ چنانچہ قرآن نے سورۂ ہود میں انسان کی اس عام ذہنیت، اور اقوامِ سابقہ میں اس ذہنیت کے مظاہرے کو نہایت واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اہلِ مدین کی طرف، حضرت شعیبؑ خدا کا پیغام لیکر آئے۔ قوم نے مذہب کے اس تصور کے مطابق جو عام طور پر رائج ہوتا ہے، یہ سمجھا ہوگا کہ یہ خدا کی عبادت (یعنی پرستش) کی دعوت دیتا ہے اس لئے اسے دعوت دینے دو۔ یہ "قیامِ صلوٰۃ" (نماز پڑھنا) چاہتا ہے اسے ایسا کر لینے دو۔ اس کی نماز سے ہم پر کیا اثر پڑے گا؟ لیکن انہوں نے دیکھا کہ حضرت شعیبؑ جس "صلوٰۃ" کی دعوت دیتے ہیں اس کا دائرہ مسجد کی چار دیواری تک محدود نہیں بلکہ اس سے آگے بھی بڑھتا ہے۔ اس سے انہیں بڑی حیرت ہوئی۔ چنانچہ قرآن میں ہے کہ انہوں نے حضرت شعیب سے کہا:

قَالُوا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْۤ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ (۱۱/۸۷)

اے شعیب! کیا تیری صلوٰۃ تجھے اس کا بھی حکم دیتی ہے کہ ہم ان قوانین کی اطاعت چھوڑ دیں جن کی اطاعت ہمارے آباؤ اجداد کرتے چلے آرہے ہیں؟

اور کیا تیری صلوٰۃ تجھے اس کا بھی حکم دیتی ہے کہ ہم اپنا مال و دولت اپنی مرضی سے خرچ نہ کریں؟

قومِ شعیب کے اس اعتراض پر غور کیجئے اور پھر سوچیے کہ قرآن کی رُو سے صلوٰۃ کا دائرہ کس قدر وسیع ہے۔ قومِ شعیب نے کہا کہ ہم تو سمجھتے تھے کہ صلوٰۃ سے مراد خدا کی پرستش ہے۔ لیکن یہ تمہاری صلوٰۃ عجیب چیز ہے جو ہم سے کہتی ہے کہ ہم اپنی دولت کو جس طرح جی چاہے خرچ نہیں کر سکتے؟ بھلا نماز کو معاشیات سے کیا واسطہ؟ غور کیجئے! کیا آج بھی صلوٰۃ سے وہی مفہوم نہیں لیا جا رہا، جو مفہوم قومِ شعیب کے ذہن میں تھا اور کیا آج کا مسلمان بھی وہی اعتراض نہیں کرتا جو مدین کی قوم کی طرف سے عائد کیا گیا تھا؟

بہرحال مقصود یہ بتانا تھا کہ خدا کے نظامِ ربوبیت کے قیام کے لئے ایمان کے بعد دوسری کڑی یہ ہوتی ہے کہ اس معاشرہ میں ایسی فضا پیدا کی جائے جس سے اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے یہی تصور آنکھوں کے سامنے رہے۔ اس کا

اقیموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ

نام قرآن کی اصطلاح میں قیامِ صلوٰۃ ہے۔ (صلوٰۃ کے معنی ہیں خدا کے پیچھے پیچھے چلنا۔ مصلّی اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو ریس میں اوّل نمبر کے گھوڑے کے پیچھے، لیکن اس سے متصل چلا آئے۔ صلوٰۃ اور ربوبیت کا کس طرح چولی دامن کا ساتھ ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ قرآن میں اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ کے ساتھ ہی اِیْتَاءِ الزَّکٰوۃ کا حکم آیا ہے۔ (اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ قرآن میں بار بار دہرایا گیا ہے) لیکن مشکل تو یہ ہے کہ جس طرح ہمارے ہاں اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ کا مفہوم صرف نماز پڑھنا رہ گیا ہے، اسی طرح اٰتُو الزَّکٰوۃَ کا مفہوم یہ قرار پا گیا ہے کہ ایک سرمایہ دار دولت کے انبار کے انبار جمع کرتا رہے اور سال کے بعد اس میں سے اڑھائی فی صدی خیرات دیدے۔ یہ ہے فریضۂ زکوٰۃ۔ حالانکہ زکوٰۃ کے لفظی معنی نشوونما (Growth) ہیں۔ لہٰذا اٰتو الزکوٰۃ کے معنی ہوئے "سامانِ نشوونما کا بہم پہنچانا"۔ اب اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ کا صحیح مفہوم سامنے آ سکتا ہے۔ یعنی معاشرہ میں ایسی فضا پیدا کر دی جائے جس سے ہر فردِ معاشرہ ان مستقل اقدار کو اپنے اندر سموئے ہوئے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اپنے دل کی مرضی اور روح کی خوشنودی سے دوسروں کے لیے سامانِ نشوونما بہم پہنچانے کی فکر میں لگ جائے۔ قرآن نے

لہ واضح رہے جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے اقامت الصلوٰۃ میں وہ وقتی اجتماعات بھی شامل ہیں جو اس غرض کے لئے قرآن کی ہدایت کے مطابق منعقد کئے جاتے ہیں اور جنہیں "موقت فریضۂ صلوٰۃ" (نماز) کہا جاتا ہے۔ یہ اجتماعات محض "پوجا پاٹ" کی رسم ادا کرنے کیلئے

(باقی صفحہ ۱۶۱ پر)

اقامتِ الصلوٰۃ کا لازمی نتیجہ بتایا ہے جب فرمایا کہ

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ - (۲۹/۴۵)

یقینی بات ہے کہ صلوٰۃ بخل سے روک دیتی ہے اور عقل کی ان فریب کاریوں سے بچا دیتی ہے جن کی بنا پر یہ سب کچھ اپنے لئے سمیٹنے کی فکر کرتی رہتی ہے۔

غور کیجئے الصلوٰۃ کا مقصد یہ بتایا کہ اس سے افرادِ معاشرہ بخل (سب کچھ سمیٹ لینے کی ذہنیت) سے بچ جاتے ہیں۔ اور عقل فسوں ساز کی فریب کاریوں (منکر) سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اور اس طرح ایتاء الزکوٰۃ (افرادِ معاشرہ کیلئے سامانِ نشوونما بہم پہنچانے) کی تگ و تاز میں مصروف ہو جاتے ہیں یعنی قیام الصلوٰۃ سے انسان کی ذہنیت بدل جاتی ہے۔ اس کے قلب و نگاہ میں انقلاب واقعہ ہو جاتا ہے۔ اس انقلاب کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے جذبات کو عقل و شعور کے تابع رکھتا ہے۔ انہیں بے لگام نہیں ہونے دیتا۔ اور اپنی عقل و شعور سے وحی (مستقل اقدار) کی روشنی میں کام لیتا ہے۔ ذہنیت کی اس نوع کی تبدیلی کو قیام الصلوٰۃ کہتے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ (قرآن نے بتایا ہے کہ) انسان کو علیٰ حالہ چھوڑ دیا جائے تو یہ سب کچھ اپنے لئے سمیٹتا چلا جاتا ہے۔ اور اس کی ہوس کی آگ کبھی بجھتی نہیں۔ اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جمع کرتا رہتا ہے اور پھر اپنی تھیلی کا منہ اوپر سے بند کر لیتا ہے۔ (جَمَعَ فَاَوْعٰی۔ ۷۰/۱۸)

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۶۰ - نہیں ہوتے۔ اس لئے کہ "پوجا پاٹ" کا تو تصور ہی غیر قرآنی ہے۔ یہ اجتماعات قرآنی نظام کی مشاورتی مجالس ہیں۔ سورۂ شوریٰ میں دیکھئے۔ حاملین نظامِ قرآنی کے متعلق کہا گیا ہے کہ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ۔ (۴۲/۳۸) وہ صلوٰۃ کے نظام کو قائم کرتے ہیں اور ان کے معاملات باہمی مشوروں سے طے پاتے ہیں۔ اور جو کچھ انہیں ملتا ہے اسے ربوبیتِ عامہ کے لئے عام رکھتے ہیں۔ غور کیجئے۔ یہاں کس طرح اقام الصلوٰۃ اور مشاورت دونوں آپس میں ملے ہوئے ہیں۔ اس لئے صلوٰۃ کے وقتی اجتماعات اس نظام کے مشاورتی اجتماعات ہیں۔ لیکن چونکہ یہ نظام خود قانونِ خداوندی ہی کی بنیادوں پر قائم ہوا ہے اس لئے اس کے ان مشاورتی اجتماعات کی ابتدا بھی خدا کے حضور حاضری سے ہوتی ہے۔ جس میں قرآن کی تعلیم کو سامنے لایا جاتا ہے۔ تفصیل ان امور کی کسی اور وقت دی جائے گی۔

یہ اس لئے کہ اس کی بھوک ہی نہیں مٹتی (اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۷۰/۱۹) جب اسے کچھ چھنتا ہے تو واویلا مچانا شروع کر دیتا ہے (اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۷۰/۲۰) اور جب مال و دولت کی فراوانی ہو جاتی ہے تو اسے دبا کر بیٹھ جاتا ہے (وَاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ۷۰/۲۱) اب اس کے بعد دیکھئے کہ اس ذہنیت کی تبدیلی کیلئے قرآن کیا علاج بتاتا ہے؟ وہی قیام الصلوٰۃ کا علاج۔ وہ کہتا ہے کہ مذکورۂ صدر ذہنیت عام انسانوں کی ہوتی ہے۔ لیکن وہ اس سے بچ جاتے ہیں جو نظامِ صلوٰۃ کو قائم کر لیتے ہیں (اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ - الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۷۰/۲۲-۲۳) اس تبدیلیٔ نگاہ سے ہوتا کیا ہے؟ یہ کہ وہ اس حقیقت کو تسلیم کر لیتے ہیں۔

مصلّین کون ہیں

کہ ہم اپنی استعداد کے ماحصل کے تنہا مالک نہیں ہیں۔ اس میں ہر ضرورتمند اور محروم کا حق ہے (وَالَّذِيْنَ فِيْۤ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۷۰/۲۴-۲۵)

آپ نے دیکھا کہ وہ کیا تبدیلی ہے جو انسان کی نگاہ میں صلوٰۃ سے پیدا ہوتی ہے؟ اور قرآن کی رو سے مصلّی (نمازی) کون ہے!

دوسرے مقام پر ہے کہ "جہنم والوں سے پوچھا جائے گا کہ تم نے کیا جرم کیا تھا جس کی وجہ سے تمہاری یہ حالت ہو گئی، وہ کہیں گے کہ ہم مصلّی نہیں بنے تھے (قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ۷۴/۴۳) یعنی ہماری کیفیت یہ تھی کہ ہم ان لوگوں کے لئے سامانِ پرورش نہیں فراہم کرتے تھے جو حرکت سے محروم ہو گئے تھے (وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ۷۴/۴۴)۔ (نیز دیکھو ۶۹/۳۴)

سورۂ الدھر میں اس حقیقت کو نہایت حسین و دل کش انداز میں بیان کیا گیا ہے اس میں کہا گیا ہے کہ انسان کو ذرائع علم (سمع و بصر) دینے کے بعد زندگی کا راستہ دکھلا دیا اور اسے یہ اختیار دیدیا کہ چاہے اس راستے کو اختیار کرے اور چاہے اس سے انکار کر دے (اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا - ۷۶/۳) اسے یہ بھی بتا دیا کہ اس راستے سے روگردانی کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسانی ذات کی صحیح آزادیاں سلب ہو جائیں گی زندگی گھٹ کر جوئے کم آب رہ جائے گی اس کی کشادگیاں سمٹ جائیں گی۔ اس کی نشوونما رک جائے گی۔ اس کی کھیتیاں جلس جائیں گی (اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَاْ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِيْرًا ۷۶/۴) اس راہ سے انکار کرنے والوں اور اس طرح زندگی کی بلندیوں کو دبا دینے والوں کے لئے زنجیریں اور طوق اور جھلسا دینے والی آگ کے شعلے بنا دیئے گئے ہیں۔ ان کے برعکس جو لوگ اس راستے کو اختیار کریں گے،

ان کے سینے میں کشادگی اور نگاہوں میں وسعت پیدا ہوگی اور زندگی پھیل کر بکھر کر بیکراں بن جائے گی (ان لوگوں کو ابرار کہہ کر پکارا گیا ہے جس کے معنی کشادگی اور وسعت کے حامل ہیں)۔ یہ اس پیالے سے آب حیات پئیں گے جس

یہ نظام دل کی گہرائیوں سے ابھرے گا

میں سکون اور ٹھنڈک کی آمیزش ہوگی (اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا ۷۶/۵) یہ شراب آئے گی کہاں سے؟ اس چشمے سے جسے یہ لوگ اپنے دل کی گہرائیوں سے پھاڑ کر نکالیں گے (عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا ۷۶/۶) اس چشمے کا منبع کہیں باہر نہیں ہوگا۔ لہٰذا یہ لوگ خود اپنے عمق قلب سے نکال کر باہر لائیں گے۔ یہ نظام ایسا نہیں جسے ان پر باہر سے ٹھونس دیا جائے۔ یہ دل کی دنیا سے ابھر کر باہر آئے گا۔ یہ ہوگا کیسے؟ اس طرح کہ یہ لوگ ان تمام واجبات کو جنہیں یہ از خود اپنے اوپر عائد کریں گے، نہایت عمدگی سے ادا کرتے جائیں گے (يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ ۷۶/۷) (نذر کے لفظ پر غور کیجئے۔ نذر کسی کی طرف سے عائد کردہ تاوان نہیں ہوتا، خود اپنی مرضی سے اپنی ذات پر عائد کی ہوئی شے ہوتی ہے) انہیں اس کا احساس ہوگا کہ اگر ہم نے اس قسم کا معاشرہ قائم نہ کیا تو اس کی جگہ ایسا معاشرہ قائم ہو جائے گا جس میں شر اس طرح عام ہو جائے گا کہ جو لوگ اس سے بچنا چاہیں گے وہ بھی نہ بچ سکیں گے۔ وہ اڑ اڑ کر از خود ان تک پہنچے گا (وَيَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا)

اس لئے وہ کریں گے کیا؟ ان تمام لوگوں کی "روٹی" کا انتظام کریں گے جن کی حرکت رک جائے (مسکین ۷۶/۸) یا جو معاشرے کے اندر رہتے ہوئے اپنے آپ کو تنہا پائیں (یتیماً) یا جن میں حرکت تو ہو لیکن وہ خارجی موانعات سے اس طرح گھر جائیں کہ چل نہ سکیں (اسیراً) اور یہ سب کچھ مفاد خویش کی کشش و جاذبیت کے علی الرغم کریں گے (وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۷۶/۸) اور اس کے لئے وہ کسی صلہ کی امید رکھیں گے نہ شکریہ کی تمنا (اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۷۶/۹)

یہ ہیں نظام ربوبیت کی بنیادیں۔ یعنی دل کی گہرائیوں سے وہ چشمے ابلیں جو مزرع انسانیت کی برومندی

۱؎ قرآن نے کہہ دیا کہ یہ کشادگی اور وسعت (البر) اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے کہ تم اپنی عزیز ترین متاع کو ربوبیت انسانیہ کے لئے کھلا رکھو (لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ - ۳/۹۱)

اور سرسبزی و شادابی کا موجب نہیں۔ قلب و نگاہ کی اس تبدیلی کا نام ہے مصلی بننا۔

اس سے بھی آگے بڑھئے۔ قرآن واضح الفاظ میں بتاتا ہے کہ الدین سے مفہوم نظامِ ربوبیت کا قیام ہے اور اس کا ذریعہ صلوٰۃ۔ لہٰذا جو شخص نظامِ ربوبیت قائم نہیں کرتا، وہ الدین کو جھٹلاتا ہے اور جو شخص صلوٰۃ سے فقط "نماز کی رسم ادا کرنا" مراد لیتا ہے اور افرادِ معاشرہ کی ربوبیت کا سامان فراہم نہیں کرتا اس کی یہ صلوٰۃ اس کی تباہی کا باعث بن جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ (اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ ۱۰۷/۱) تم نے

تکذیب الدین

اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جو الدین کو جھٹلاتا ہے؟ یہ وہ ہے جو انہیں دھکے دیتا ہے جو معاشرے میں تنہا رہ گئے ہوں (فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ ۱۰۷/۲) اور دوسروں کو بھی ان لوگوں کے سامان پرورش فراہم کرنے کی ترغیب نہیں دیتا جن کی صلاحیتیں نشوونما سے رک گئی ہوں (وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ ۱۰۷/۳) جس صلوٰۃ کا نتیجہ یہ نہیں ہوتا سمجھ لو کہ وہ صلوٰۃ بے نتیجہ ہی نہیں بلکہ تباہی کا باعث ہے (فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ الَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ صَلَاتِھِمْ سَاھُوْنَ[۱] ۱۰۷/۴-۵) تباہی کا باعث اس لئے کہ اگر وہ صلوٰۃ کو بالکل ترک کر دیں تو اس کا احساس تو ہو کہ ہمارے معاشرے کی تباہی فقدانِ قیامِ صلوٰۃ کی وجہ سے ہے۔ لیکن جب صلوٰۃ کو "رسمِ نماز" میں بدل لیا جائے تو اس سے جھوٹا اطمینان حاصل ہو جاتا ہے کہ ہم صلوٰۃ کے پابند ہیں اور معاشرہ کی خرابی کا باعث کچھ اور ہے۔ یہ ہیں وہ مصلین جن کی صلوٰۃ دیکھنے میں صلوٰۃ نظر آتی ہے لیکن درحقیقت صلوٰۃ ہوتی نہیں۔ کیونکہ جو صلوٰۃ ربوبیتِ عامہ کی مانع ہو جائے، وہ صلوٰۃ کیا ہے! (الَّذِیْنَ ھُمْ یُرَآءُوْنَ وَیَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۱۰۷/۶-۷) قرآن کی رو سے مومن کہتے ہی اسے ہیں جو نوعِ انسانی کی نشوونما کا سامان کرے (وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِلزَّکٰوۃِ فَاعِلُوْنَ ۲۳/۴) دیکھئے! یہاں للزکوٰۃ فاعلون نے کس طرح بات واضح کر دی ہے کہ زکوٰۃ سے مراد اڑھائی فیصدی ٹیکس نہیں بلکہ ایک پروگرام ہے جس کی سرانجام دہی مومنین کے ذمے ہے۔ یہی وہ مقصدِ عظیم ہے

۱؎ لفظ ساہون غور طلب ہے۔ سہا اس کمان کو کہتے ہیں جس کی تانت ڈھیلی پڑ جائے اور اس وجہ سے اس کا تیر کبھی نشانے پر نہ لگے۔ اس لئے ساہون وہ ہیں جن کی صلوٰۃ ٹھیک نشانے پر نہ لگ رہی ہو۔ اس لئے کہ صلوٰۃ کا لازمی نتیجہ نظامِ ربوبیت کا قیام ہے۔ جس صلوٰۃ سے یہ نتیجہ مرتب نہ ہو وہ صلوٰۃ بے معنی ہے اور تباہی کا باعث۔

جس کے لئے ان کی حکومت وجود میں آتی ہے۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ۔۔۔ (۲۲/۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں دنیا میں اقتدار حاصل ہو گا تو یہ صلوٰۃ کا نظام قائم کریں گے اور نوعِ انسانی کی

پرورش کا سامان بہم پہنچائیں گے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ نظامِ ربوبیت کی بنیاد اس ایمان پر ہے کہ ہماری نگاہ فوری مفاد کی بجائے مستقبل کے مفاد (آخرت) پر رہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص مستقبل پر نگاہ رکھے گا وہ نظامِ ربوبیت (نوعِ انسانی کی نشوونما۔ زکوٰۃ) کے لئے کوشاں ہو گا۔ لیکن جو شخص مستقبل پر نگاہ نہیں رکھے گا۔ وہ اس کیلئے کوشاں ہو ہی نہیں سکتا۔ اسی لئے قرآن نے کہا ہے کہ (اَلَّذِیْنَ لَا یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ بِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ کٰفِرُوْنَ۔ ۴۱/۷) جو لوگ انسانوں کو سامانِ نشوونما بہم نہیں پہنچاتے وہ درحقیقت آخرت کے منکر ہیں۔ اس کے برعکس، اقامت الصلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے حاملین آخرت پر ایمان رکھتے ہیں (اَلَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ بِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ ۳۱/۴) یہی دینِ قیّم ہے (وَذٰلِکَ دِیْنُ الْقَیِّمَۃِ۔ ۹۸/۵) صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا باہمی رشتہ ایسا استوار ہے کہ جو لوگ دولت کو ربوبیتِ عامہ کے لئے کھلا رکھتے ہوئے دل میں کبیدگی محسوس کرتے ہیں، ان کی نمازیں بھی بانجھ ہوتی ہیں۔

وَلَا یَاْتُوْنَ الصَّلٰوۃَ اِلَّا وَھُمْ کُسَالٰی وَلَا یُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَھُمْ کٰرِھُوْنَ (۹/۵۴)

آپ نے دیکھ لیا کہ قیامِ صلوٰۃ سے مفہوم کیا ہے؟ معاشرہ میں ایسی فضا پیدا کر دینا جس سے انسان خود بھی ربوبیت کی ذہنیت پیدا کرے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرے اور ترتیب دے۔ لہٰذا نظامِ ربوبیت کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ

(۱) انسان پہلے ان مسلمات کو بطور نصب العین حیات اپنے دل میں جانشین کرے جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے

لے یہ نکتہ قابلِ غور ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جب مسلمانوں کی حکومت قائم ہو گی تو وہ "زکوٰۃ دے گی"۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر زکوٰۃ کے معنی ہیں اڑھائی فی صدی خیرات یا ٹیکس، تو حکومت اس قسم کی زکوٰۃ کیسے دیگی؛ وہ تو افراد سے "زکوٰۃ لیگی" دیگی نہیں۔ لہٰذا اس سے صاف ظاہر ہے کہ زکوٰۃ کا مفہوم نہیں اس کے معنی ہیں سامانِ نشوونما مہیا کرنا۔ اسلامی حکومت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ نوعِ انسانی کی نشوونما کا سامان مہیا کرے (زکوٰۃ کے لئے)

۲ے کسل کے معنی ہیں ایسی کیفیت کہ انسان جماع کی لذت تو حاصل کرنا چاہے لیکن اولاد کی ذمہ داریوں کے خوف سے حمل قرار نہ پانے دے۔ یعنی نماز کی کھیل معاشرہ میں نیک نام بن جائے لیکن ربوبیتِ عامہ کا نظام قائم نہ ہونے دے۔

اور اس کے بعد

(۱۱) اس معاشرہ کا ایک جزو بن جائے جس میں تمام افراد ایک دوسرے کو اس نظام کے قیام کی تلقین کریں۔ اس طرح انسان اس راستے کو اختیار کر سکتا ہے جسے قرآن نے "پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنے کا دشوار گزار راستہ بتایا ہے۔ چنانچہ ان آیات کے بعد (جن میں اس راستہ کو پہاڑ پر چڑھنے کا راستہ بتایا گیا ہے) قرآن نے کہا ہے کہ اس کا طریق یہ ہے کہ۔

ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ[۱] (۹۰/۱۷)

انسان ان لوگوں میں سے ہو جائے جو ایمان لائے اور جنہوں نے ایسا معاشرہ پیدا کر لیا جس میں ہر فرد دوسرے کو گرنے سے بچانے اور سامان نشو و نما بہم پہنچانے کی تلقین کرتا ہے۔

محرکات کی نگہداشت

انسانی معاشرہ کی بنیاد اُن محرکات پر ہوتی ہے جو افرادِ معاشرہ کو آمادہ بہ عمل کرتے ہیں۔ اگر آپ ان محرکات کی نگہداشت کرتے رہیں اور ایسا انتظام کر دیں کہ یہ محرکات افسردہ نہ ہونے پائیں اور نہ ہی ان میں اور قسم کے محرکات کی آمیزش ہو، تو اس معاشرہ کے افراد کی سیرت اور کردار میں استقامت اور توازن پیدا ہو جائے گا اور یہی چیز ایک صحیح معاشرہ کی جان ہے۔ چنانچہ اس باب میں علم تجزیۂ نفس کا امام فرائڈ (FREUD) لکھتا ہے کہ

> وہ مہذب سوسائٹی جو افراد سے تو اچھے کردار کا مطالبہ کرتی ہے لیکن جن محرکات پر اس کردار کی بنیاد ہوتی ہے ان کا کچھ خیال نہیں کرتی، وہ ایسے افراد سے اطاعتِ احکام کراتی ہے جو اس اطاعت میں اپنی فطرت کے تقاضوں کی اطاعت نہیں کر رہے ہوتے۔ جس شخص سے ایسے احکام کی اطاعت کرائی جائے جنہیں وہ اپنے فطری تقاضوں کا مظاہرہ نہ سمجھے، علم النفس کی زبان میں یوں سمجھئے کہ ایسا شخص اپنے ذرائع اور وسائل کے حدود سے باہر زندگی بسر کر رہا ہے۔ اسی کو منافق کہتے ہیں خواہ اسے اس کا احساس ہو یا نہ ہو۔ یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ ہماری دورِ حاضرہ کی تہذیب کی فضا ایسے منافقین کی تخلیق کے لئے غیر معمولی طور پر ساز گار ہے۔
>
> (CiviLisation, War And Death)

[۱] رحمت کا مادہ رحم ہے۔ رحم وہ قالب ہے جس میں جنین (بچہ) کی پرورش ہوتی ہے۔

تفصیل کا یہ موقعہ نہیں (نہ ہی زیرِ نظر کتاب کا یہ موضوع ہے) ورنہ بتایا جاتا کہ قرآن نے "منافقین" کی جو خصوصیات بتائی ہیں فرائڈ اور عصرِ حاضرہ کے دیگر علمائے علم النفس کی تحقیقات کس طرح ان کے لئے شہادت بہم پہنچاتی ہیں۔ اس وقت صرف اتنا دیکھنا ہوگا کہ قرآن ان محرکات کی کس قدر نگہداشت کرتا ہے جن پر اس کے نظامِ ربوبیت کی عمارت اٹھتی ہے۔ اس سارے پروگرام کا نام قیامِ صلوٰۃ ہے۔ پروفیسر (Hawtrey) نے لکھا ہے کہ

> جو چیز ایک معاشی نظام کو دوسرے معاشی نظام سے متمیز کرتی ہے یہ ہے کہ اس نظام میں وہ جذبۂ محرکہ کیا ہے جو لوگوں کو کام کرنے پر آمادہ کر رہا ہے[1]۔

آپ دیکھئے کہ قرآن جن جذباتِ محرکہ پر اپنے نظام کی بنیاد رکھتا ہے وہ کس قدر محکم، پائیدار، مبنی بر علم و بصیرت اور عقلی تقاضوں کو پورا کرنے والے ہیں۔

ان محرکات کی بیداری اور پختگی (یعنی قیامِ صلوٰۃ) کے ساتھ ساتھ ان افراد کو انفاق (اپنی کمائی کو کھلا رکھنے) کی عملی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ یعنی ایسے مواقع سامنے لائے جاتے ہیں جن میں یہ افراد، اپنی کمائی کا بیشتر حصہ۔ اجتماعی بہبود کے لئے صرف کر دیں۔ قرآن میں اس کے لئے "فی سبیل اللہ" کی اصطلاح آتی ہے۔ قرآن میں صدقہ و خیرات وغیرہ کے لئے جس قدر ترغیبات و تحریصات یا احکام و ضوابط آتے ہیں وہ سب

عبوری دور کے احکام

اسی عبوری دور (Transitional Period) سے متعلق ہیں۔ (اس کی تفصیل ذرا آگے چل کر آتی ہے) کہ یہ احکام عبوری دور سے متعلق ہیں جس سے گزر کر اس معاشرہ کو اپنی آخری منزل تک پہنچنا ہوتا ہے۔ اس عبوری دور میں افرادِ معاشرہ کی تربیت اس انداز سے کی جاتی ہے کہ وہ رفتہ رفتہ اس معاشرہ کی آخری شکل تک پہنچ جائیں۔ چنانچہ انہیں یہ سکھایا جاتا ہے کہ اپنے لئے بھی رکھو، لیکن اس کے ساتھ ہی اجتماعی بہبود کے لئے بھی..... اس لئے کہ معاشرہ سب کچھ لے لینے کا مطالبہ صرف اس وقت کر سکتا ہے جب وہ اس پوزیشن میں ہو کہ افرادِ معاشرہ کی تمام ضروریاتِ زندگی بہم پہنچا سکے یہی ہے وہ آخری مقام جس تک یہ جماعت آہستہ آہستہ بڑھتی جاتی ہے

---

[1] Quoted by E.H.Carr in "The New Society"

الَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَکَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ قَوَامًا (25/67)

وہ لوگ جو خرچ کرتے ہیں تو اس میں اسراف نہیں کرتے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی (موقعہ پر) تنگی بھی نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ ان کی روش ان دونوں حالتوں کے بین بین، اعتدال پر رہتی ہے۔

دوسری جگہ ہے کہ

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا۔ (17/26)

اور قریبی کو اس کا حق دو اور مسکین کو بھی اور ایسے مسافر کو بھی جس کے پاس زادِ راہ نہ ہو۔ اور مال کو بیجا صرف کرکے ضائع مت کرو۔

کہیں انہیں محتاجوں اور غریبوں کو خفیہ اور علانیہ خیرات دینے کی تلقین کی جاتی ہے (2/271) اور کہیں حکم دیا جاتا ہے کہ دولت کو گردش دیتے رہو لیکن اس انداز سے کہ وہ اوپر ہی اوپر کے طبقہ میں نہ پھرتی رہے (کَیْ لَا یَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْكُمْ۔ 59/7) کہیں انہیں دولت جمع کرنے کے ہلاکت انگیز عواقب سے ڈرایا جاتا ہے (9/34)۔ اور کہیں سود خواری کے نتائج سے متنبہ کیا جاتا ہے (2/275) حقیقت یہ ہے کہ اگر بنظرِ تعمق دیکھا جائے تو ان ہی تدریجی احکامات سے اس جماعت میں ایسی کیفیت پیدا کر دی جاتی ہے کہ اس میں ذاتی املاک اور جائیداد کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ مثلاً دیکھئے:۔

جائداد بنانے کی گنجائش ہی نہیں رہتی

(۱) زمین کی ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اس کے لئے کہہ دیا گیا ہے کہ وہ (سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ) یعنی تمام ضرورتمندوں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے یکساں طور پر کھلی رہے گی۔ لہذا زمین خرید کر زمینداریاں اور جاگیرداریاں پیدا کرنے کا تصور ہی باقی نہیں رہتا۔

(۲) جب زمین پر ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی تو ظاہر ہے کہ کرایہ پر دینے کے لئے مکانات بنانے کا سوال بھی نہیں پیدا ہوگا۔ جب زمین ہی نہ ہوگی تو مکان کہاں بنایا جائے گا۔ مکان اپنی رہائش کے لئے درکار ہوگا سو اس کی ذمہ داری خود معاشرہ نے لے رکھی ہے۔

(۳) روپیہ جمع نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اس کی بحث ممانعت آئی ہے۔ نہ ہی اسے کسی خاص حلقے میں گردش دیا

جا سکتا ہے۔

(۴) اپنی ضروریات کے لئے نہ ہی اسراف کیا جا سکتا ہے نہ تبذیر۔ یعنی نہ زائد از ضرورت خرچ کیا جا سکتا ہے نہ بلا ضرورت۔ ضروریاتِ زندگی (Neccssities of life) کا تعین معاشرہ کرے گا۔

(۵) کسی کو روپیہ قرض دے کر اس پر سود نہیں لیا جا سکتا۔

اب فرمائیے کہ اگر کسی کے پاس زائد از ضرورت روپیہ ہو تو ان احکام کی موجودگی میں وہ اس روپئے کو کرے گا کیا؟ یہ روپیہ تو اس کے لئے وبالِ جان بن جائے گا۔ کیونکہ (قرآنی احکام کی رو سے) اس روپیہ کے رکھنے (یا خرچ کرنے) کی کوئی جگہ ہی نہیں ہو گی۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس روپے سے کارخانے لگائے جائیں۔ تجارت کی جائے۔ بہت اچھا! لیکن اس تجارت اور ان کارخانوں سے جو روپیہ آئے اسے کیا کیا جائے؟ بات پھر یہیں آ جائے گی۔

آپ نے غور کیا کہ قرآن نے کس طرح ان احکام کی رو سے زائد از ضرورت روپیہ کے لئے افراد کے پاس کوئی جگہ ہی باقی نہیں چھوڑی۔ جہاں تک ضروریات کا تعلق ہے انہیں معاشرہ نے اپنے ذمہ لے لیا (تفصیل اس کی ذرا آگے چل کر آتی ہے)۔

اس طرح عملی تعلیم سے ان افرادِ معاشرہ کی زندگی میں ایسی تبدیلی پیدا کر دی جاتی ہے جس سے وہ آہستہ آہستہ کلی مفاد کے خوگر ہو جائیں اور مال کی کشش و جاذبیت کے باوجود اسے اجتماعی مفادِ انسانیہ کے لئے صرف کرتے رہیں۔ وَ اٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ...... ۲/۱۷۷ (۷۶/۸) اسی سے رفتہ رفتہ ان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ

یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ وَ لَوْ کَانَ بِھِمْ خَصَاصَۃٌ ..... (۵۹/۹)

وہ خود تنگی کی حالت میں گزر کر لیتے ہیں لیکن دوسروں کی ضروریات کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں۔

پارٹی کی تشکیل جب قلب و نگاہ میں اس قدر تبدیلی پیدا ہو جائے تو وہ مقام آ جاتا ہے جہاں یہ جماعت اس مثالی معاشرہ (Ideal Sosiety) کی تشکیل کے لئے، جو اس تعلیم و عمل کا منتہیٰ ہے، نمایاں طور پر سامنے آ جاتی ہے۔ دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں یوں سمجھئے کہ اب ایک متمیز (Distinct) پارٹی کی حیثیت سے متشہود

ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ کسی معاشرہ میں انقلاب پیدا نہیں کیا جا سکتا جب تک اس کے لئے ایک جماعت پہلے سے موجود نہ ہو۔ اس باب میں اوسپنسکی اپنے استاد گرجیف کا قول نقل کرتا ہے کہ

انسانیت کا ارتقاء ہمیشہ ایک گروپ کے ذریعے ہی عمل میں آ سکتا ہے۔ یہ گروپ باقی نوعِ انسانی پر اثر انداز ہوگا اور اس کی راہنمائی کرے گا۔

In Search Of The Miraculous

لیکن اس گروپ کی تشکیل، استبدادی ڈنڈے کے زور سے یا جاہ و منصب کے لالچ سے نہیں ہوگی۔ جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں، یہ پارٹی ان افراد پر مشتمل ہوگی جو برضا و رغبت، بطیبِ خاطر، نظامِ ربوبیت کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے چکے ہیں۔ جو اس پر ایمان لا چکے ہیں کہ یہی نظام ان کے حال اور مستقبل کی خوشگواریوں کا ضامن ہے، بالفاظِ دیگر یہ وہ افراد ہیں جن میں قلب و نگاہ کی تبدیلی پیدا ہو چکی ہے اور یہی تبدیلی ان میں وجہ جامعیت اور سبب اشتراک ہے۔ اس یک نگہی سے اُن کے جذبات میں موافقت پیدا ہو جاتی ہے اور یہی وہ محکم بنیاد ہے جس پر ایک صالح معاشرہ کی عمارت اٹھتی ہے۔ اوسپنسکی لکھتا ہے کہ

انسانوں کو ایک دوسرے کے سمجھنے میں غلط فہمیاں اس لئے پیدا ہو جاتی ہیں کہ وہ مختلف جذبات کے ماتحت زندگی بسر کرتے ہیں۔ اگر ان کے جذبات میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے تو وہ ایک دوسرے کو بالکل صحیح طور پر سمجھنے لگ جائیں گے۔

(Tertium Organum)

اس قسم کے افراد کا یکجا ہو کر اس مقصدِ عظیم اور واحد نصب العین کے حصول کے لئے جدوجہد کرنے کا نام جماعتی زندگی[1] ہے۔ اس قسم کی جماعت کی تشکیل کس طرح سے ہوتی ہے، اس کے لئے اوسپنسکی اپنے استاد گرجیف کے الفاظ میں لکھتا ہے کہ۔

---

[1] تفصیل کا یہ موقعہ نہیں ورنہ میں بتاتا کہ نبی اکرمؐ کو مقامِ نبوت سے سرفراز کرنے کے بعد سب سے پہلا حکم یہی تھا کہ حضورؐ اس قسم کے افراد کو تلاش کریں اور ان کی تعلیم و تربیت سے اس قسم کی جماعت کی تشکیل کریں۔ چنانچہ سورۂ مزمل اور سورۂ مدثر ہی جماعت سازی کے تاکیدی احکام پر مشتمل ہیں۔ ان امور کی تفصیل کے لئے دیکھئے "سلیم کے نام خطوط اور اسبابِ زوالِ امت"۔

اس جماعت کی شرطِ اولین کیا ہے؟ بنیادی شرط یہ کہ اس میں ہر فرد، دوسرے فرد کی ذمہ داری اپنے سر لے لیتا ہے۔ ایک کی غلطی سب کی غلطی سمجھی جاتی ہے۔ یہی ان کا قانون ہوتا ہے۔ اور اس قانون کی بنیاد بڑی محکم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اس جماعت میں جو کچھ ایک فرد کا ہوتا ہے وہ سب کا ہوتا ہے

In Search Of The Miraculous

یہی وہ مقصد ہے جس کے لئے رسول اللہ سے کہا گیا کہ (فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۱۵/۹۴)، قانونِ خداوندی کے مطابق دوسروں سے الگ ہٹ کر اپنی جماعت کی جداگانہ تشکیل کر لیجئے (وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ۔ ۱۵/۸۸) اور جو لوگ اس جدید پروگرام پر عمل کرنے کے لئے تیار ہیں انہیں اپنے بازوؤں کے نیچے سمیٹ لیجئے۔ تمہارے لئے اس ٹکراؤ میں، جو مفاد پرست جماعتوں سے ہونے والا ہے، اللہ کا قانون اور اس جماعت کی رفاقت کافی ہے (حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ ۸/۶۴)

اس طرح ایک جدید معاشرہ کی تشکیل ہو جاتی ہے جس میں تمام افرادِ معاشرہ اپنے اندر صفاتِ خداوندی کو منعکس کر کے ربوبیتِ عامہ کو اپنا نصب العین زندگی قرار دیتے ہیں۔ اب معاشرہ اور ان افراد کے درمیان ایک معاہدہ ہوتا ہے۔ افرادِ معاشرہ، اپنی جان اور مال سب کچھ اس مرکز کے سپرد کر دیتے ہیں جو قرآنی نظامِ ربوبیت کو عمل میں لانے کا ضامن ہوتا ہے۔ اور اس کے بدلے یہ مرکز انہیں "الجنۃ" کی ضمانت (Guarantee) دیتا ہے۔

معاہدہ

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (۹/۱۱۱)

اللہ نے مومنین سے خرید لیا ہے ان کا جان اور مال بعوض جنت کے۔

"الجنۃ" کے متعلق پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اس میں زندگی کی تمام بنیادی ضروریات (خوراک۔ لباس۔ مکان اور حفاظت) شامل ہیں۔ لہٰذا اس معاہدے کی رو سے، نظامِ معاشرہ اس امر کی ذمہ داری لیتا ہے کہ وہ افرادِ معاشرہ کی تمام بنیادی ضروریاتِ زندگی فراہم کرے گا۔ اور افرادِ معاشرہ اپنی ذہنی اور اکتسابی قوتوں کے ماحصل کو معاشرہ کے سپرد کر دیتے ہیں۔ یہ وہ تجارت ہے جس سے افرادِ معاشرہ ان تباہیوں سے محفوظ ہو جاتے ہیں جو اس نظام کا لازمی نتیجہ ہیں جس میں اجتماعی مفادِ کلی کی بجائے انفرادی مفادِ خویش سامنے رہتا ہے (…)۔ اس معاہدہ کی رو سے ہر وہ شخص جو کمانے کی صلاحیت رکھتا ہے، اپنی کمائی میں سے صرف اتنا لیتا ہے جو اس کی ضروریاتِ زندگی کے لئے کافی ہو، باقی سب معاشرہ کی تحویل میں دے دیا جاتا ہے۔

وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ. قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹)

پوچھتے ہیں کہ اپنی کمائی کا کتنا حصہ دوسروں کے لئے کھلا رکھنا ہوگا۔ ان سے کہو کہ جتنا تمہاری ضروریات سے زیادہ ہو۔ اس لئے کہ تم نے فاضلہ از ضرورت اپنے پاس رکھ کر کرنا کیا ہے؟ تمہاری تمام ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری تو معاشرہ نے رکھی ہے۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا... (۱۱/۶) نیز (۳/۱۲ ، ۲۹/۱)

زمین پر (یعنی اس حصۂ ارض میں جس میں یہ معاشرہ قائم ہے) کوئی چلنے والا ایسا نہیں جس کا رزق اللہ (یعنی اس معاشرے) کے ذمہ نہ ہو۔

ہم اس مقام پر ایک اہم نکتہ کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں جسے آگے بڑھنے سے پہلے سمجھ لینا ضروری ہے۔ ہم نے "إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ......" کی آیت میں بھی اور پھر مذکورہ صدر آیت میں بھی "اللہ" کا ترجمہ کیا ہے "وہ معاشرہ جو قانونِ خداوندی کو نافذ کرنے کے لئے متشکل ہو۔" سوال یہ ہے کہ "اللہ" سے یہ مفہوم کس طرح لیا گیا ہے؟ یہ سوال ایسا ہے جس کے متعلق

اللہ سے مراد قرآنی معاشرہ

میں اپنی مختلف تحریروں میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں اس لئے اس مقام پر زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ بایں ہمہ ان حضرات کی خاطر جن کی نظروں سے میری مذکورہ صدر تحریریں نہیں گزریں، اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ انسانوں کی دنیا میں، اللہ کے کام، انسانوں کے ہاتھوں سے تکمیل پذیر ہوتے ہیں۔ خدا کا یہ اعلان ہے کہ ہم اپنے کلمہ کو بلند کریں گے حق کی فتح و کامیابی ہوگی۔ خدا کا دین تمام ادیان پر غالب آئے گا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ کلمۃ اللہ کی بلندی، حق کی فتح و نصرت اور دینِ خداوندی کا غلبہ، بدر و حنین کے میدانوں میں، محمد رسول اللہ والذین معہ (نبی اکرمؐ اور جماعتِ مومنین) کے ہاتھوں سے ہوا، از خود نہیں ہوا۔ جب تک یہ جماعت پیدا نہیں ہوئی، حق کا کلمہ بلند نہیں ہوا۔ خود جس مقام پر قرآن نے کہا ہے کہ "دین الحق" اس لئے بھیجا گیا ہے کہ وہ تمام ادیان پر غالب رہے (لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ) (۴۸/۲۸) اس کے ساتھ ہی کہہ دیا کہ (مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ...) (۴۸/۲۹) یہ اس جماعت کی کفار پر شدت کا نتیجہ تھا کہ دین الحق تمام ادیان پر غالب آگیا۔ جب (حدیبیہ کے مقام پر) مجاہدین کی یہ جماعت، نبی اکرمؐ کے ہاتھ پر جان دینے کی بیعت کر رہی

؎ اس کے ساتھ ہی کہہ دیا کہ یہ بات اس کی سمجھ میں آسکتی ہے جو قوتی۔ فائدہ و مستقبل کے مفاد دونوں پر نگاہ رکھے گا۔ (لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ) جو شخص قریبی مفادِ خویش پر نگاہ رکھے گا وہ اس کے لئے آمادہ نہ ہوگا کہ ضرورت سے زائد دوسروں کیلئے عام کر دے۔

تھی تو قرآن نے کہا کہ جو لوگ تم سے بیعت کر رہے تھے وہ درحقیقت خدا سے بیعت کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھ کے اوپر (تمہارا ہاتھ نہیں) دراصل خدا کا ہاتھ تھا (۴۸/۱۰) یعنی خدا براہِ راست بیعت نہیں لیا کرتا۔ نظامِ خداوندی کا مرکز خدا کی جگہ بیعت لیتا ہے۔ اسی طرح جب بدر کے میدان میں مجاہدین، حق کے غلبہ کے لئے مخالفین پر تیر اندازی کر رہے تھے تو اس کے متعلق بھی فرمایا کہ (وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى۔ ۸/۱۷) یہ تیر اندازی تم نہیں کر رہے تھے اللہ کر رہا تھا۔ لہٰذا انسانوں کی معاشرتی زندگی میں جو ذمہ داریاں خدا نے اپنے اوپر لے رکھی ہیں وہ اس معاشرہ کے ہاتھوں پوری ہوتی ہیں جو خدا کے قانون کے مطابق متشکل ہوتا ہے۔ سورۂ یٰسین میں اسی حقیقت کو واضح کیا گیا ہے جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ جب ان کفار سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے دیا ہے اسے محتاجوں کی پرورش کے لئے کھلا رکھو (وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ أَنفِقُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۳۶/۴۷) تو اس کے جواب میں یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر اللہ ایسا ہی چاہتا ہے تو وہ انہیں خود کھلائے۔ ہم کیوں کھلائیں! (قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنُطْعِمُ مَن لَّوْ يَشَاءُ اللّٰهُ أَطْعَمَهُ۔ ۳۶/۴۷) قرآن کہتا ہے کہ ان سے کہدو کہ تم لوگ کس قدر حماقت کی باتیں کر رہے ہو (إِنْ أَنتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ۔ ۳۶/۴۷) خدا خود براہِ راست نہیں کھلایا کرتا۔ یہ تمام انتظامات خود انسانوں کے ہاتھوں سے ہوا کرتے ہیں۔ یہ سمجھنے کے لئے کہ ان لوگوں کا یہ خیال کس قدر گمراہی اور جہالت پر مبنی تھا، ذرا اس حقیقت پر غور کیجئے۔ قرآن میں ہے کہ اللہ تمام اقوامِ عالم کا پرورش کرنے والا ہے (رب العالمین)؛ زمین پر کوئی چلنے والا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو (۱۱/۶)؛ یا یہ کہ تم لوگ اپنی اولاد کو افلاس کے ڈر سے قتل نہ کر دیا کرو نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ (۱۷/۳۱) ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے بھی۔ اب ظاہر ہے کہ جب ان سب کے رزق کی ذمہ داری خود خدا نے لی ہے تو ان میں سے کسی کو بھی بھوکا نہیں رہنا چاہیئے۔ لیکن یہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ دنیا میں کروڑوں انسان بھوکے سوتے ہیں۔ ایک ایک قحط میں لاکھوں جانیں روٹی نہ ملنے سے تلف ہو جاتی ہیں۔ کتنے بچے ہیں جو محض غذا نہ ملنے (یا کم ملنے) کی وجہ سے ضائع ہو جاتے ہیں۔ اس سے انسان (معاذاللہ) اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ یہ خدا کی ذمہ داری ایسی ہے جو اس قدر مخلوق بھوکوں مر جاتی ہے! لیکن ان آیات کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ ان ذمہ داریوں کو براہِ راست پورا کرتا ہے۔ یہ پوری ہوتی ہیں معاشرہ کے ہاتھوں۔ اگر معاشرہ، ضابطۂ خداوندی کے مطابق متشکل ہوتا ہے تو اللہ کی یہ تمام ذمہ داریاں پوری

ہوتی جاتی ہیں اور اس طرح انسان دیکھ لیتا ہے کہ وہ کس طرح رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ (۶/۱۶۵) "ہر شے کی ربوبیت کا ذمہ دار ہے"۔ لیکن اگر معاشرہ غیر خداوندی خطوط پر متشکل ہو تو اس کا نتیجہ ربوبیت عامہ نہیں ہوتا۔

خارجی کائنات میں خدا کی ربوبیت خدا کے قانونِ کائنات کی رو سے از خود کار فرما ہوتی جاتی ہے۔ لیکن انسانوں کی دنیا میں یہ ربوبیت انسانوں کے ہاتھوں سے پوری ہو سکتی ہے۔ جو نظام (حکومت) خدا کے نام سے قائم ہوتا ہے وہ ان تمام ذمہ داریوں کو اپنے سر لیتا ہے جو خدا کی طرف منسوب ہیں اور اس کے بدلے میں افرادِ معاشرہ وہ تمام فرائض و واجبات پورے کرتے رہتے ہیں جن کا عہد انہوں نے اپنے خدا سے کر رکھا ہوتا ہے۔ افرادِ معاشرہ اس نظام کی اطاعت کے اس وقت تک مکلف ہوتے ہیں جب تک یہ نظام ان ذمہ داریوں کو پورا کرتا ہے (اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کا یہی عملی مفہوم ہے)۔

ان تصریحات کی روشنی میں اس آیت کا مفہوم سامنے لائیے جس میں کہا گیا ہے کہ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (۱۱/۶) زمین میں کوئی چلنے والا ایسا نہیں ہوگا جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہیں ہوگی۔ یہ ذمہ داری اس معاشرہ کے سر ہوگی جو خدا کے قانون کے مطابق متشکل ہوگا۔ قرآن کہتا ہے کہ جب تمہاری پرورش کا سامان اس طرح کر دیا جائے تو پھر تم رزق سمیٹ کر جمع کیوں کرو؟ تم اسی لئے جمع رکھنا چاہتے تھے کہ کل کو وقت پڑنے پر تمہارے اور تمہاری اولاد کے کام آئے۔ لیکن جب تمہاری اور تمہاری اولاد کی پرورش کی تمام ذمہ داریاں معاشرہ اپنے سر لے لے تو تمہیں جمع

جمع کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

کرنے کی کیا ضرورت رہی؟ (نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۱۷/۳۱) ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے بھی۔ تم اس لئے جمع کرنا چاہتے تھے کہ جب تم بوڑھے ہو جاؤ اور تم میں کمانے کی استطاعت نہ رہے اور تمہارے چھوٹے چھوٹے بچے ہوں تو اس وقت تمہاری اور ان کی پرورش کا کیا انتظام ہوگا (۲/۲۶۶)۔ لیکن اس نظامِ ربوبیت میں اس قسم کا خیال تک بھی دل میں نہیں آنا چاہیئے۔ اس میں ہر ایک کی پرورش کا انتظام موجود ہوتا ہے۔ یا تم اس لئے جمع کرنا چاہتے تھے کہ کل کو کوئی حادثہ پیش آجائے جس سے تمہارے کمانے کی استعداد کم ہو جائے یا بالکل سلب ہو جائے تو اس وقت کیا ہوگا؟ لیکن اس نظام میں اس قسم کے حوادث کے لئے بھی پہلے ہی گنجائش (Provision) رکھ دی گئی ہے (مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ

فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَھَا [illegible]) اس نظام میں اس قسم کے خارجی یا داخلی حوادث کیلئے (Provision) کر لینا کچھ دشوار نہیں (اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ [illegible]) یہ وہ نظام ہے جس میں کسی استعداد کے کم یا سلب ہو جانے سے انسان سامانِ نشوونما سے محروم نہیں رہ جاتا (لِّکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ [illegible]) اس لئے کہ جن کی استعداد زیادہ ہوتی ہے، وہ اس استعداد کے ماحصل کو اپنی ملکیت نہیں سمجھ لیتے۔ (وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰکُمْ [illegible]) یہ دشواری اس معاشرے میں پیش آتی ہے جہاں ہر شخص خود بڑا بننے کی فکر کرے اور اس کے لئے دوسرے انسانوں کی کمائی پر اس طرح چھپکے چھپکے ہاتھ مارے جس طرح شکاری دبے پاؤں شکار کو جا دبوچتا ہے (وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ [illegible]) لہذا جس معاشرہ میں انسان کا رزق اس طرح محفوظ (Secured) ہو اس میں جمع کرنے کی ضرورت کہاں رہتی ہے؟ یہ تو مستقبل کے عدم تحفظ (Insecurity) کا احساس ہے جو انسان کو ہر وقت جمع کرنے پر اکساتا رہتا ہے (اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ [illegible]) ابلیسی معاشرہ تمہیں ہر وقت احتیاج سے ڈراتا رہتا ہے اور اسی ڈر کی بنا پر بخل پر اکساتا رہتا ہے۔ اس کے برعکس، نظامِ ربوبیت تمہیں پوری پوری حفاظت کا یقین دلاتا ہے اور رزق کی فراوانیوں کی ضمانت دیتا ہے (وَاللّٰہُ یَعِدُکُمْ مَّغْفِرَۃً مِّنْہُ وَفَضْلًا [illegible])

عقل کا پورا اطمینان

غور کیجئے قرآن نے کس طرح چار لفظوں میں دونوں معاشروں کا فرق نمایاں طور پر بیان کر دیا ہے۔ ایک وہ معاشرہ ہے جس میں ہر شخص اپنی ضروریاتِ زندگی کا خود ذمہ دار ہے۔ کسی اور کو اس سے غرض نہیں کہ اس کی ضروریات پوری ہوتی ہیں یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس معاشرہ میں، ہر فرد ہر وقت مستقبل کے متعلق خائف رہے گا۔ اسے ہر وقت اس کا دھڑکا لگا رہے گا کہ کل کو مجبور کوئی وقت آپڑا تو میرا اور میری اولاد کا کیا بنے گا۔ مستقبل کے متعلق اس قسم کا عدم اطمینان (insecurity) ہے جو انسان کے لئے دنیا کو جہنم بنا دیتا ہے۔ وہ ہر وقت زیادہ سے زیادہ سمیٹنے اور جمع رکھنے کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتا ہے یہاں تک کہ وہ قبر میں جا پہنچتا ہے (حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ [illegible]) اس کے لئے وہ ہر قسم کی بے ایمانی اور بدعنوانی

کرتا ہے۔ جھوٹ بولتا ہے۔ فریب دیتا ہے۔ طرح طرح کی حیلہ جوئیاں کرتا ہے۔

اس کے برعکس۔ دوسرا معاشرہ ہے جس میں ہر فردِ معاشرہ کی اپنی اور اس کی اولاد کی پرورش کی ذمہ داری معاشرہ اپنے ذمے لیتا ہے۔ اس میں کسی شخص کو اپنے مستقبل کے متعلق کوئی عدمِ اطمینان نہیں ہوتا۔ وہ دل کے پورے اطمینان کے ساتھ کام کرتا ہے اور چین کی نیند سوتا ہے اسے نہ جھوٹ بولنے کی ضرورت ہے نہ چوری کرنے کی حاجت، نہ فریب دینے کی ضرورت ہے نہ بد دیانتی کرنے کی مجبوری یہ ہے وہ معاشرہ جو اس قسم کی جماعت کے ہاتھوں متشکل ہوتا ہے۔ اس میں نہ تو کسی کو مستقبل کی فکر ستاتی ہے اور نہ ہی یہ خدشہ ہوتا ہے کہ میری محنت کا ماحصل، اس طبقہ کی عیش پرستیوں کی نذر ہو جائے گا جس کے ہاتھ میں معاشرہ کا نظم و نسق ہے۔ نظامِ ربوبیت میں اس قسم کا کوئی طبقہ ہی نہیں ہوتا۔ اربابِ نظم و نسق بھی اسی قانون اور فیصلے کے پابند ہوتے ہیں جس پر دوسرے افرادِ معاشرہ گامزن ہوتے ہیں۔ اس میں اربابِ حل و عقد کا عملاً یہ اعلان ہوتا ہے کہ مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ۔ (۵۱/۵۷ نیز ۲۶/۱۰۹ و ۱۱/۲۹) ہم افرادِ معاشرہ سے رزق نہیں چاہتے۔ ہمیں اُن کی محنت سے اپنی پرورش مطلوب نہیں ہے۔ جس طرح افرادِ معاشرہ کے ذمے کچھ کام ہیں، اسی طرح ہمارے ذمے بھی کچھ کام ہیں۔ اور جس طرح دیگر افرادِ معاشرہ کے رزق کی ذمہ داری معاشرہ پر ہے اسی طرح ہماری ہے۔ ہم میں اور دیگر افرادِ معاشرہ میں کوئی فرق نہیں۔ ہم اپنے لئے کوئی خاص معاوضہ نہیں چاہتے۔ ہمارا معاوضہ بھی اسی طرح معاشرہ کے ذمے ہے جس طرح دوسرے افراد کا۔ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ہم بھی دیگر افرادِ معاشرہ کے ساتھ اس نظامِ ربوبیت کے اجزا ہیں۔ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ (۱۰/۷۲)

قرآن کی رو سے ان (اربابِ نظم و نسق) کی ذمہ داریاں بڑی ہمت طلب ہیں اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ (۴۰/۷) جو لوگ نظامِ ربوبیت کے مرکزی نظم و نسق کے ذمہ دار ہوتے ہیں اور جو ان کے اردگرد اس کے دست و بازو بنتے ہیں۔ ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ خدا کی اس قابلِ ستائش ربوبیت کے قیام و استحکام کے لئے ہر وقت سرگرداں رہتے ہیں اور اس کی صحت و افادیت پر انہیں پورا پورا یقین ہوتا ہے (وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۴۰/۷) اور وہ افرادِ معاشرہ کی حفاظت کا

پورا پورا بندوبست کرتے ہیں۔ وہ معاشرہ کی تمام ضروریات سے باخبر رہتے ہیں اور اس کی نشوونما کے لئے سامان پرورش کو زیادہ سے زیادہ پھیلاتے چلے جاتے ہیں (رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا ۔۔۔ ے) اور اس طرح ان تمام افراد کے لئے جو ہر دوسری طرف سے منہ موڑ کر اس معاشرہ کی راہ پر آجاتے ہیں۔ سامانِ حفاظت مہیا کرتے ہیں اور ان کی صلاحیتوں کے نشوونما پانے میں جو جو رکاوٹیں پیش آتی ہیں ان سب کو دور کرتے رہتے ہیں (فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ٭ ۔۔۔)۔

دوسرا جذبہ جس کے لئے انسان دوسروں سے زیادہ دولت مند بننے کی کوشش کرتا ہے، سوسائٹی میں ممتاز حیثیت حاصل کرنے (Social Status) کا جذبہ ہے۔ اسے قرآن تفاخر اور تکاثر سے تعبیر کرتا ہے۔ لیکن اس معاشرہ میں جو نظامِ ربوبیت کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے عزت و عظمت کے معیار اور سوسائٹی کی اقدار (values) بدل جاتی ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ

قیمت ہر شے باندازِ نگاہ

ہمارے موجودہ (غلط) معاشرہ میں، عزت و تکریم کا معیار دولت مندی ہے۔ جس کے پاس جتنا زیادہ ہے وہ اتنا ہی ممتاز ہے۔ لیکن قرآنی معاشرہ میں عزت کا معیار تقویٰ ہوگا۔ یعنی جو اپنے فرائضِ مفوضہ کو سب سے بہتر طریق پر سر انجام دے گا۔ (اور اس طرح قانونِ خداوندی سے سب سے زیادہ ہم آہنگ ہوگا) وہی سب سے زیادہ واجب التکریم ہوگا۔ (اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ) لہٰذا اس معاشرہ میں دولت جمع کرنے کا یہ جذبہ بھی باقی نہیں رہے گا۔

تجارت میں نفع کی ضرورت نہیں ہوگی

یہیں سے یہ حقیقت بھی سامنے آگئی کہ جب نظامِ ربوبیت میں تمام ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری معاشرہ کے سر ہوگی اور اس طرح نہ کسی کو روپیہ اپنے پاس رکھنے کی ضرورت ہوگی نہ جائیداد کی ذاتی ملکیت کی حاجت، تو اس وقت تجارت میں نفع لینے

ے اس سے اگلی دو آیتوں میں بتایا گیا ہے کہ وہ معاشرہ کی تمام ناہمواریوں کو دور کر کے اس میں جنت کی زندگی پیدا کر دیتے ہیں (۴۰ : ۸-۹)

کا بھی سوال پیدا نہیں ہوگا۔ نفع تو ایک طرف اس وقت تجارت کا موجودہ نظریہ (conception) ہی بدل جائیگا اس وقت چیزیں تیار کرنے والے انہیں تیار کرتے جائیں گے اور جنہیں ان کے استعمال کی ضرورت ہے وہ ان تک پہنچائی جائیں گی۔ چیزیں بنانے والوں اور استعمال کرنے والوں دونوں کے رزق کی ذمہ داری معاشرہ پر ہوگی۔ ہمارا موجودہ معاشرہ اپنی پیدا کردہ مصیبتوں سے تنگ آکر زیادہ سے زیادہ یہ سوچتا ہے کہ نقدی کے مبادلے کی بجائے، اجناس کا مبادلہ (Barter System) بہتر ہو سکتا ہے۔ اس باب میں کہا یہ جاتا ہے کہ

مبادلے کے عدل کے یہ معنی ہیں کہ جن چیزوں کا تبادلہ کیا جائے ان کی قیمتیں برابر ہوں۔

(Yvos R. Simons, in "Philosophy Of Democratic Govt.)

لیکن اس کے بعد دقت یہ پیدا ہوتی ہے کہ چیزوں کی قیمتوں کو کیسے متعین کیا جائے۔ مثلاً موچی نے جوتا تیار کیا۔ وہ اسے گیہوں کے عوض فروخت کرنا چاہتا ہے۔ اب یہ کیسے متعین کیا جائے کہ کس قدر گیہوں کی قیمت جوتے کی قیمت کے برابر ہے؟ لیکن جس معاشرہ میں موچی اور کسان دونوں کے رزق کی ذمہ داری معاشرہ پر ہو اس میں "قیمت" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ وہاں سوال ہوگا ضرورت کا۔ اس لئے قرآنی نظامِ ربوبیت میں "تجارت" کا مسئلہ خود بخود حل ہو جاتا ہے۔ اس میں چیز کی "قیمتِ فروخت" ہوگی اس کی لاگت اور تیار کرنے والے کی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے تک کا "منافع" (یعنی نظامِ معاشرہ اشیاء کے تبادلے میں اس اصول کو پیشِ نظر رکھے گا)۔ یہی ہے وہ طریقِ مبادلہ جو معاشرہ کے لئے تعمیری نتائج کا حامل ہوتا ہے۔ وہ طریق جس میں "منافع" کا معیار دوسرے کی ضرورت سے فائدہ اٹھانا (Exploitation) ہوتا ہے [اور جو لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ انفرادی مفاد پر مشتمل نظامِ زندگی کا] تعمیر کی بجائے تخریبی نتائج پیدا کرتا ہے۔ اسی لئے قرآن نے، تجارت کے ضمن میں کہا ہے کہ "ایک دوسرے کا مال تخریبی طور پر مت کھاؤ۔ تجارت کے معنی ہیں باہمی موافقت سے اشیاء کا تبادلہ۔ اگر یہ نہیں تو وہ تجارت نہیں ایک دوسرے کا قتل ہے۔" (۴/۲۹)

آپ غور کیجئے۔ نظامِ ربوبیتِ عامہ کی تشکیل میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ انسان کی عقل اسے ڈراتی

بے پناہ قوتیں

رہتی تھی کہ اگر تم نے اپنی کمائی دوسروں کو دیدی تو کل کو تمہارا کیا ہوگا؟ اس جدید معاشرہ نے عقل کا اطمینان کر دیا کہ اس شخص اور اس کے تمام متعلقین کے رزق کی ذمہ داری معاشرہ کے سر ہے اس لئے اب تمہیں (عقل کو) تشویش (Worry) کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمہیں جو مشکل پیش آئے اسے معاشرے کے سپرد کر دو۔ معاشرہ خود اس کا حل تلاش کرتا پھرے گا۔ غور کیجئے کہ اس انتظام سے عقل کتنے بکھیڑوں سے چھوٹ گئی۔

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ملا اسے غمِ جاناں بنا دیا

اس کے بعد یہ دیکھئے کہ جب انسان، فکرِ معاش کی طرف سے آزاد ہو جائے اور اسے اپنے اور اپنی اولاد کے مستقبل کی طرف سے پوری بے فکری ہو جائے تو وہ دنیا میں کتنے کام کر سکتا ہے؟ یہ تو معاشی پریشانیاں اور مستقبل کے متعلق عدمِ اطمینان (Insecurity) ہے جو اس کی توانائیوں کو سلب کئے جاتا ہے، ورنہ انسان اتنی بڑی قوتوں کا مالک ہے کہ کوئی اس کا اندازہ ہی نہیں کر سکتا۔ اب آپ سوچئے کہ اگر کوئی ایسا معاشرہ ہو جس کے افراد کو نہ معاشی پریشانیاں ستائیں اور نہ ہی مستقبل کی طرف سے عدمِ اطمینان چھلاوے کی طرح ڈراتا رہے، تو وہ معاشرہ دنیا میں کیا کچھ نہیں کر سکے گا؛ وہ طوفانِ بلا کی طرح اٹھے گا اور فطرت کی تمام مخفی قوتوں کو مسخر کرتا اور بڑے کار لاتا چلا جائے گا۔ اس کے ہر فرد کا سینہ آتش فشاں پہاڑ کی طرح شعلہ خیز ہوگا۔ اس کا ہر "مولا شہباز سے لڑ جائیگا" اس کے راستے میں کائنات کی کوئی قوت سنگِ گراں بن کر حائل نہیں ہو سکے گی۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی دیکھئے کہ نظامِ ربوبیت، افرادِ معاشرہ کو صرف فکرِ معاش ہی سے آزاد نہیں کرتا بلکہ ان میں سے ہر فرد اس پر ایمان رکھتا ہے کہ میں جو کچھ "دیتا ہوں" اس سے خود میری ذات کی ربوبیت ہوتی ہے۔ اس لئے میں جس قدر زیادہ دوں گا اتنی ہی زیادہ میری ذات کی نشوونما ہوگی اور اس طرح میں حیاتِ جاوید حاصل کر لوں گا اور خدا کی صفات کا مظہر بنتا جاؤں گا وہ اس ایمان کی بنا پر زیادہ سے زیادہ "دینے" کے لئے اپنا خون پسینہ ایک کر دے گا۔ حتیٰ کہ اگر ضرورت پڑے، تو) وہ اپنی جان جیسی متاعِ عزیز بھی بلا تامل دے دیگا۔ کیونکہ اسے یقین ہوگا کہ (۱) میرے مر جانے سے میرے بچے لاوارث نہیں رہ جائیں گے اور (۲) جان دیدینے سے

مجھے وہ استحکامِ خودی (ذات کی پختگی) حاصل ہو جائے گی جس سے میں یقیناً حیاتِ جاوداں کا مستحق ہو جاؤں گا۔ لہٰذا اس کے لئے جان دے دینا، ایک جشنِ کامرانی ہوگا۔

اب سوچئے کہ ایسا معاشرہ دنیا میں کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ آج دنیا حیران ہے کہ محمد رسول اللہ والذین معہٗ کی قلیل سی جماعت نے، اتنے مختصر سے عرصے میں، ایسی محیر العقول ترقی کس طرح کر لی تھی؟ دنیا حیران ہے اور اس کیلئے تحقیقاتی ادارے قائم کرتی ہے۔ لیکن اسے معلوم نہیں کہ رسول اللہؐ نے وہ معاشرہ متشکل کر لیا تھا جو قرآنی نظامِ ربوبیت کا حامل تھا اور یہ تمام محیر العقول ترقیاں اسی کے ثمرات تھیں۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

جس معاشرے کے افراد کے دلوں میں نہ مرنے کا خوف ہو اور نہ پس ماندگان کے مستقبل کا حزن (لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ) تو ان کی قوتوں کا کیا ٹھکانا ہے؟ رسول اللہؐ نے انہیں قرآن کی تعلیم دی۔ اس کے نتائج و ثمرات سے انہیں آگاہ کیا اور نظامِ ربوبیت کی رو سے ان کی نشوونما کا انتظام کر دیا۔ (وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ.... ۲/۱۲۹) اور یہ معاشرہ مشرق و مغرب پر چھا گیا۔ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ (انہوں نے قانونِ خداوندی سے موافقت پیدا کر لی اور وہ قانون ان کا رفیق و یاور بن گیا)۔

فرد اور جماعت کا تعلق

دورِ حاضرہ کا سب سے اہم مسئلہ "فرد اور جماعت" کا باہمی تعلق ہے۔ جس طرح مغرب کا میکانکی نظریہ حیات، عیسائیت کے اس باطل تصور کا ردِ عمل ہے جس کی رو سے اس نے مادی دنیا کو سخت قابلِ نفرت شے بنا کر رکھ دیا تھا، اسی طرح فرد اور جماعت کے تعلق کے متعلق یورپ کا موجودہ تصور بھی عیسائیت کے مسلکِ خانقاہیت کا ردِ عمل ہے۔ مسلکِ خانقاہیت سے مفہوم یہ تھا کہ معاشرہ یا جماعت کا وجود کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ مقصدِ زندگی ہر فرد کی اپنی نجات ہے اور اس نجات کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ انسان معاشرہ سے کٹ کر انفرادی زندگی بسر کرے۔ جس طرح عیسائیت کے تصورِ "روحانیت" کا ردِ عمل یہ ہوا کہ مغربی مفکرین اور سائنسدانوں نے یکسر روح ہی سے انکار کر دیا اور دنیا کو خالص مادیت کی تعبیر بنا دیا، اسی طرح مسلکِ خانقاہیت

کا ردِ عمل یہ ہوا کہ انہوں نے فرد کی ذات ہی سے انکار کر دیا اور اعلان کر دیا کہ اصل وجود اور ہستی معاشرہ کی ہے۔ اسی "معاشرہ" نے کہیں "نیشن" کا لقب اختیار کر لیا اور کہیں "اسٹیٹ" کا۔ چنانچہ انیسویں صدی سے یورپ میں یہ نظریہ عام ہونے لگا کہ فرد، سوسائٹی یا نیشن یا اسٹیٹ کی خاطر جیتا ہے اور اس کی خاطر مرتا ہے۔ اس اجتماعی زندگی کے باہر اس کی انفرادی زندگی کا تصور ہی غلط ہے۔ افراد کا مقصدِ حیات یہ ہے کہ وہ اپنی ہستی کو سوسائٹی میں مدغم کر دیں اور خود باقی نہ رہیں۔ اسی طرح جیسے مشین کے پرزوں کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کو باقی نہ رکھیں۔ ہستی صرف مشین کی باقی رہے۔ پرزوں کا کام یہ ہے کہ وہ مشین کے مقصدِ کلی کے حصول کی خاطر سرگرداں ہیں انہیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ وہ اس طرح گردش کیوں کر رہے ہیں۔ چنانچہ فرد اور سوسائٹی کے اس تصور کے ماتحت افراد کی حیثیت محض میکانکی پرزوں (Automatons) کی رہ جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مسلک نے یورپ میں ایک جدید مذہب کی صورت اختیار کر لی ہے جس میں اسٹیٹ کو ایک معبود کی حیثیت دیدی گئی ہے اور افراد کو پرستار کی۔ جس طرح کالی دیوی کے مندر میں اس کے پرستاروں (بھگتوں) کی قربانی چڑھتی تھی۔ جس طرح جگن ناتھ جی کے رتھ کے نیچے زندہ انسانوں کو کچل دیا جاتا تھا کہ وہ مکتی (نجات) حاصل کر لیں۱، اسی طرح اسٹیٹ کے دیوتا کے حضور افراد کی قربانیاں دی جاتی ہیں۔ چنانچہ ہکسلے نیشنلزم کے متعلق لکھتا ہے کہ

> یہ ایک بت پرستانہ مسلک اور مشرکانہ مذہب ہے۔ ایسا مذہب جو فساد اور تفریقِ انسانیت کے لئے ایسا طاقتور ہے کہ کوئی توحید پرست مذہب، فلاح و وحدتِ انسانیت کے لئے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔
>
> (The Perennial Philosophy)

اور (J.M.Murray) اپنی کتاب (Adam And Eve) میں لکھتا ہے کہ

> چونکہ انسانوں کے دل سے خدا کا عقیدہ نکل گیا ہے اس لئے اس خالی مکان پر اس جدید مذہب شیطان نے قبضہ کر لیا ہے۔

اصل یہ ہے کہ حکمران طبقے نے اپنی ہوسِ اقتدار کی تسکین کے لئے یہ ایک نیا حربہ تراشا ہے۔ پہلے جو کچھ مستبد مطلق العنان

---

۱ اگرچہ اب یہ وحشیانہ رسوم زمانے کے تقاضوں سے ختم ہو رہی ہیں لیکن پھر بھی ہندوستان میں ابھی تک ان دیوی دیوتاؤں کے حضور انسانوں کی قربانیاں دی جاتی ہیں۔

بادشاہ کے نام سے ہوتا تھا وہی کچھ اب "اسٹیٹ" کے مبہم نام سے ہوتا ہے۔ اسٹیٹ ایک مجرد تصور (Abstract Concept) ہے اور آج تک کوئی مدبر یا مفکر نہیں بتا سکا کہ اسٹیٹ کی تعریف (Definition) کیا ہے۔ لیکن جب اس تصور کو ذرا کرید کر دیکھا جائے تو اس کے نیچے وہی گروہ دکھائی دے گا جو اقتدار کو اپنے ہاتھوں میں رکھنا چاہتا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اسٹیٹ کو مضبوط رکھو اور اس سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ برسر اقتدار طبقے کے ہاتھ مضبوط کرو۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اسٹیٹ کے خلاف بغاوت نہ کرو۔ اور اس سے مفہوم یہ ہوتا ہے کہ کوئی ایسی حرکت نہ کرو جس سے حکمران طبقہ، اقتدار کی کرسیوں سے نیچے گر جائے۔ کمیونسٹوں کا دعویٰ ہے کہ ان کے ہاں سلطانیٔ جمہور (People's' Government) ہے۔ لیکن وہاں بھی جمہور (People) سے درحقیقت مراد حکمران طبقہ ہے۔ (Jack Belden) انقلابِ چین کے ضمن میں لکھتا ہے کہ

> کمیونسٹوں کے ہاں جمہور کا لفظ کچھ عجیب باطنی مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے۔ پہلے خاقانِ چین اپنے آپ کو آسمان کا بیٹا کہا کرتا تھا۔ اب چین کے کمیونسٹ اپنے آپ کو جمہور کا بیٹا کہتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر اب خدا کی جگہ جمہور نے لے لی ہے اور خاقان کی جگہ کمیونسٹوں نے۔ خاقان اس لئے حکومت کرتا تھا کہ اس کے پاس آسمانی سند تھی۔ اب کمیونسٹ اس لئے حکومت کرتے ہیں کہ ان کے پاس جمہور کی سند ہے... کمیونسٹ کہتے ہیں کہ جمہور کبھی غلطی نہیں کر سکتے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ "ہم جو جمہور کے نمائندے ہیں" کبھی غلطی نہیں کر سکتے......
>
> (China Shakes The World)

بہرحال یورپ میں یہ نظریہ عام ہو چکا ہے کہ "وجودِ حقیقی" اسٹیٹ (سوسائٹی، نیشن) کا ہے اور فرد کی ہستی، اسٹیٹ، (سوسائٹی) کے قیام کا ذریعہ ہے، مقصود بالذات نہیں۔ اگر سٹیٹ کا استحکام افراد کے زندہ رہنے سے ہوتا ہے تو انہیں زندہ رکھا جائے گا۔ اور اگر اس کے لئے ان کی جان کی ضرورت ہے تو انہیں جان دینی ہوگی۔ یہ اصول ہر جگہ کارفرما ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بعض ملکتوں میں حکومت کو اس سے واسطہ نہیں ہوتا کہ افراد پر کیا گزر رہی ہے اور وہ اپنے دن کیسے کاٹ رہے ہیں اور بعض مملکتوں میں جنہیں (Welfare States) کہا جاتا ہے، حکومت کا

فریضہ قرار دیا جاتا ہے کہ وہ افراد کی ضروریاتِ زندگی کی دیکھ بھال کرے۔ لیکن یہ دیکھ بھال بھی اسی انداز کی ہوتی ہے، جس انداز کی دیکھ بھال، "قربانی کے بکرے" کی کی جاتی ہے۔ ان افراد کی صحت، توانائی وغیرہ کی فکر اس لئے کی جاتی ہے کہ اس سے اسٹیٹ مضبوط ہوتی ہے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس سے ان کی پیداوار کی استعداد بڑھتی ہے[1]۔ یعنی وہ اچھی مشینیں بن جاتے ہیں۔

قرآنی نظریہ

قرآن، فرد کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ اتنی اہمیت کہ اس کا ارشاد ہے کہ جس نے ایک فرد کو ضائع کر دیا تو یوں سمجھو گویا اس نے تمام نوعِ انسانی کو تلف کر دیا! اور جس نے ایک فرد کی زندگی کا سامان بہم پہنچا دیا تو یوں سمجھو فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا (۵/۳۲) جیسے اس نے تمام نوعِ انسانی کو زندگی بخش دی۔ اس کی ساری تعلیم فرد کی ذات (Personality) کے تشخص (Determination) اور استحکام (Crystallisation) کے لئے ہے۔ اس کی یہ تعلیم کہ ہر فرد اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے اور اس کے اعمال کا نتیجہ اس کی اپنی ذات کے لئے ہے، استحکامِ انفرادیت (Individuality) کی زندہ دلیل ہے۔ (فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ۱۰۴/۶) فرد کی تکمیلِ ذات ہی اس کی تعلیم کا منتہیٰ ہے۔ اس لئے کوئی ایسا نظریہ، ایسا تصور، ایسا مسلک، ایسا مذہب، جس میں فرد کی انفرادیت میں کمی واقع ہو جائے اور اس کی ذات میں اضمحلال آجائے اس کے نزدیک مردود و مطرود ہے۔ بقول اقبالؒ

اگر یک ذرہ کم گردد ز انگیزِ وجودِ من　　باین قیمت نمی گیرم حیاتِ جاودانے را

لیکن وہ کہتا ہے کہ فرد کی ذات کی تکمیل، جماعت کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اس لئے فرد کے لئے ضروری ہے کہ وہ جماعت کے ساتھ رہے۔

---

[1] میں نے مشہور روسی کمیونسٹ (M.D. Kammari) کی کتاب (Socialism and individual) کا بڑے شوق اور بے تابی سے مطالعہ کیا۔ اس لئے کہ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ سوشلزم کے نظام میں ایک فرد کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے اور فرد کی پرورش سے ان کے ہاں مقصود کیا ہے لیکن مجھے اس کے بعد بڑی مایوسی ہوئی۔ اگرچہ اس کتاب میں ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ "اشتراکی سوسائٹی کا مطمحِ نگاہ فرد کی جسمانی اور روحانی صلاحیتوں کی تکمیل ہے"۔ لیکن اس میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ افراد کی کام کرنے کی استعداد کو زیادہ سے زیادہ بڑھا دینا مقصود ہے تاکہ پیداوار میں اضافہ ہو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ (۹/۱۱۹)

اے ایمان والو، قانون خداوندی سے ہم آہنگ رہو (اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ) جو لوگ اس صداقت پر ایمان رکھتے ہیں ان کے ساتھ رہو

وہ کہتا ہے کہ انسان کی ذات تباہی اور بربادی سے اسی صورت میں محفوظ رہ سکتی ہے کہ وہ ایک ایسے معاشرے کا جزو ہو جس کے افراد ایک دوسرے کو تعمیری نتائج مرتب کرنے کی تلقین کریں۔ اور ایک دوسرے کی ثابت قدمی کا موجب بنیں۔ (وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۱۰۳/۳) سارا قرآن اسی تعلیم کا حامل ہے۔ لہذا قرآن کی رو سے جماعت ذریعہ ہے فرد کی تکمیل ذات کا۔ یعنی یورپ میں فرد ذریعہ ہے اور سوسائٹی مقصود۔ اس کے برعکس قرآنی تعلیم کی رو سے سوسائٹی ذریعہ ہے اور فرد مقصود۔ اقبال کے الفاظ میں" فرد اور جماعت کا تعلق" مسافر اور قافلہ کا ہے۔

زندگی انجمن آرا و نگہدار خود است

ایکہ در قافلہ باہمہ رو بے ہمہ شو

"باہمہ رفتن اور بے ہمہ شدن" یہ ہے فرد اور جماعت کا تعلق۔ یہی وجہ ہے کہ جب نبی اکرمؐ پر حقائق کائنات کو منکشف کیا گیا (جسے نبوت کہتے ہیں) تو آپ کو حکم دیا گیا کہ اب اٹھو! اور افراد معاشرہ کو ایک قافلہ کی شکل میں ترتیب دو۔ مزمل کے یہی معنی ہیں۔ (قافلہ میں ایک اونٹ کے کجاوے میں دو سواریاں بیٹھتی ہیں۔ اس کی بڑی ضرورت ہوتی ہے کہ ان دو سواریوں میں جسمانی وزن اور مزاج کے اعتبار سے زیادہ سے زیادہ موافقت ہو۔ اس سے سفر عمدگی سے کٹ سکتا ہے۔ اس قسم کی سواریوں کو اکٹھا کرنا عمل تزمیل کہلاتا ہے اور یہیں سے لفظ مزمل ہے یعنی بہت زیادہ تزمیل کرنے والا) اسی لئے قرآنی نظام ربوبیت میں افراد کو ایک قافلہ کی شکل میں ترتیب دیا جاتا ہے جس کا مقصود ہر مسافر کو اس کی منزل تک پہنچانا ہوتا ہے جو قافلہ افراد کارواں کو ان کی منازل تک نہیں پہنچاتا، وہ قافلہ نہیں۔ رہزن اور قزاق ہے قرآن نے اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (۳/۲۰۰)

اے ایمان والو! خود بھی مستقل مزاج اور ثابت قدم رہو اور دوسروں کے ثابت قدم رہنے کا ذریعہ بنو۔ اس طرح سفر زندگی میں ایک دوسرے کے محافظ بنو۔ اور سب مل کر قانون خداوندی سے ہم آہنگی اختیار کرو تاکہ تمہاری کھیتیاں پروان چڑھیں۔

یعنی اس تمام اجتماعی عمل (Process) کا مقصد یہ ہے کہ (لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ) تمہاری ذات کا غنچہ سا یہ نشوونما پاکر کھیتی بن جائے۔ - - - - - - - - - - - جس معاشرے میں افراد کی مضمر صلاحیتیں نشوونما پاکر تکمیل تک نہیں پہنچتیں وہ معاشرہ باطل کی بنیادوں پر قائم ہوتا ہے اور اس کا افراد سے اپنی اطاعت کا مطالبہ یکسر استبداد ہے۔ جو معاشرہ حق کی بنیادوں پر قائم ہوگا، وہ افراد کی ذات کی نشوونما کا ذریعہ بنے گا۔ اُن سے اپنے لئے کچھ نہیں چاہے گا۔ دیکھئے قرآن نے اس بنیادی اصول کو کیسے لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جن[1] وانس اپنی پیدائش کے مقصد کو اسی صورت میں حاصل کرسکتے ہیں کہ وہ قانونِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کریں (وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۵۱/۵۶) یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ تمام افراد، نظامِ خداوندی کے ساتھ منسلک ہو جائیں۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اس میں نظامِ خداوندی کا کچھ اپنا فائدہ ہے۔ بالکل نہیں۔ اس سے یہ نظام اپنے لئے کچھ نہیں چاہتا (مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ۵۱/۵۷) نظام، افراد معاشرہ سے کچھ لینے کے لئے وجود میں نہیں آتا خود ان کی پرورش اور قوت کا انتظام کرنے کے لئے وجود میں آتا ہے (اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ۵۱/۵۸) (اللہ کا نظام رزق دینے والا اور بڑی قوتوں کا مالک ہے)۔ وہ کھانے کو دیتا ہے مگر کھانے کیلئے لیتا نہیں۔ (وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ۶/۱۴) وہ افراد سے عبودیت (یعنی اپنی صلاحیتوں کو نظام کے مقرر کردہ ضوابط کے مطابق صرف کرنے) کا مطالبہ اس لئے کرتا ہے کہ اس سے خود افراد کی ذات بھرپور جوانیوں تک پہنچکر کامل اعتدال حاصل کرسکتی ہے (اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کا یہی عملی مفہوم ہے۔ عَبَّدَ کے معنی ہیں اونٹ وغیرہ کو (Break) کرکے سواری کے قابل بنا لینا۔ اور عوان کے معنی ہیں جوان اور متناسب الاعضاء)۔

ظاہر ہے کہ فرد کی ذات کی تکمیل کے لئے حریت (آزادی) شرطِ اولیں ہے۔ استبداد اور محکومی میں انسانی ذات کی نشوونما ناممکن ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ ایک رسول کے سامنے (جو افراد کی تکمیلِ ذات

---

[1] جن سے کیا مراد ہے اسکے لئے معارف القرآن کی دوسری جلد دیکھئے۔ اس وقت صرف اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ قرآن میں انس کے ساتھ جن کا لفظ بادیہ نشین صحرا نورد خانہ بدوش، بدوؤں کے لئے آیا ہے جو آبادیوں سے دور نگاہوں سے اوجھل رہا کرتے تھے (جن کے لفظی معنی یہی ہیں)

کے لئے جماعت بنانا ہے) کس قدر مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ اس نظریے کے ماتحت کہ فرد کی ہستی کچھ نہیں، ہستی صرف سوسائٹی کی ہے، پارٹی بنانا بہت آسان ہے۔ اس کے لئے قوت کی ضرورت ہے جو پارٹی کے "ڈسپلن" کو برقرار رکھ سکے۔ یہ پارٹی نہیں ہوتی درحقیقت فوجی نظام ہوتا ہے جس میں افراد کی حیثیت سپاہیوں کی اور اربابِ اقتدار کی حیثیت ان کے کمانڈر کی ہوتی ہے۔ سپاہی کا کام حکم کی تعمیل کرنا ہوتا ہے اور بس۔ نہ اس کی کوئی رائے ہوتی ہے نہ فکر۔ نہ اس سے مشورہ لیا جاتا ہے نہ اس کی منشار دریافت کی جاتی ہے۔ بہترین سپاہی وہ ہے جس میں "میں" کا احساس یکسر ختم ہو چکا ہو۔ جس میں یہ احساس ذرا بھی باقی ہو اسے کچل دیا جاتا ہے۔ اور تو اور جن ممالک میں دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ وہاں سلطانیٔ جمہور (People's Government) ہے وہاں بھی یہ عالم ہے کہ کوئی فرد اپنی انفرادیت کا احساس تک نہیں رکھ سکتا۔ (مثلاً) چین میں اس اندازِ حکومت کا ابھی ابھی آغاز ہوا ہے (Jack Belden) جو انقلابِ چین سے بے حد متاثر ہے اور اسے قدرت کا معجزہ قرار دیتا ہے، اس باب میں رقمطراز ہے کہ

> وہاں کمیونسٹوں کی کوشش یہ ہے کہ سوسائٹی کے حقوق کو افراد کے حقوق پر غالب قرار دے کر ملک کی وحدت قائم رکھی جائے۔ اگر تم نے کبھی اپنی انفرادیت کا مظاہرہ کر دیا تو یہ جرمِ عظیم ہوگا۔ تمہیں محاسبۂ نفس کرنا ہوگا تمہیں سوسائٹی کے جلسہ میں جا کر اپنے آپ کو تنقید کے لئے پیش کرنا ہوگا۔ تمہیں اپنی غلطی کا اعتراف کرنا ہوگا۔

(China Shakes The World)

یعنی کمیونزم کے نظام میں، معاشرہ افراد کی ربوبیت (پرورش) کی ذمہ داری تو لیتا ہے لیکن اُن کی انفرادیت (Individuality) کو ذبح کر ڈالتا ہے۔ قرآن نے بھی اس قسم کے "نظامِ پرورش" کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فرعون کا دعویٰ یہی تھا کہ أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ (٧٩/٢٤)۔ "میں سب سے بڑھ کر تمہاری پرورش کا انتظام کرنے والا ہوں۔" اس نے مصر کی تمام زمین اور اس کے دریاؤں کو اپنے قبضے میں رکھا تھا (٤٣/٥١)۔ یہی وہ پرورش کے احسانات تھے جنہیں اس نے (حضرت) موسیٰ کو جتایا۔ لیکن حضرت موسیٰؑ کے ایک جواب نے فرعونی ربوبیت اور خدائی ربوبیت کے بنیادی فرق کو بے نقاب کر کے رکھ دیا۔ حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ تِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَّدتَّ بَنِي إِسْرَائِيلَ (٢٦/٢٢) یہ تمام سامانِ نشوونما جن کا تو احسان جتاتا ہے، محض اس لئے ہیں کہ تو بنی اسرائیل

کو اپنے بنائے ہوئے سانچوں میں ڈھالے۔ ان کی تمام قوتوں کو اپنے مفاد کی خاطر استعمال کرے۔ انہیں اپنے مقاصد کی گاڑی میں جوتنے کے لئے تیار کرے۔ ان کی تمام مردانگی کے جوہر ختم کر دے (یذبح ابناءھم) اور ان کی نسائیت کے خصائص کو زندہ رہنے دے (ویستحیون نساءھم) ان کی تعلیم بھی اپنی مرضی کے مطابق کرے اور ان کی تربیت بھی اپنے مفاد کے حصول کی خاطر۔ ان کی انفرادیت کو ذبح کر ڈالے۔

یہ ہے "ربوبیت" (پرورش) کا فرعونی نظام جس میں حکومت، یا نظام، پیداوار کے ذرائع کو اپنی تحویل میں رکھ لیتا ہے تاکہ افراد کو مطلب براری کے لئے بطور اشیاء استعمال کرے۔ اس نظامِ پرورش میں، جس کا نام کچھ ہی رکھ لیا جائے (سوسائٹی، نیشن، اسٹیٹ، جمہور) فرد اپنی حیثیت کچھ نہیں رکھتا۔ اس کے برعکس نظامِ ربوبیت میں، جماعت کی تشکیل ہی اس لئے کی جاتی ہے کہ فرد کی انفرادیت کامل طور پر نشو و نما پا سکے۔ غور کیجئے کہ یہ مرحلہ کس قدر مشکل ہوتا ہے۔ نظام کے استحکام کا تقاضا ہوتا ہے کہ پورا پورا نظم و ضبط قائم رکھا جائے۔ اور دوسری طرف افراد کی ذات کی نشو و نما اور انفرادیت کی پرورش کا تقاضا ہوتا ہے کہ ان کی حریتِ فکر اور آزادیٔ رائے و عمل کو زیادہ سے زیادہ وسیع کیا جائے۔ ان دو متضاد تقاضوں میں امتزاج پیدا کرنا کچھ آسان کام نہیں۔ یہی وہ اہم مرحلہ تھا جس کے متعلق نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ (اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ۷۳/۵) تم پر ایک بہت بڑی ذمہ داری، ایک بوجھل فریضہ عائد کیا جا رہا ہے۔ وہ ذمہ داری کہ جس سے "آپؐ کی کمر ٹوٹ رہی تھی" (وِزْرَكَ الَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۹۴/۳) (اس کتاب کا یہ موضوع نہیں راور نہ ہی اس کی یہاں گنجائش ہے) ورنہ آپ کو تفصیل[1] سے بتایا جاتا کہ حضورؐ نے اس کمر شکن ذمہ داری کو کس حسن و خوبی سے نباہا اور اس طرح جس معاشرہ کی تشکیل کی اس میں یہ دونوں متضاد عناصر کس طرح شیر و شکر ہو کر ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے تھے۔ نظام کا نظم و ضبط (ڈسپلن) ایسا کہ اس کی مثال شاید ہی کہیں اور ملے۔ اور اس کے ساتھ افرادِ معاشرہ کی حریتِ فکر و اظہار کا یہ عالم کہ فرزندانِ آدم میں سے شاید ہی کسی کو ایسی آزادی نصیب ہوئی ہو۔ اس کا امکان صرف قرآنی نظامِ ربوبیت ہی میں ہے۔ اس کے سوا اس کی کوئی دوسری شکل نہیں۔ یہی وہ نظام ہے جس میں "حاکم و محکوم" کا تصور قاطبۃً ختم ہو جاتا ہے اور تمام افرادِ معاشرہ کا باہمی تعلق رفقائے کار کا

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے "معراجِ انسانیت" (بابِ منصبِ رسالت و امامت)

رہ جاتا ہے جن میں باہمی نظم و ضبط کا ذریعہ وہ قانون ہوتا ہے جو ان میں سے کسی کا خود ساختہ نہیں ہوتا بلکہ خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ اس کے مطابق معاشرہ کا نظم و ضبط بھی قائم رہتا ہے اور افراد کی ذات کی تکمیل بھی ہوتی جاتی ہے۔

جیسا کہ اس سے پہلے بھی لکھا جا چکا ہے، اب دنیا آہستہ آہستہ، زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر از خود ان اصولوں کی طرف آ رہی ہے جنہیں قرآن نے پیش کیا تھا۔ چنانچہ اس ضمن میں بھی اب دنیا کا قدم اسی طرف اٹھ رہا ہے اسی یورپ سے جہاں یہ کہا جا رہا ہے کہ سب کچھ معاشرہ ہی ہے، فرد کی حیثیت کچھ نہیں، اب یہ آوازیں بھی اُٹھ رہی ہیں کہ اصل مقصود فرد ہے اور اس کی ذات کی تکمیل ہی مقصودِ معاشرہ ہے۔ ۱۹۵۱ء میں کولمبیا یونیورسٹی میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی تھی کہ وہ غور کرے کہ "زندگی کے اندازِ جمہوریت کے ساتھ سائنس، فلسفہ، اور مذہب کا کیا تعلق ہے"۔ وہ کانفرنس جس نتیجہ پر پہنچی وہ یہ تھا کہ

> اصول بس ایک ہی ہے۔ یعنی احترامِ آدمیت۔ انسانی ذات کی قدر۔ دنیا کی تعمیر تو صرف اسی ایک اصول پر ہو سکتی ہے۔ انسانی ذات جس احترام کی مستحق ہے اگر اس میں ذرا سی کمی روا رکھی گئی۔ اور بعض انسانوں کو دوسرے انسانوں کے سیاسی اور اقتصادی مفاد کا آلہ کار بنا دیا گیا تو مہذب زندگی کی ساری عمارت نیچے آگرے گی۔
>
> انسانی تہذیب و ثقافت کی عمارت صرف احترامِ ذات کے ستون پر قائم رہ سکتی ہے۔

الیگزنڈر لووڈے (Alexander lovedey) جو "لیگ آف نیشنز" کے شعبۂ مالیات و اقتصادیات کا ڈائریکٹر رہ چکا ہے، اپنی کتاب (The Only Way) میں لکھتا ہے کہ

> صداقت کا معیار زندگی ہونا چاہیئے۔ فرد کی زندگی۔ فرد جو مقصود بالذات ہو۔ کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ نہ ہو۔

(M.artin Buber) لکھتا ہے کہ

> جب انسان اپنے آپ کو ایک مثبت حقیقت کے طور پر "میں" نہیں کہہ سکتا، وہ خدا کو "تو" بھی نہیں کہہ سکتا......... جو آواز کا جواب نہیں دے سکتا وہ آواز سننے کے قابل نہیں سمجھا جاتا..... انسان ہی ہستی کے امکانات کی مجسّد شکل ہے۔ یہی کائنات کی ہر حرکت کا مرکز ہے...... اصل یہ ہے کہ ابھی تک یہ حقیقت پردے سے باہر ہی نہیں آئی کہ کائنات میں انسان کا صحیح مقام کیا ہے[1]۔

---

[1] (فٹ نوٹ صفحہ ۱۸۹ پر دیکھئے)

(Ernst Cassirer) اپنی شہرۂ آفاق کتاب (An Essay On Man) میں لکھتا ہے کہ

انسان کی قیمت خارجی اور اضافی چیزوں سے نہیں متعین کی جا سکتی۔ اس کی اصل قیمت اس کی اپنی ذات ہے۔

(Lewis Mumford) ٹالسٹائی کے حوالے سے لکھتا ہے کہ

ہر فرد میں انسانیت کی تمام ممکنات کا بیج موجود ہوتا ہے۔

(The Conduct Of Life)

اس لئے معاشرہ کا کام یہ ہے کہ وہ ممکنات کے اس بیج کو حقیقت کا جیتا جاگتا شجر ثمردار بنا دے۔ معاشرے کا یہی مقصد ہے اور اسی لئے اس کی ضرورت ہے۔ ممفورڈ کے الفاظ میں:

انسان کو اپنی پوری قامت تک پہنچنے کے لئے عالمگیر معاشرہ کے تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔

(Nicoles Berdyaeu) افراد اور معاشرہ کے تعلق کے ضمن میں اپنی کتاب (Slavery And Freedom) میں لکھتا ہے کہ

قدر اعلیٰ انسانی ذات ہے۔ معاشرہ نہیں ...... ہر ذات اپنی دنیا آپ ہوتی ہے۔ لیکن انسانی ذات دنیا کی تاریخ اور کائنات کی فکر کے امکانات کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے ..... اگر معاشرہ کا یہ مطالبہ ہے کہ انسان میں جس قدر خوبیاں اور صلاحیتیں ہیں وہ اس کی عطا کردہ ہیں اس لئے انسان کو چاہیئے کہ وہ ان تمام خوبیوں اور صلاحیتوں کو معاشرے کے حضور پیش کرے۔ تو یہ غلامی کی بدترین شکل ہے ...... انسانی ذات معاشرہ کا جزو نہیں ہوتی۔ اسے معاشرہ کے اندر ضم نہیں ہونا چاہیئے ...... یہ عجیب تماشا ہے کہ انسان خود ہی معاشرے کی تخلیق کرتا ہے اور خود ہی اس سے مسحور ہو کر اس کی محکومیت اختیار کر لیتا ہے .... یاد رکھئے کہ ایک انسان کی موت خواہ وہ کیسا ہی حقیر انسان کیوں نہ ہو، حکومتوں اور سلطنتوں کی موت سے کہیں

(ف ٹ نوٹ صفحہ ۱۸۸) "پردے سے باہر" تو چودہ سو سال ہوئے آ چکی تھی لیکن اس کے مجرم ہم (مسلمان) ہیں کہ ہم نے اس حقیقت کو دوسروں تک پہنچایا نہیں۔ دوسروں تک پہنچانا تو ایک طرف، اسے خود ہم نے اپنے خود ساختہ مذہب کے دبیز پردوں میں اس طرح چھپا دیا کہ نہ لم یکن شیئاً مذکوراً کہ یہ کوئی قابل ذکر شے ہی نہ تھی۔

زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ ...... ایک مکمل مملکت وہ ہے جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان پر اپنا حکم نہ چلا سکے۔ ..... کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ دوسروں پر اپنا اقتدار قائم کرے۔ نہ فرد کو، نہ افراد کی کسی جماعت کو، نہ تمام کی تمام قوم کو۔ قوت کا استعمال انسان کی حفاظت کے لئے ہے۔

فرد اور معاشرہ کے تعلق کی نسبت پروفیسر (Cassirer) لکھتا ہے:

(اس میں شبہ نہیں کہ) ایک فرد اپنی ذات کا احساس صرف معاشرہ کے اندر ہی کر سکتا ہے اور اس طرح معاشرہ اس کے شعور ذات کا ذریعہ بنتا ہے۔ لیکن یہ ذریعہ ایک، خارجی قوت نہیں ہوتا۔ انسان بھی حیوانات کی طرح معاشرے کے قوانین کی اتباع کرتا ہے۔ لیکن حیوانات کے برعکس، اس میں اس کی قوت بھی ہے کہ یہ معاشرہ کو بدل ڈالے۔

جس معاشرہ میں فرد کی ذات کا احترام نہیں ہوتا (جیسا کہ ہم "اسٹیٹ" کے تصور میں پہلے دیکھ چکے ہیں) وہ فرد کی کام کی استعداد کو تو بڑھاتا ہے (کیونکہ اس نے فرد سے کام لینا ہوتا ہے) لیکن اس کی قوت ارادی کو کچلتا رہتا ہے (تاکہ وہ جانوروں یا مشین کی طرح بلا چون و چرا اطاعت کرتا چلا جائے) اس سے تکمیل ذات کبھی نہیں ہو سکتی ...... تکمیل ذات کے لئے استعداد اور قوت ارادی دونوں کی نشوونما ضروری ہے۔ چنانچہ اس باب میں علم تجزیہ نفس کا ماہر (Wilhelm Stekel) اپنی کتاب (Peculiarities Of Behaviour) میں لکھتا ہے کہ

جہاں قوت ارادی اور استعداد ہم آہنگ ہو جاتی ہیں وہاں شخصیت توی نظر آتی ہے۔

آپ نے غور کیا کہ اب خود مغرب کے مفکرین، کس طرح انسانی ذات کی قدر و قیمت اور احترام آدمیت کا اعتراف کرتے جا رہے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کے پاس کوئی صحیح پیمانہ نہیں جس سے فرد اور معاشرہ کا حقیقی تعلق ماپا جا سکے، اس لئے یہ تفریط سے نکل کر افراط کی طرف جا رہے ہیں۔ تفریط یہ تھی کہ معاشرہ سب کچھ ہے فرد کی ذات کچھ نہیں۔ اور افراط یہ ہے کہ

وہ معاملہ جس کا مجھ سے تعلق نہیں۔ اٹھا کر پھینک دو۔ سب سے اس سے کیا واسطہ، شاید تم کہو کہ کم از کم "کار خیر" سے تو میرا واسطہ ہوگا ہی۔ لیکن خیر کیا اور شر کیا: میرا معاملہ فقط میری اپنی ذات سے ہے اور میں نہ "خیر" ہوں نہ "شر"۔ میرے لئے دونوں لفظ بے معنی ہیں۔ میرے نزدیک میرے اپنے آپ سے بڑھ کر اور کچھ نہیں۔

(Max Stirner - The Ego And His Own)

یہ وہی تصور ہے جو کاروباری معاملات میں خود غرضی اور مذہبی دنیا میں خانقاہیت کہلاتا ہے۔ اس تصور پر اب ایک جدید فلسفہ کی بنیاد رکھی جا رہی ہے۔ لیکن یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، جب انسان کے سامنے مستقل اقدار کا صحیح پیمانہ نہ ہو تو وہ ہمیشہ افراط و تفریط کا جھولا جھولتا رہے گا۔ یہ پیمانہ صرف وحی کی رو سے مل سکتا ہے اور قرآنی نظامِ ربوبیت اسی پیمانے کے مطابق متشکل ہوتا ہے۔ اس نظام میں فرد اور معاشرہ میں وہ امتزاج پیدا ہو جاتا ہے جسے (Andre Gide) "جنت اور دوزخ کا رشتہ مناکحت" اور "آگ اور پانی" کا میل قرار دیتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ اگر آگ اور پانی کا میل ہو جائے تو اس سے ایسی بھاپ بنتی ہے جس کی قوتیں بے پناہ ہیں۔ یہ ملاپ، قرآنی نظامِ ربوبیت میں ہو جاتا ہے اور اس سے وہ انقلابی قوتیں پیدا ہو جاتی ہیں جن کی شہادت صحرائے حجاز کے ذرہ ذرہ سے مل سکتی ہے۔

چونکہ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) وہ بنیادی حقیقت جو قرآنی نظامِ ربوبیت کو مارکس کے معاشی نظام سے متمیز کرتی ہے، جذبۂ محرکہ (Incentive) کا سوال ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس باب میں ان کے نقطۂ نگاہ کو زیادہ وضاحت سے سامنے لایا جائے۔ مارکسزم کے حامیوں کا موقف یا اعتراض اس قسم کا ہوتا ہے:-

کمیونزم کا مؤقف اور اعتراض

تم لوگ خدا یا روح کو جذبۂ محرکہ قرار دیتے ہو۔ خدا اور روح کے تصورات محض تجریدی (Abstract) تصور ہیں۔ نہ ہم خدا کے متعلق کچھ جانتے ہیں نہ روح کے متعلق۔ ان چیزوں کو صرف اعتقاداً مانا جاتا ہے۔ اس لئے یہ بنیاد محض تصوراتی (Conceptual) ہوتی ہے، ٹھوس (Concrete) نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس ہم یہ کہتے ہیں کہ اس معاشرے میں جس میں ذاتی املاک کا سوال نہ رہے، معاشرہ کی مرفہ الحالی، افراد کی محنت کی نسبت سے ابھرتی ہے۔ جس قدر افراد زیادہ محنت

ل Quoted By Harry Slochower in "No Voice is Wholly Lost"

کریں گے اسی قدر وہ معاشرہ مرفہ الحال ہوگا۔ اور معاشرہ کے مرفہ الحال ہونے کے معنی یہ ہیں کہ خود ان افراد کا معیار زندگی بھی بلند ہوتا جائے گا جو زیادہ محنت کرتے ہیں۔ اس لئے اس زیادہ محنت کرنے میں خود ان افراد کا اپنا فائدہ ہوتا ہے۔ بنا بریں یہ جذبہ نہایت عمدہ، پائیدار اور معقول جذبۂ محرکہ بن سکتا ہے۔ اس کے نتائج ٹھوس شکل میں سامنے آجاتے ہیں۔

اس کے علاوہ ایک بڑی حقیقت اور بھی ہے۔ چونکہ روحانی ترقی یا تربیتِ نفس، ایک غیر مرئی اور غیر محسوس سی کیفیت کا نام ہے؛ اس لئے اگر اسے زندگی کا مقصد قرار دیا جائے تو مفاد پرستی کی فریب کار قوتوں کو عوام کو بہکا دینے کا موقعہ بہت زیادہ مل جاتا ہے۔ وہ مذہب پرست گروہ کو ساتھ ملا کر عوام میں اس خیال کو عام کر دیتے ہیں کہ اصل مقصودِ حیات روحانی ترقی ہے اور روحانی ترقی کا راز مذہب پرستی (یا تصوف کی ریاضتوں) میں ہے۔ دنیاوی کاروبار میں نہیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ عوام ان کے فریب میں آجاتے ہیں اور مفاد پرستانہ قوتیں انہیں اس مقدس خواب میں سُلا دینے اور سوتا رہنے دینے میں کامیاب ہو جاتی ہیں (یہی وجہ تھی کہ مارکس نے کہا تھا کہ خدا کا تصور وہ افیون ہے جسے مفاد پرستانہ قوتوں نے ابلہ فریبی کے لئے وضع کیا تھا) لہٰذا عملی مصلحت (Expediency) کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس جذبۂ محرکہ کی جگہ اس جذبہ کو بنیاد قرار دیا جائے جس میں فریب کاری کی گنجائش نہیں۔ یعنی لوگوں سے کہا جائے کہ ایسے معاشرہ کا قیام اور اس کے بعد اس کے استحکام کے لئے محنت اور کوشش میں تمہاری اپنی معاشی زندگی کی مرفہ الحالی کا راز پوشیدہ ہے اور یہی مقصودِ زندگی ہے۔ یہ بنیاد بہت محکم اور پائیدار ہے۔

یہ ہے کم و بیش وہ موقف جسے یہ لوگ بالعموم اختیار کرتے ہیں اور اسی سے وہ خدا اور نفسِ انسانی کے تصور کے خلاف بغاوت کا اعلان کرتے ہیں۔ آیئے ذرا اس موقف اور اعتراض کا تجزیہ کر کے

اس اعتراض کا تجزیہ

اصل حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ ایسے اساسی اور بنیادی مسائل میں مصلحت (Expediency) کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اصل سوال یہ ہے کہ خدا ہے یا نہیں۔ اگر وہ ہے تو اس کا ہمارے ساتھ کیا تعلق ہے۔ اور دوسرے یہ کہ انسان صرف جسم ہی جسم ہے یا اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہے (جسے نفس کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے)۔ اگر خدا ہے اور اس کا ہمارے ساتھ تعلق یہ ہے کہ اس نے ایک ضابطۂ حیات

دیا ہے جس کی رو سے تمام اقوامِ عالم کی ربوبیت ہو جاتی ہے اور اس ربوبیت میں جسم کے علاوہ نفس کی ربوبیت بھی شامل ہے جس سے انسان کو حیاتِ جاوداں مل جاتی ہے تو مصلحتوں کے تقاضے کچھ بھی ہوں، یہ حقائق اپنی جگہ اٹل رہیں گے۔ اگر کوئی شخص آشوبِ چشم کی وجہ سے اندھیرے میں رہنا چاہتا ہے (یعنی اس کی مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ اسے سورج کی روشنی دکھائی نہ دے) تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ سورج کے وجود کا انکار کر دے۔ جس طرح سورج کی ہستی، دیکھنے یا نہ دیکھنے والوں کی محتاج نہیں۔ اسی طرح خدا، نفسِ انسانی اور حیاتِ جاوداں کی حقیقت ماننے یا نہ ماننے والوں کی رہینِ منت نہیں۔ لہٰذا اگر خدا، نفسِ انسانی اور حیاتِ اخروی کا وجود ہے تو ان سے اس لئے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کے اقرار سے کسی خاص مقصد کے حصول میں کوئی دقت پیش آتی ہے۔

قرآن کی تمام عمارت اس پر اٹھتی ہے کہ خدا ہے۔ اس کا دیا ہوا ضابطۂ قانون ہے۔ انسان، جسم کے علاوہ نفس کا حامل بھی ہے اور تربیتِ نفس سے حیاتِ جاوید مل جاتی ہے۔ اگر کوئی شخص، کوئی مکتبِ فکر یا کوئی نظام ان حقائق کو تسلیم نہیں کرتا تو ہم اس سے ان حقائق کے متعلق علمی سطح پر گفتگو کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ہم اسے بتائیں گے کہ اب کس طرح، خود مغرب کے سائنسدان اور مفکرین رفتہ رفتہ ان حقائق کو تسلیم کئے جا رہے ہیں[1]۔ لیکن اس بحث کا یہ مقام نہیں اس لئے کہ زیرِ نظر کتاب کے مخاطب وہی ہیں جو ان حقائق کو تسلیم کرتے ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ خدا اور نفسِ انسانی کا تصور تجریدی (Abstract) ہے اور یہ چیزیں کسی کے سامنے مرئی اور محسوس طور پر نہیں آتیں اس لئے یہ کسی انقلاب کی محکم بنیاد نہیں بن سکتیں۔ انسان کیلئے جذبۂ محرکہ صرف مرئی اور محسوس اشیاء ہی ہو سکتی ہیں تو اول تو یہ مفروضہ ہی غلط ہے۔ اربابِ فکر کا یہ خیال ہے کہ تہذیب کی بنیاد ہی غیر مرئی تصورات اور احساسات پر ہے۔ اگر آپ اس باب میں تفصیل معلوم کرنا چاہیں تو (Dennison) کی کتاب (Emotion As The Basis of Civilisation) دیکھئے۔ اور تو اور خود مارکس کو اپنے نظریہ کی تائید کے لئے بھی غیر مرئی فلسفیانہ سہارا ڈھونڈنا پڑا۔ (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) اس نے کہا کہ اس دعوے کی دلیل (کہ یہ معاشی انقلاب آکر رہے گا) یہ ہے کہ یہ انقلاب تاریخی وجوب (Historic Neccessity)

[1] میری زیرِ تسوید تالیف (معارف القرآن کی پانچویں جلد) اسی موضوع پر مشتمل ہے۔

کا تقاضا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ تاریخی وجوب، ایک غیر مرئی فلسفیانہ تصور ہے، کسی ٹھوس چیز کا نام نہیں۔ تاریخ کے واقعات تو مرئی کہلا سکتے ہیں لیکن تاریخ کا فلسفہ مرئی نہیں ہوتا۔ اسی طرح تاریخ کی قوت (Force of History) بھی کسی ٹھوس مرئی شے کا نام نہیں، محض تجریدی تصور ہے۔ اگر اس قسم کا تجریدی تصور انقلاب کی راہ میں مانع نہیں ہو سکتا تو خدا اور نفس کے تصور کا تجریدی ہونا کیوں قابلِ اعتراض ہے (ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ مارکس کا یہ فلسفہ انقلاب آفریں نہ بن سکا کیونکہ یہ فلسفہ غلط بنیادوں پر اٹھا تھا۔ اسے اس کی بجائے عوام کے جذبات کو اپیل کرنا پڑا۔)

اب رہا آخری اعتراض کہ تربیتِ نفس (یا معترضین کے الفاظ میں روحانی ترقی) کو جذبۂ محرکہ قرار دینے میں خطرہ یہ ہے کہ مفاد پرست قوتیں اس سے ناجائز فائدہ اٹھاتی ہیں اور عوام کو یہ کہہ کر فریب دیدیتی ہیں کہ روحانی ترقی کے طریقے اور ہیں اس لئے تم اپنی تمام تر توجہ اُن طریقوں (پوجا پاٹ یا ورد وظائف) پر رکھو اور دنیا کے معاملات میں سر نہ کھپاؤ۔ اس سے روحانی ترقی رک جاتی ہے۔ چونکہ "روحانی ترقی" کے ماپنے کا کوئی مقیاس نہیں ہوتا اس لئے عوام ان کے دام فریب میں آ کر معاشی دنیا میں دلچسپی لینا چھوڑ دیتے ہیں۔

عام دنیائے مذاہب میں یہ اعتراض فی الواقعہ بڑا وقیع ہے کیونکہ وہاں اعمال کے نتائج تمام تر "قیامت" پر اُٹھا رکھے جاتے ہیں۔ لیکن قرآن کی دنیا میں یہ اعتراض پرِ کاہ کی بھی حیثیت نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ (جیسا کہ ہم شروع میں شرح و بسط سے لکھ چکے ہیں) قرآن کی رُو سے تربیتِ نفس صرف اس

قرآن کی موجودگی میں فریب کا امکان نہیں

معاشرے میں ہو سکتی ہے جس میں تمام افراد ربوبیتِ عامہ یا مفادِ کلی کے لئے مصروفِ جد و جہد رہیں۔ اس کے نزدیک اعمالِ حسنہ کے زندہ نتائج اسی دنیا کی خوشحالیوں اور خوشگواریوں کی شکل میں سامنے آ جاتے ہیں۔ جن اعمال کا نتیجہ اس دنیا کی کامرانی نہیں، وہ اعمال "قیامت" میں بھی کوئی وزن نہیں رکھتے۔ لہٰذا تربیتِ نفس (یا روحانی ترقی) کے ماپنے کا پیمانہ یہ ہے کہ ہماری دنیا کس حد تک حسین بن چکی ہے۔ اس معیار کی موجودگی میں مفاد پرست قوتوں کے لئے فریب دہی کا کوئی امکان ہی نہیں رہتا۔

اس مقام پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ تم کہتے ہو کہ قرآن کی موجودگی میں مفاد پرست قوتوں کے لئے فریب دہی کا

امکان ہی نہیں رہتا۔ حالانکہ مفاد پرست قوتوں نے مسلمانوں کو فریب دیا اور ایسا کامیاب فریب دیا کہ وہ آج تک اسی فریب میں مبتلا چلے آتے ہیں۔ اس کا کیا جواب ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ فریب قرآن کی موجودگی میں نہیں دیا گیا۔ مفاد پرست قوتوں نے کیا یہ کہ قرآن کو مسلمانوں کی زندگی سے الگ کیا اور اس کی جگہ خود ساختہ روایات و تفاسیر کو رکھ دیا۔ یہ روایات بیشتر عجم کی وضع کردہ تھیں اور عجمی ذہن تجریدی (Abstract) تھا۔ برعکس عربی ذہن کے جو تجرید کی بجائے ٹھوس نتائج کا خوگر تھا۔ چنانچہ عربوں کے ہاں "حقیقت" کے معنی فلسفیانہ تصورات نہیں بلکہ زندگی کے ٹھوس نتائج ہیں۔ ان روایات نے ایسا ذہن مرتب کر دیا جو تجریدی گفتگو کو عینِ حقیقت سمجھنے لگ گیا۔ برعکس قرآنی ذہن کے جہاں ہر تجریدی تصور ٹھوس عمل حقیقت بن جاتا تھا اور جب تک وہ ایسی ٹھوس شکل اختیار نہیں کر لیتا تھا، اس کا اطمینان نہیں ہوتا تھا۔ اُس وقت سے اس وقت تک مسلمان عجم کے اسی تجریدی ذہن کو لئے چلا آ رہا ہے۔ اب "دین" نام رہ گیا ہے ان نظری عقائد سے بحث کرنے کا جنہیں زندگی کے عملی مسائل سے کچھ واسطہ نہیں۔ باقی رہا عمل، سو وہ اس "جدید مذہب" کے مطابق ہو رہا ہے جو ہمارے دورِ ملوکیت میں وضع کیا گیا۔ یہ تھا وہ حربہ جس سے قرآن کے عملی دین کو تجریدی ذہن میں بدل دیا گیا۔ اس حربے سے مسلمانوں کے نزدیک، قرآن کی موجودگی محض تبرک کار برائے حصول ثواب) رہ گئی۔ زندگی ان روایات کے تابع آ گئی جن کے متعلق یہ کہہ دیا گیا کہ اسلام کی عملی شکل یہی ہے۔ لہٰذا ان قوتوں نے قرآن کی موجودگی میں یہ فریب نہیں دیا۔ پہلے مسلمانوں کی عملی زندگی سے قرآن کو الگ کر دیا، اس کے بعد یہ فریب دیا۔ (اس اجمال کی تفصیل میری تصنیف "ابلیس زوالِ امت" میں دیکھئے) خدا کے نظامِ ربوبیت کا مدار قرآن پر ہے۔ لہٰذا اس کی موجودگی میں مفاد پرستانہ قوتوں کے لئے اس کا امکان ہی نہیں کہ وہ فریب دیگر "روحانی ترقی" کے لئے کوئی اور طریقہ تجویز کر دیں اور اس کے ماپنے کو "قیامت" پر اٹھا کر رکھ دیں۔ قرآن کی رو سے دین (نظامِ قرآنی) کے لئے، قرآن کے علاوہ کوئی اور سند نہیں ہے۔ اور اعمالِ انسانی کا جیتا جاگتا نتیجہ زندگی کی خوشگواریوں میں یہیں سامنے آنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس لئے اگر مسلمان کو قرآن سے الگ نہ کر دیا جائے تو اس کے فریب میں آنے کا امکان ہی نہیں۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آ گئی ہو گی کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، ان کی فریب خوردگی کا باعث یہ نہیں کہ انہوں نے "خدا۔ تربیتِ نفس، اور آخرت" کے ایمان کو جذبہ محرکہ بنایا تھا۔

اس کے برعکس اس ایمان نے ان کے رگ و پے میں وہ بجلیاں بھر دی تھیں کہ ان کے زورِ دروں سے یہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک دنیا پر چھا گئے۔ ان کے نزدیک، خدا، نفسِ انسانی اور آخرت کے تصورات محض تجریدی نظریئے نہیں تھے بلکہ وہ زندہ حقیقتیں تھیں جن سے زندگی کی شاہراہ پر قدم قدم پر دوچار ہونا پڑتا تھا۔ اگر خدا، تربیتِ نفس اور حیاتِ جاوید جیسی مستقل اقدار کو "دیس نکالا" دے دیا جائے تو اس کے بعد خالی جسم کی پرورش کے تقاضے باقی رہ جاتے ہیں۔ ان تقاضوں کے زور پر آپ ہنگامے تو برپا کر سکتے ہیں لیکن کوئی صالح اور پائدار انقلاب پیدا نہیں کر سکتے۔

نگاہ کی تبدیلی

اس قسم کے انقلاب کیلئے قلب و نگاہ کی تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ قلب و نگاہ کی تبدیلی اقدار (values) کی تبدیلی کے بغیر ممکن نہیں۔

یک منزل رائی دانی ز راہ ۔۔ قیمتِ ہر شے ز اندازِ نگاہ
نوعِ دیگر بیں جہاں دیگر شود ۔۔ ایں زمین و آسماں دیگر شود

مارکس نے اس انقلاب کیلئے "تاریخی وجوب" کو بنیاد قرار دیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ تاریخی وجوب کا تصور کسی ایک قلب میں ہلکا سا ارتعاش بھی پیدا نہیں کر سکا اور نہ ہی کر سکتا ہے۔ لہٰذا خود اسے اس فلسفیانہ توجیہہ کو چھوڑ کر جذبات کی طرف آنا پڑا۔ چونکہ اس کے سامنے ایسی مستقل اقدار کوئی نہ تھیں جن کی بنیادوں پر خوشگوار جذبات کی نمود ہو سکے اس لئے اسے انتقام اور منافرت کے جذبات کو ابھارنا پڑا۔ چنانچہ وہ اپنے منشورِ اشتراکیت (Communist Manifesto) میں لکھتا ہے کہ

> سرمایہ داری نے جو ظلم و تشدد برپا کر رکھا ہے اس کا واحد علاج یہ ہے کہ دنیا سے جماعتی تفریق کو مٹا دیا جائے۔ عمرانی زندگی کے مصائب و آلام صرف جماعتی امتیازات کی بنا پر ہیں اور اس کا ازالہ مزدوروں کی جماعت کا برسرِ اقتدار آ کر عالمگیر یکسانیت اور مساوات پیدا کرنا ہے۔

ظاہر ہے کہ جس انقلاب کے محرک جذبات محض نفرت اور انتقام ہوں اس کے بروئے کار لانے کا ذریعہ "تشدد" اور استبدادی قوت کے سوا کچھ اور ہو نہیں سکتا۔ چنانچہ مارکس مندرجہ بالا اقتباس کے تسلسل میں لکھتا ہے کہ

"تشدد" اور نفرت

> یہ مقاصد صرف اسی طرح حاصل ہو سکتے ہیں کہ موجودہ نظامِ معاشرت کو مسلح قوت کے ذریعے تباہ و برباد

کر دیا جائے۔

ہم نے جو اوپر لکھا ہے کہ جس انقلاب کی بنیاد قلب و نگاہ کی تبدیلی کی بجائے جذباتِ منافرت و انتقام کے اشتعال پر ہو وہ تشدد کے بغیر بروئے کار آہی نہیں سکتا، تو یہ نتیجہ محض قیاسی نہیں، سند پر مبنی ہے۔ چنانچہ اس کے متعلق لینن اپنی کتاب (State And Revolution) میں لکھتا ہے کہ:-

> سرمایہ داری نظامِ حکومت کی جگہ اشتراکی حکومت کا برسرِ اقتدار آجانا تشدد آمیز انقلاب کے بغیر ناممکن ہے

وہ اسی کتاب میں دوسری جگہ انجلز کے حوالے سے لکھتا ہے کہ

> انقلاب ایک ایسا عمل ہے جس کی رو سے آبادی کا ایک حصہ دوسرے حصہ پر اپنا اختیار و تسلط، قوت و استیلا نوکِ شمشیر، گولیوں کی بوچھاڑ اور آتشیں گولوں کے دھماکوں سے زبردستی کراتا ہے۔

مکر و فریب

صرف تشدد اور استبداد کے ذریعے ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ مکر و فریب، بددیانتی، فریب دہی، دروغ بافی کے ہر ممکن حربے کو لئے ہوئے۔ چنانچہ لینن اپنی ایک تقریر میں نوجوانوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

> ہم ان تمام اخلاقی ضوابط و شرائع کی مذمت کرتے ہیں جو کسی مافوق الفطرت عقیدہ کا نتیجہ ہوں۔ ہمارے خیال میں اخلاق کا نظریہ ہمیشہ جماعت کے مفاد کی جنگ کے ماتحت ہونا چاہیئے۔ ہر وہ حربہ جو قدیم غاصبانہ نظامِ معاشرت کے خلاف اور مزدوروں کی تنظیم کی تائید میں استعمال کرنا ضروری سمجھا جائے، عین اخلاق ہے۔ اشتراکین کا اخلاق و شریعت تو صرف اس قدر ہے کہ ڈکٹیٹر کی قوت کا استحکام و استبقا کس صورت سے ہو سکتا ہے۔ اس کے خلاف جو کچھ ہے سب ناجائز ہے۔ چنانچہ جماعتی مفاد کی خاطر جرائم کا ارتکاب، دروغ بافی فریب دہی، عین حق و صداقت ہے۔ نہیں! بلکہ دشمنوں کے خلاف کذب و افترا ہی بعض اوقات، سب سے اہم حربے ہوتے ہیں۔

اس قسم کا "ضابطۂ اخلاق" (جو میکیاولی سیاست کا پیدا کردہ ہے) لازمی نتیجہ ہے اس تصور کا کہ انسان کے سامنے تقاضے صرف جسم کے ہیں، مستقل اقدار کا کوئی وجود نہیں۔ جب کسی جماعت کا زاویۂ نگاہ اس قسم کا ہو جائے تو پھر فریب دہی اور دروغ بافی کے حربے دشمنوں ہی کے خلاف استعمال نہیں کئے جاتے بلکہ عند الضرورت خود اپنی

جماعت کے افراد سے بھی ان ہی حربوں سے کام لیا جاتا ہے۔ چنانچہ (Gollancz) اپنی کتاب (Our Threatened Values) میں لکھتا ہے کہ (Dr. G. Lucknz) سے پوچھا گیا کہ کیا اشتراکی جماعت کے لیڈروں کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنی جماعت کے افراد سے بھی کذب، وفریب دہی سے کام لیں؟ اس کے جواب میں اس نے کہا کہ

> اشتراکی اخلاق کی رو سے یہ فریضہ سب سے اہم ہے کہ اسے تسلیم کیا جائے کہ عند الضرورت بددیانتی اور بےایمانی سے کام لیا جا سکتا ہے۔ یہ سب سے بڑی قربانی تھی جس کا ہم سے انقلاب نے مطالبہ کیا تھا۔

اسی بنا پر لینن نے (یوتھ کمیونسٹ لیگ کی تیسری کانگریس منعقدہ ۱۹۲۰ء میں) نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

> ہم اخلاقیات کی کس معنی میں تردید کرتے ہیں؟ اس معنی میں کہ اخلاقیات سرمایہ داروں کی پیدا کردہ ہے جسے انہوں نے خدائی احکام سے اخذ کیا ہے۔ ہم اس تمام ضابطۂ اخلاق کی تردید کرتے ہیں جو انسان سے ماوراء کسی سرچشمہ سے اخذ کردہ ہو اور جس میں طبقات کا تصور موجود ہو۔
>
> (Quoted by Howard Selsam in Socialism-and Ethics)

سیلسم اس کتاب میں مارکسزم کا ملخص ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ مارکسزم کا نظریہ یہ ہے کہ

(۱) اخلاقی اقدار ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں۔

(۲) یہ تبدیلی کسی سوسائٹی میں پیداوار کی قوتوں اور ان کی معاشی نسبت سے واقع ہوتی رہتی ہے۔

(۳) کسی دور میں دیکھئے، اخلاق کی وہی اقدار غالب ہوں گی جو اس طبقہ نے پیدا کی ہوں گی جو اقتصادی طور پر غالب ہوگا۔

واضح رہے کہ اس میں کسی مارکس، کسی لینن، یا کسی سٹیلن کا قصور نہیں کہ انہوں نے اس قسم کا "ضابطۂ اخلاق" تجویز کیا ہے۔ یہ اس تصورِ حیات کا فطری نتیجہ ہے جس میں کسی مستقل اقدار پر یقین نہ رکھا جائے اور زندگی صرف جسم کی پرورش کا نام رہ جائے۔ بہرحال یہ ہیں وہ جذبات محرکہ جن کی بنیادوں پر اس انقلاب کی عمارت تعمیر کی جاتی ہے۔ اس مقام پر بالعموم یہ کہا جاتا ہے کہ جب ایک دفعہ (کسی نہ کسی طرح) اس قسم کا معاشرہ وجود میں آجائے جس میں تمام افراد کی ضروریاتِ زندگی

از خود بہم پہنچتی رہیں، تو پھر یہ افراد، بغیر کسی اور جذبۂ محرکہ کے پوری پوری محنت کریں گے کہ اس معاشرہ کی پیداوار میں اضافہ ہوتا کہ اس سے ان کی زندگی کا معیار بلند ہوتا جائے۔ لیکن یہ مفروضہ بھی غلط ہے۔ اس قسم کا معاشرہ بن جانے کے بعد بھی افرادِ معاشرہ کبھی اپنی جان نہیں ماریں گے تاوقتیکہ اس کے لئے کوئی بلند جذبۂ محرکہ سامنے نہ ہو۔ "معیارِ زیست کے بلند ہو جانے کا خیال" ایک بے معنی جذبہ ہے۔ اس لئے کہ "معیارِ زندگی" بالآخر کہتے کسے ہیں؟ ضروریاتِ زندگی کا پورا ہونا اور بے فکری سے پورا ہونا

معیارِ زیست کی بلندی

اگر کسی کو مٹی کی رکابی میں روٹی مل گئی تو کیا اور چینی کی پلیٹ (یا چاندی کی تھالی) میں مل گئی تو کیا؟ اس فرق کی اہمیت محض (Social Status) کے لئے ہوتی ہے لیکن جس سوسائٹی میں (Status) کا معیار یہ کچھ نہ رہے وہاں "معیارِ زندگی" بے معنی ہو جاتا ہے۔ وہاں صرف ضروریاتِ زندگی کا سوال باقی رہ جاتا ہے اور جب وہ پوری ہو جائیں تو کوئی اور جذبۂ محرکہ باقی نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ مارکسی نظام میں، ایسے معاشرہ کے قیام و بقا کے لئے بھی قوت اور غیر محدود قوت کا استعمال ناگزیر سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ سٹالن اپنی کتاب (Leninism) میں خود لینن کے حوالے سے لکھتا ہے کہ

> ڈکٹیٹر ایسی مختارِ عام ہستی کا نام ہے جس کا وجود قاطبۃً قوتوں کے ہجوم پر مبنی ہو۔ ایسی مطلق العنان ہستی جو کسی قانون اور کسی ضابطہ کی پابند نہ ہو۔ آئینی نظامِ حکومت کے علمبردار سن لیں اور غور سے سن لیں کہ ڈکٹیٹرشپ کے معنی ہیں قوت۔ غیر محدود اور قاہرہ قوت جو جبر و اکراہ پر مبنی ہو اور جسے آئین و دستور اور قانون و شریعت سے کچھ سروکار نہ ہو۔

یہ اس لئے کہ اس قسم کی قوتِ قاہرہ کے بغیر آپ کسی کو آمادہ ہی نہیں کر سکتے کہ وہ جان مار کر کام کرے۔ محض جسم کے تقاضوں (روٹی۔ کپڑے) کی رو سے انسان درحقیقت حیوان کی سطح پر آجاتا ہے اور جسے آپ انسانی فطرت کہتے ہیں وہ حیوانی جبلت (Animal Instinct) ہی کی نقاب پوش صورت ہوتی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ کوئی حیوان پیٹ بھر جانے کے بعد، کام کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا۔ آپ اسے ڈنڈے کے زور ہی سے آمادہ بکار کر سکتے ہیں۔ انسانوں کی صورت میں یہ ڈنڈا دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک جسمانی استبداد کا ڈنڈا جو براہِ راست ہر شخص کو نظر آتا ہے۔ دوسرا نفسیاتی ڈنڈا۔ اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ بچوں کو ابتدا ہی سے تعلیم۔ تربیت اور پراپیگنڈے

اس قسم کی مشین (Automaton) بنادیا جائے کہ وہ اس ڈگر سے ہٹ کر کچھ اور سوچ ہی نہ سکیں اور جس طرح پالتو جانور (Domestic Animals) سر جھکائے اس کام کو کرتے رہتے ہیں جس کے لئے انہیں سدھایا جاتا ہے، اسی طرح یہ "انسانی حیوان" مشین کی طرح اس نظام کے کل پرزے بنے رہیں۔ اگر کسی کو اس سے مجالِ سرتابی ہو تو ڈکٹیٹر کی قوتِ قاہرہ اس کی گردن اڑا دے)۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں کسی فرد کی ذات، خودی یا تشخص (Individuality) کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تشخص نہ حیوانوں میں ہوتا ہے نہ مشینوں میں۔

لہٰذا اگر مقصدِ زندگی محض جسم کے تقاضوں کی تسکین قرار دیدیا جائے، تو ان تقاضوں کی تسکین (یعنی ضروریاتِ زندگی کی بہم رسانی) کے بعد، انسان کے لئے کوئی جذبۂ محرکہ باقی نہیں رہتا اور وہ رفتہ رفتہ یا جیل خانہ کا قیدی بن جاتا ہے (جس کی ضروریاتِ زندگی کی، ذمہ داری جیل والوں کے سر ہوتی ہے اور وہ ڈنڈے کے خوف سے ان کے پروگرام کے مطابق صبح سے شام تک کام میں لگا رہتا ہے) یا سدھایا ہوا جانور، جو عادتاً آنکھ بند کئے کولھو کے دائرے میں چکر کاٹتا رہتا ہے۔ بالفاظِ دیگر ایک مشین جو ایک خاص ڈگر پر خود بخود چلتی رہتی ہے۔

***

اس کے برعکس، قرآن یہ نظریۂ حیات پیش کرتا ہے کہ کائنات میں کچھ مستقل اقدار ہیں جو زمان و مکان کی تبدیلیوں سے متاثر نہیں ہوتیں۔ یہ اقدار صفاتِ خداوندی کی مظہر ہیں۔ انسان جسم، اور نفس (Self) کے مجموعے کا نام ہے۔ نفسِ انسانی میں صفاتِ خداوندی کی ممکنات ودیعت کر کے رکھدی گئی ہیں۔ اگر انسانی نفس کی تربیت ہو جائے تو یہ ممکنات مشہود ہو جاتی ہیں اور اس طرح انسان اپنے ارتقائی منزلیں طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ یہ تصورات محض تجریدی (Abstract Concepts) نہیں بلکہ زندگی کے ہر قدم پر ٹھوس حقائق کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ صفاتِ خداوندی میں ایک بنیادی صفت، تخلیق (خالقیت) کی

عملِ تخلیق

ہے۔ تخلیق (Creation)، تولید (Procreation) سے بالکل الگ چیز ہے۔ تخلیق کا بنیادی جذبہ "اعطیٰ" (یعنی دینا) ہے۔ اس میں انسان اپنی تمام استعدادی قوتوں کو بروئے کار لاتا ہے۔ اور اس طرح اپنے جوہروں کو دوسروں تک پہنچائے جاتا ہے۔ جسے آپ معاش کی دنیا میں "پیداوار کی افزائش" کہتے ہیں، وہ بھی انسان کے عملِ تخلیق ہی کا ایک شعبہ ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جو انسان تخلیق کو

اپنا مقصد حیات سمجھے، اسے آمادہ بہ عمل کرنے کے لئے کسی خارجی محرک کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اس عملِ تخلیق سے ایک طرف، دوسرے افراد اس کی استعداد سے نفع اندوز ہوتے جاتے ہیں اور دوسری طرف، خود اس کے نفس کی تربیت ہوتی جاتی ہے۔ اس میں تخلیق کی قوتیں اور بڑھتی جاتی ہیں اور جوں جوں اس کی تخلیقی قوتیں بڑھتی ہیں، دوسرے افراد ان سے بیش از بیش متمتع ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح خالقیت (تخلیق) کی صفت سے 'رزاقیت اور ربوبیت کی صفات خود بخود بروئے کار آتی جاتی ہیں۔ چونکہ نفسِ انسانی کی ممکنات لامحدود ہیں، اس لئے انسان تمام عمر عملِ تخلیق جاری رکھتا ہے اور جوں جوں آگے بڑھتا ہے اس کا جذبۂ عمل تیز سے تیز تر ہوتا جاتا ہے۔ اس سے معاشرہ میں ارتقاء اور کائنات میں حسن کا اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اس طرح، انسان کائنات کی زینت و آرائش میں خدا کا رفیق بن جاتا ہے اور (اقبالؔ کے الفاظ میں) یہ کہنے کے قابل ہو جاتا ہے کہ

تو شب آفریدی چراغ آفریدم — سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی — خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

انسانی تخلیق کے متعلق باردیو لکھتا ہے کہ

> یہ دنیا ممکنات کی دنیا ہے۔ مکمل شدہ جامد و ساکت دنیا نہیں۔ اس میں امرِ تخلیق جاری رہے گا اور انسان کے ہاتھوں جاری رہے گا۔ اسے تمام ممکنات کی پردہ کشائی کرنی ہوگی۔ اور مضمر کو مشہود کر کے دکھانا ہوگا۔ یہ امرِ تخلیق، صرف خدا کی طرف سے انسان کی طرف نہیں آتا۔ بلکہ خدا انسان سے تخلیقی جدتوں کا تقاضا کرتا ہے۔ وہ انسان کی آزادی کے کارناموں کا منتظر رہتا ہے۔

(The Divine and the Human)

آپ اندازہ لگائیے کہ جس معاشرہ میں ہر فرد، عملِ تخلیق کو اپنی زندگی کا نصب العین (ایمان) قرار دے وہ معاشرہ کس برق رفتاری سے اوپر اٹھتا چلا جائے گا۔ قرآن اپنے نظام ربوبیت کی بنیاد اسی ایمان پر رکھتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ چیز کسی قسم کے جبر و تشدد سے پیدا کی ہی نہیں جا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن، دین کے معاملے میں جبر و اکراہ کی اجازت نہیں دیتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ (جیسا کہ آئندہ باب میں بتایا جائے گا) اس نظام کے قیام کی مخالفت اور مزاحمت کرنے والوں کے خلاف بعض اوقات قوت استعمال کرنے کی بھی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ لیکن وہ ایک جداگانہ چیز ہے۔ اس نظام کا قیام ان ہی افراد سے ممکن ہے جو علیٰ وجہ البصیرت، دل کی کامل رضامندی سے، ان بنیادی حقائق کو بطور نصب العینِ حیات (ایمان) تسلیم کریں۔ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) اس کے نزدیک "جنت کے چشمے" انسان کے دل کی گہرائیوں سے پھوٹ کر نکلتے ہیں۔ (عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا (۷۶/۶))۔ یہ کچھ جبر و اکراہ اور جبر و تشدد سے ہو نہیں سکتا۔ نظامِ ربوبیت ان سے کچھ چھینتا نہیں ہے۔ یہ اپنا سب کچھ از خود اس نظام کی تحویل میں دیدیتے ہیں۔ کیونکہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ اس "دینے" میں ان کے پاس سب کچھ آجاتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ افراد اپنے ذاتی مفاد کے لئے جو کچھ بھی اپنے پاس رکھیں اس میں کمی ہوتی جائے گی اور وہ ایک دن ختم ہو جائے گا۔ لیکن جو کچھ نظامِ خداوندی کے سپرد کر دیا جائے گا اس میں نہ کمی آئے گی نہ وہ ختم ہوگا۔ (مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ (۱۶/۹۶))

علاوہ بریں، اس راستے میں فریب، دغابازی، جھوٹ، بد دیانتی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ صدق۔ عدل۔ خلوص وہ صفات ہیں جن کی نشو و نما سے نفسِ انسانی کی تربیت ہوتی ہے۔ یہ وہ مستقل اقدار ہیں جو ہمیشہ غیر متبدل رہتی ہیں۔ اس لئے جو شخص ان اقدار کو نصب العینِ حیات تسلیم کرے گا وہ فریب کاری اور دغابازی کا خیال تک بھی دل میں نہیں لا سکے گا۔ مارکسزم میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ غیر تو غیر، خود اپنوں سے بھی عند الضرورت ہر قسم کی دغابازی اور فریب کاری کو روا رکھا جاتا ہے۔ لیکن یہاں یہ عالم ہے کہ دوست تو ایک طرف دشمن سے بھی عدل کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔

عدل

وَ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى...... (۵/۸)

(دیکھنا! کسی قوم کی دشمنی تمہیں کہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم ان سے عدل نہ کرو۔ ہمیشہ (اور ہر ایک سے) عدل کرو۔ یہی انداز تقویٰ سے قریب ہے۔

اس میں نہ کسی مصلحت کوشی (Expediency) کا سوال ہے نہ اس فریبِ نفس کی گنجائش کہ "اچھے مقصد کے لئے جو ذریعہ بھی مناسب سمجھا جائے اسے اختیار کر لینا چاہیئے" یہاں ذریعہ اور مقصد (Means and Ends)

میں کوئی فرق ہی نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے کہ یہاں ایمان یہ ہے کہ ہر عمل جو انسان سے سرزد ہوتا ہے، نفس انسانی پر اپنا اثر مرتب کرتا ہے۔ ذریعہ کا اختیار کرنا، بھی ایک عمل ہے اس لئے اس کا بھی ایک اثر یا نتیجہ ہے جو نفس انسانی پر نقش انداز ہوتا ہے۔ لہٰذا ذریعہ اور مقصد میں کوئی فرق ہی نہیں (Ferdinand Lassalle) کے الفاظ میں:-

> ذرائع اور مقاصد باہمدگر اس طرح پیوست ہوتے ہیں کہ ایک کے بدلنے سے دوسرا خود بخود بدل جاتا ہے۔ ہر راستہ انسان کو ایک جداگانہ منزل کی طرف لیجاتا ہے۔
>
> (Quoted by Arther koestler in "darkness at Noon")

یہ ہیں وہ بنیادیں، جن پر قرآن نظام ربوبیت کی عمارت استوار کرتا ہے۔ یہی بنیادیں اس کے لئے جذبات محرکہ بنجاتی ہیں۔ اور انہی کے زور دروں سے یہ عمارت بلند سے بلند تر ہوتی جاتی ہے۔ نہ یہ محض تجریدی تصورات ہیں جن کا انسان کو کوئی احساس نہ ہوسکے یا جو اس کی عملی زندگی سے غیر متعلق ہوں اور نہ ہی ان میں کسی فریب خوردگی کا امکان ہے۔ ان سے انسان کی عملی زندگی میں زندہ نتائج پیدا ہوتے ہیں اور یہی زندہ نتائج ان کے پرکھنے کا معیار ہیں۔ اس مقام پر اس حقیقت کو بھی دُہرا لینا چاہیئے کہ قرآنی نظام ربوبیت کا مقصود و منتہیٰ نقطہ یہ نہیں کہ معاشرہ کے تمام افراد کی ضروریات زندگی پوری ہوتی جائیں۔ جیسا کہ متعدد مقامات پر لکھا جاچکا ہے، یہ مقصد تو بڑا ابتدائی اور سطحی ہے بلکہ یوں کہئے کہ یہ مقصد ہی نہیں بلکہ مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اصل مقصد انسانی ذات کا ارتقاء ہے جو ربوبیت عامہ کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ پرنسپل کیئرڈ اس باب میں لکھتا ہے:-

> سب کچھ کہہ چکنے کے بعد، یہ حقیقت اپنی جگہ پر رہتی ہے کہ معاشرہ کے لئے ایثار، محبت، اور بہبود دیگراں کا جذبہ، خواہ وہ اس حد تک بھی کیوں نہ چلا جائے کہ اس میں انسان مفاد خویش کو بالکل بھلا دے بلکہ فنا کردے اتنا ہی کرسکتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو ایک مسلسل ترقی کرنے والی حیات سے متعارف کرا دیتے ہیں۔ صرف اتنے سے یہ نہیں ہوسکتا کہ ہم اپنے آپ کو ایک لامنتہا کل سے ہم رنگ کرسکیں۔ ایک فرد ایثار نفس سے اپنے آپ کو خاندان، مملکت یا تمام نوع انسانی کی طبعی زندگی میں جذب کرسکتا ہے۔ لیکن یہ زندگی خود غیر مکمل ہوتی ہے۔

(اس کی ذات کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس حقیقت پر ایمان رکھے کہ) اس طبیعی زندگی سے ماوراء ایک اور زندگی ہے اور نیچر اور ہسٹری سب اس زندگی کے مظاہر ہیں۔ یہ زندگی اصل مقصود ہے۔

(Introduction to the Philosophy of Religion)

یہ ہے حیاتِ جاوداں اور مستقل اقدار کے سرچشمۂ حقیقی پر وہ ایمان جس کی بنیادوں پر قرآن کے نظامِ ربوبیت کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ نظام محض معاشرہ کے افراد میں تقسیمِ رزق کا طریقِ کار (process) نہیں۔ ایک بلند و بالا مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔

پھر یہ بھی واضح رہے کہ قرآنی نظامِ ربوبیت میں تقسیمِ رزق سے مراد مادی ضروریاتِ زندگی کی یکسانیت (Sameness) نہیں۔ یعنی اس سے یہ مراد نہیں کہ انسانوں کو مشین سمجھ کر سب کے لئے ایک جیسی خوراک ایک جیسا لباس، ایک جیسے مکان اور ایک جیسا سامان تجویز کر دیا جائے۔ اس قسم کی زندگی جیل خانے کی زندگی ہوگی۔ اس قسم کی یکسانیت سے تو عملِ تخلیق رک جاتا ہے اور انسانی زندگی کی لوچ ختم ہو جاتی ہے۔ رسل کے الفاظ میں:

صرف مساوات کسی معاشرہ کو بہتر نہیں بنا سکتی۔ جس معاشرہ میں تمام غلام ہوں وہاں بھی مساوات ہوتی ہے اور جس میں تمام آزاد ہوں وہاں بھی مساوات ہوتی ہے۔

(Authority and Individual P.80)

قرآن کا مقصد یہ ہے کہ معاشرہ میں زیادہ سے زیادہ آزادی قائم رکھی جائے۔ اور چونکہ آزادی کی بنیادی شرط یہ ہے کہ انسان ضروریاتِ زندگی کے لئے پریشان نہ ہو، اس لئے تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی کی ضمانت وصیانت معاشرہ اپنے ذمے لیلے۔ اس اصول کے ماتحت، مختلف افراد کے ذوق کے تنوع اور اشیائے ضرورت کے انتخاب اور استعمال پر کوئی پابندی نہیں ہوگی (بجز اس پابندی کے جسے قرآن نے حرام سے تعبیر کیا ہے) یعنی تمام حلال وطیب اشیاء سے متمتع ہونا اور اس میں انسانی ذوق و لطافت کا لحاظ رکھنا، مقصودِ نظامِ ربوبیت ہے۔ قرآن نے حلال کے ساتھ طیب (خوشگوار) کا اضافہ کر کے اس عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ اس میں انفرادی ذوق کا خاص طور پر خیال رکھا جائے گا۔ نیز اس نے "جنت" کے متعلق کہا ہے کہ

وَهُمْ فِي مَا اشْتَهَتْ أَنْفُسُهُمْ (۲۱/۱۰۲)۔ انہیں وہ کچھ ملے گا جسے ان کا دل چاہے گا، تو اس میں اس انفرادی ذوق و انتخاب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جس جنت میں انفرادی ذوق کی تسکین کا سامان نہ ہو وہ جنت نہیں، جہنّم ہے۔

بابِ نہم

کشمکش

یہ تھا وہ اسلام، جسے نبی اکرمؐ لے کر آئے اور یہ تھا وہ نظام جس کی تشکیل کے لئے حضورؐ نے اپنی دعوت پیش کی۔ یہ دعوت پیش کی اس معاشرے میں جس میں "انسانوں کے خودساختہ آئین و ضوابط کی بنا پر ہر جگہ ناہمواریاں ہی ناہمواریاں تھیں" (۲۰/۱۱۳) ایسے معاشرہ میں اس قسم کی دعوت 'فی الحقیقت ایک بہت بڑے انقلاب کی دعوت تھی۔ حضورؐ کے اولین مخاطب مکہ کے تاجر (قریش) تھے اور ان کی تجارت کا یہ عالم تھا کہ سردی گرمی ان کے تجارتی قافلے مسلسل اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر سرگرم سفر رہتے تھے (۱۰۶/۱-۲) اُن کی اس تجارت کے ڈانڈے جا کر مذہب سے مل گئے تھے۔ اس لئے کہ قریش ہی کعبے کے متولی تھے اور اس کی وجہ سے معاشرے میں انہیں بلند مقام حاصل تھا۔ اس مقدس مقام کا اثر تھا کہ ان ویرانوں میں جہاں دوسرے لوگوں کی سوئی تک بھی محفوظ نہیں رہ سکتی تھی، قریش کے قافلوں کی طرف کوئی آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھ سکتا تھا (۲۸/۵۷) پھر یہی لوگ اپنی قوم کے سردار بھی تھے۔ حکومت، دولت اور مذہبی پیشوائیت وہ قہرمانی قوتیں ہیں کہ ان میں سے کوئی ایک بھی انسانیت کا گلا گھونٹنے کے لئے کچھ کم نہیں ہوتی۔ لیکن جہاں یہ تینوں قوتیں ایک جگہ اکٹھی ہو جائیں وہاں

نخوت و تکبر اور فرعونیت و تمرد جس شدت کے ساتھ کارفرما ہوگی، اس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ یہ تھے وہ

رسول اللہ کی دعوت انقلاب

قریش جن کے سامنے حضورؐ نے یہ دعوت پیش کی کہ دنیا میں کسی انسان کو دوسرے انسان پر فوقیت حاصل نہیں پیدائش کے اعتبار سے ہر فرزند آدم ایک سطح پر ہوتا ہے۔ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے اور اس سے اپنے فیصلے منوائے۔ تمام انسان ایک ہی قانون کے محکوم ہیں! اور وہ قانون انسانوں کا نہیں بلکہ خدا کا متعین فرمودہ ہے۔ کسی کیلئے جائز نہیں کہ وہ دولت کے انبار جمع کرتا رہے اور اس طرح رزق کے ان سرچشموں کو اپنی ملکیت بنالے جنہیں خدا نے نوعِ انسان کی ربوبیت کے لئے بلامزد و معاوضہ عطا کیا ہے۔ دنیا میں مذہبی پیشوائیت کا تصور بھی باطل ہے۔ خدا، ہر انسان سے یکساں فاصلے پر ہے اور اس کے اور انسانوں کے درمیان کوئی حاجب و دربان نہیں۔ نہ کوئی وسیلہ اور واسطہ۔

آپ سوچیے کہ قریش کے اس معاشرے میں اس دعوتِ انقلاب کا کیا اثر ہوا ہوگا اور اس کے خلاف قریش کا ردعمل کیا ہوگا؟ اس ردِعمل کو اقبالؒ نے نوحۂ ابوجہل کے رنگ میں بیان کیا ہے جو اس نے کعبے کا غلاف تھام کر لات و منات کے سامنے اس درد و کرب سے پیش کیا تھا۔

سینۂ ما از محمد داغ داغ — از دم او کعبہ را گل شد چراغ
مذہب او قاطع ملک و نسب — از قریش و منکر از فضل عرب
در نگاہ او یکے بالا و پست — با غلام خویش بر یک خواں نشست
قدر احرار عرب نشناختہ — با کلفتانِ حبش در ساختہ
احمراں با اسوداں آمیختند — آبروئے دودمانے ریختند
ایں مساوات ایں مواخات اعجمی است — خوب می دانم کہ سلماں مزدکی است

اس لئے

اے ہبل اے بندہ را پوزش پذیر — خانۂ خود را ز بے کیشاں بگیر
اے منات اے لات ازیں منزل مرو — گر ز منزل می روی از دل مرو

شروع شروع میں انہوں نے اس آواز پر زیادہ سنجیدگی سے (Seriously) توجہ نہ دی۔

کسی نے کہا کہ یہ (معاذ اللہ) پاگل ہو گیا ہے۔ کسی نے کہا کہ اس پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔ کوئی بولا کہ اس قسم کے خیالات محض شاعری ہے، زمانہ کی گردش اسے خود ختم کر دے گی۔ اس لئے اس کا نوٹس ہی نہیں لینا چاہیئے۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ یہ آواز صدا بصحرا نہیں، بلکہ آہستہ آہستہ جڑ پکڑتی جا رہی ہے تو انہیں اس کی طرف سے تردد پیدا ہوا؛

مخالفت

اب انہوں نے اس کی مخالفت شروع کی اور جوں جوں یہ آواز زیادہ مؤثر ہوتی گئی، ان کی مخالفت بھی تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی۔ یہ مخالفت اس زمانہ میں اپنی انتہا تک پہنچ گئی جسے ہجرت کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ غور کیجئے کہ اس وقت حالت کیا تھی۔ مخالفت کی تمام قوتیں چاروں طرف سے ہجوم کر کے آ گئی تھیں۔ ان کے پاس دولت تھی، طاقت تھی، جمعیت تھی، اثر و رسوخ تھا، کعبے کی تولیت تھی، اپنی سرداری تھی۔ ان کے مقابلے میں یہ ایک مختصر سی جماعت تھی جن میں اکثر و بیشتر غریب و نادار تھے۔ بےکس و بےبس تھے۔ کمزور و لاچار تھے۔ اور یہ نتیجہ تھا نبی اکرمؐ کی تیرہ برس کی مسلسل جد و جہد کا۔ اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قریش اور ان کے متعلقین میں سے جس جس کے اندر اس دعوت کو قبول کرنے کی صلاحیت تھی، وہ سب ان میں سے چھٹ کر) ایک ایک کر کے ادھر آ چکے تھے اور باقی وہی رہ گئے تھے جنہوں نے اس دعوت کی ہر ممکن مخالفت کرنی تھی۔ یہ مخالفت بھی اب اپنی انتہائی شدت تک پہنچ رہی تھی۔ ان کے ارادے یہ تھے کہ کسی نہ کسی طرح اس تحریک کو ختم ہی کر دیا جائے۔ لہٰذا اب اس جماعت کی تجویز یہ تھی کہ اس علاقے کو چھوڑ کر کسی ایسی جگہ چلے چلیں جہاں کی فضا اس نظامِ نو کی تشکیل کے لئے زیادہ سازگار ہو (اسی کو ہجرت کہا جاتا ہے)۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہاں کی زمین اب ان پر آسمان سے بھی زیادہ گراں ہو چکی تھی۔ لیکن بایں ہمہ اپنے آبا و اجداد کے وطن کو چھوڑنا، گھر بار کو چھوڑنا، اعزہ و اقربا کو چھوڑنا، ہر قسم کی کشش و جاذبیت کو چھوڑنا، معاشی وسائل کو چھوڑنا اور ان سب کو چھوڑ کر ایک ایسی جگہ جانا جہاں مستقبل کی کوئی شے بھی متعین نہ تھی، بڑا ہمت طلب مرحلہ تھا۔ مشکلات و مصائب کے اس تمام ہجوم اور ناامیدیوں اور ناکامیوں کے اس تمام انبوہ کا مقابلہ کرنے کے لئے ان کے پاس اگر کوئی ساز و سامان تھا تو فقط یہ یقین کہ ہم جس دعوت کو لے کر اٹھے ہیں، وہ حق و صداقت پر مبنی ہے۔ اس لئے ہماری کوششیں یقیناً نتیجہ خیز اور بار آور ہو کر رہیں گی۔ لیکن سوچئے کہ اس یقین کے لئے بھی کتنے بڑے قلبِ محکم کی ضرورت ہوگی۔ یہ جس دعوت کو لے کر اٹھے تھے وہ ایک بالکل نئی تحریک تھی۔ دنیا جہان سے نرالی دعوت۔ ایسی دعوت جس میں معاشرہ کے تمام مسلّمہ اقدار اور متوارث عقائد کو یکسر الٹ کر رکھ دینا تھا اور ان کی جگہ

ایک جدید معاشرہ کی تشکیل ان اقدار کی رو سے کرنی تھی جنہیں اس سے پیشتر انہوں نے کبھی آزمایا نہیں تھا۔ انہیں ان اقدار کے ان دیکھے نتائج پر یقین تھا (ایمان بالغیب) اور یہ ظاہر ہے کہ کسی تحریک کے ان دیکھے نتائج پر یقین محکم رکھنے کے لئے فی الواقعہ بڑے عزم و ثبات کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تھا ہجرت سے ذرا پہلے کا وہ دور جس میں حالات کی نزاکت اس انتہائی نقطہ تک جا پہنچی تھی۔ اس وقت بڑی ضرورت تھی کہ کمزوروں اور ناتوانوں کی اس مختصری (گھری ہوئی) جماعت کی ہمت بندھائی جائے۔ ان کے حوصلوں کو پست نہ ہونے دیا جائے۔

آپ قرآن کے آخری پارہ کی آخری (چھوٹی چھوٹی) سورتوں کو دیکھئے۔ ان میں اس کشمکش کا پورا پورا نقشہ سامنے آجائے گا۔ کہیں قریش سے کہا جاتا ہے کہ تم اپنے ساز و سامان اور دولت و قوت کے نشے میں مست ہو کر سمجھ رہے ہو کہ کوئی تمہارا کیا بگاڑ سکتا ہے، لیکن تم نے ابھی کل اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ یمن کے اس لشکرِ جرار کا کیا حشر ہوا تھا جو ہاتھی لے کر چڑھ آئے تھے۔ تم نے دیکھا کہ ان کی تمام خفیہ تدبیریں کس طرح

تنذیر

ناکام رہ گئیں اور وہ سب کے سب تباہ و برباد ہو گئے (کَعَصْفٍ مَّاْکُوْلٍ ۱۰۵/۱-۵) اور کہیں ان سے کہا جاتا کہ کیوں گھبراتے ہو، تم استقامت رکھو اور اپنے خدا کی ربوبیت اعلیٰ کے قیام کے لئے مسلسل کوشش کرتے جاؤ (۸۷/۱)، تم دیکھو گے کہ اس کی تائید و نصرت کس طرح تمہارے ہم رکاب ہوتی ہے (۱۱۰/۱)، اور تمہیں رزق و نعمائے خداوندی کی کس قدر فراوانیاں حاصل ہوتی ہیں (۱۰۶/۱-۴)، کبھی اُن سے کہا جاتا کہ تمہارا یہ نظام جس میں تم غریبوں کی محنت کے سرمائے سے اپنے لئے دولت کے انبار اکٹھے کرتے رہتے ہو، تمہیں اور تمہارے معاشرے کو جلا کر راکھ کر دے گا (۱۰۴/۱-۹) اور تمہارے سرغنوں کا مال و دولت ان کے (اور تمہارے) کسی کام نہیں آئے گا۔ (۱۱۱/۱-۵) اور تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے کہ تمہاری اس روش کا انجام کیا ہوتا ہے (۱۰۲/۱-۸)، جس میں تم "خدا کے جاری چشموں" کو بند لگا کر روک لیتے ہو کہ ان سے کسی غریب و نادار کی زمین سیراب نہ ہونے پائے (۱۰۷/۱-۷) اور کبھی ان سے کہا جاتا کہ گھبرانے اور پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ ہمارا قانون یہ ہے کہ (اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا ۝ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا ۹۴/۵-۶) مشکلات اور مصائب کے بعد یقیناً آسانیاں اور فراوانیاں آتی ہیں۔ تمہاری موجودہ حالت کے مقابلے میں تمہارا مستقبل یقیناً درخشندہ و تابناک ہوگا (۹۳/۴)

کیا تم ہمارے کائناتی نظام پر غور نہیں کرتے کہ کس طرح رات کی ظلمت انگیز تاریکیوں کے بعد دن کا اُجالا

ہو جاتا ہے (۹۲/۳-۱) اور کس طرح نیرِ درخشاں اپنی تابانیوں سے تمام عالم کو بقعۂ نور بنا دیتا ہے (۹۱/۳-۱) اور اس کی روشنی کس طرح
دور دراز تک پھیلتی چلی جاتی ہے (۹۳/۲-۱) اس لئے اگر تمہیں مخالفتوں کا ہجوم ڈراتا ہے تو تم خدا کی ربوبیت کے اور قریب
ہو جاؤ۔ تم دیکھو گے کہ وہ تمہاری اس طرح حفاظت کرتا ہے جس طرح جانور اپنے نوزائیدہ (کمزور اور ناتواں) بچوں کی
حفاظت و پرورش کرتے ہیں (۱۱۳/۳-۱ : ۱۱۴/۴-۱) تعوذ کے یہی معنی ہیں) پھر ان سے کہا جاتا کہ یہ ٹھیک ہے کہ یہ ایک بالکل
نیا پروگرام ہے جو تمہارے سامنے پہلے پہل آیا ہے۔ اس لئے تمہیں خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ شاید اس کے وہ نتائج
مرتب نہ ہوں جن کا وعدہ دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ پروگرام دنیا میں پہلی بار نہیں آیا۔ اس سے پہلے اس پر بارہا تجربہ
ہو چکا ہے اس لئے تم تاریخی شواہد پر غور کرو اور دیکھو کہ جس روش پر تمہارے مخالفین کاربند ہیں اس کا انجام کیا
ہوتا رہا ہے اور جس نظام کی طرف تم دعوت دیتے ہو اس کا مآل کیا ہوتا تھا! دیکھو کہ زمانہ کی شہادت تمہیں
کس نتیجہ پر پہنچاتی ہے (۱۰۳/۳-۱) یہ تحریک کوئی نئی تحریک نہیں ہے۔ (حضرت) نوحؑ نے جبلِ تین پر اسی نظام کی دعوت
دی تھی۔ اور لوگوں کو اسی کی طرف کوہِ زیتون پر (حضرت) عیسیٰؑ نے بلایا تھا۔ یہی وہ تحریک تھی جسے طور کی وادیوں میں
(حضرت) موسیٰؑ نے عام کیا تھا، اور اب وہی دعوت ہے جسے عام کرنے کے لئے تمہیں تیار کیا جا رہا ہے۔ جب،
اور جہاں، یہ آواز بلند ہوئی وہاں کے مترفین نے یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی کہ (نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا
وَّ مَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ ۳۴/۳۵) ہمارے پاس بڑی دولت ہے۔ ہماری جمعیت بھی بڑی ہے۔ کوئی ہمارا کیا
بگاڑ سکتا ہے؟ لیکن تم پوچھو تاریخ کے اوراق سے۔ تم دریافت کرو ان کھنڈرات اور ویرانوں سے جن کے
پاس سے تم صبح و شام گزرتے ہو اور جن کی اینٹوں اور پتھروں پر ان کی داستانیں لکھی ہوئی ہیں کہ ان کی مخالفت
کا کیا نتیجہ نکلا؟ وہ تمہارے مخالفین سے بھی زیادہ صاحبِ قوت و شوکت تھے (كَانُوْۤا اَشَدَّ مِنْهُمْ
قُوَّةً ۳۰/۹) ان کے ہاں رزق کی بھی بڑی فراوانی تھی۔ (وَّ اَثَارُوا الْاَرْضَ) ان کی آبادیاں بڑی تھیں
(عَمَرُوْهَاۤ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا۔ ۳۰/۹) لیکن چونکہ یہ معاشی ناہمواریاں پیدا کرتے تھے، اس لئے ان کی زندگی
کا ہر پہلو ناہموار ہو گیا۔ (ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِیْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰۤى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَ
كَانُوْا بِهَا یَسْتَهْزِءُوْنَ۔ ۳۰/۱۰) ان کا معاشرہ اپنی چھت کے بوجھ سے نیچے آ گرا کیونکہ وہ کمزور بنیادوں پر
استوار تھا (فَاَتَى اللّٰهُ بُنْیَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَیْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ۔ ۱۶/۲۶) انہوں نے

اپنی عقل و تدابیر سے "بزعم خویش" وہ تمام راہیں بند کرلی تھیں جہاں سے ان کے معاشرے پر تباہی آسکتی تھی لیکن یہ تباہی ان راہوں سے آگئی جو ان کے عقل و شعور میں بھی نہ تھیں (وَأَتٰهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ۲۶/۲۵) انہوں نے پہاڑ کی چوٹیوں پر بڑے بڑے مستحکم قلعے تعمیر کر رکھے تھے اور ان پر اپنی کاریگری صرف کر رکھی تھی (۲۶/۱۲۸-۱۲۹) اُن کے ہاں سامانِ زیست کی بھی بہت فراوانی تھی (۲۶/۱۴۶-۱۴۸) لیکن وہ بالآخر اپنے غلط نظام کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوگئے (فَأَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ۲۶/۱۵۸) یہ وہ نظام تھا جس میں ان کے پیش نظر فقط قریبی مفادِ خویش رہتے تھے۔ مستقبل پر ان کی نگاہ نہ تھی۔ اس نظام کی تر و تازگی اور مرفہ الحالی و رفاہ و فارغ البالی کی مدت چند روزہ ہوتی ہے اس کھیتی کی طرح جس کی جڑیں زمین کے اوپر ہی اوپر ہوں (۱۴/۲۶)۔ اس نظام کا انجام ہلاکت کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا؛

وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْ بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيْلًا وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ (۲۸/۵۸ نیز ۲۸/۷۸)

اور کتنی بستیاں (قومیں) ہم نے ہلاک کر دیں جو اپنے معاشی نظام پر اس طرح اتراتی تھیں۔ یہ ہیں ان کے مکانات جو ان کے بعد بہت کم آباد ہوئے۔ اور اُن کے ترکہ کے وارث ہمارے سوا اور کوئی نہ ہوا۔

اقوامِ سابقہ کا حشر

بڑی قوتوں کے مالک (۹/۶۹) بڑے سرکش اور ظالم (۵۳/۵۲)۔ لیکن ان کی قوت اور سرکشی ان کے کسی کام نہ آئی اور وہ سب تباہ و برباد ہوگئے (۱۴/۱۵) تم نے قومِ نوح کی داستانیں سنی ہوں گی کہ اس نے کس طرح اس دعوت کی مخالفت کی اور اس کا کیا حشر ہوا؟ (۳۸/۱۱؛ ۴۳/۱۱؛ ۳۳/۲۳؛ ۱۲۰/۲۶؛ ۵۴/۹)۔ تم نے قومِ عاد کے متعلق بھی سنا ہوگا کہ ان کی مخالفت کا انجام کیا ہوا! (۲۶/۱۳۸؛ ۱۵/۴۱؛ ۲۹/۴۶؛ ۸۹/۶-۱۲) قومِ ثمود کے متعلق تو تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کیونکہ تم خود ان ہی کی اجڑی ہوئی بستیوں میں بس رہے ہو (۲۶/۱۵۸؛ ۲۷/۵۱؛ ۴۱/۱۸؛ ۴۴/۴۴) تم نے قومِ لوط کے قصے بھی سنے ہوں گے (۲۶/۱۷۲؛ ۵۴/۳۴) اور قومِ سبا کی داستانیں بھی (۳۴/۱۹)۔ قومِ شعیب کی سرکشی اور ان کا عبرتناک انجام بھی تم سے پوشیدہ نہیں (۲۶/۱۸۹؛ ۲۹/۳۷) تم نے فرعون کی فرعونیت کی داستانیں بھی سن رکھی ہیں (۴۳/۵۶؛ ۵۴/۴۲) اور قارون کی قارونیت کی بھی (۲۸/۸۱؛ ۲۹/۳۹؛ ۴۰/۲۴؛ ۴۱/۵۰) یہ تمام اقوام اسی طرح اپنے غلط نظام کی پیدا کردہ قوتوں پر اتراتی تھیں (۸۹/۶-۱۲) لیکن ہمارے قانونِ مکافات نے اس کا تخت

محاسبہ کیا (۸/۶۵) اور جب ان کے غلط کردار کے نتائج کے ظہور کا وقت آیا تو ان کی قوت و دولت ان کے کسی کام نہ آئی۔ وہ ہلاک اور برباد ہو گئے (۱۸/۵۹ ؛ ۴۷/۱۳ ؛ ۵۰/۳۹) اس انقلاب نے ان کا تختہ الٹ دیا (۱۱/۴۲ ؛ ۱۵/۷۳) وہ ایسے گرے کہ پھر اٹھنے کے قابل نہ رہے (۱۵/۴۸) وہ اپنے آپ کو عزتوں کے مالک سمجھتے تھے لیکن دنیا بھر کی رسوائیاں ان کے حصے میں آئیں (۳۹/۲۴) ان کا نام و نشان تک مٹ گیا (۲۹/۴۸)۔ اب ان کی صرف داستانیں باقی ہیں (۲۳/۴۴) تاکہ وہ آنے والوں کیلئے نشانِ راہ کا کام دیں اور وہ سمجھ لیں کہ اس راستے پر چلنے کا انجام یہ ہوا کرتا ہے (۵۱/۴۷) تم زمین پر چلو پھرو (۳۰/۴۲ ؛ ۳۵/۴۴ ؛ ۴۶/۲۱) اور دیکھو کہ ان کے اجڑے ہوئے کاشانے اور برباد شدہ ویرانے کس طرح اُبھر اُبھر کر اُن کے مآل و انجام کی عبرت انگیز کہانیاں سنا رہے ہیں (۲۲/۴۵)

ان تاریخی شواہد کی طرف توجہ منعطف کرانے کے بعد اُن سے کہا جاتا ہے کہ ذرا سوچو کہ جب اقوامِ سابقہ کی غلط روشِ زندگی کا یہ انجام ہوا تو کیا تمہارے یہ مخالفین سمجھتے ہیں کہ یہ ہمارے قانون کی گرفت سے بچ نکلیں گے؟ کیسا غلط ہے یہ فیصلہ جو یہ لوگ اپنی حماقت سے اپنے ذہن میں کئے بیٹھے ہیں (اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ اَنْ یَّسْبِقُوْنَا سَآءَ مَا یَحْکُمُوْنَ ۲۹/۴) جو لوگ معاشی ناہمواریوں کا نظام قائم کرتے ہیں کیا وہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہمارے قانون سے آگے نکل جائیں گے؟ کس قدر ناعاقبت اندیشی پر مبنی ہے یہ فیصلہ جو یہ لوگ کئے بیٹھے ہیں[1]۔ انہیں معلوم نہیں کہ جو معاشی نظام، بخل (Closed Interest) پر مبنی ہو اس کا انجام یہی ہوا کرتا ہے (۳/۱۶۹)، یہ لوگ شکاریوں کی طرح، دبے پاؤں مخلوقِ خدا

یہ نظام قائم نہیں رہ سکتا

کی محنت کی کمائی کو دبوچ لیتے ہیں اور ایسے قوانین جاری کرتے رہتے ہیں جن سے اس قسم کی خون آشامی جائز قرار پا جائے۔ لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ اس کا انجام ذلت و رسوائی کے سوا کچھ نہیں ہوتا (اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا o اِنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ وَیَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَیَکْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰہُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ وَاَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّہِیْنًا ۳۶-۳۷/۴) یہ ہمارے

---

[1] سیات کے معنی معاشی تنگی، اور حسنات کے معنی معاشی فراخی کے ہیں۔ دیکھئے (۷/۱۲۰-۱۳۱) جہاں قومِ فرعون کے ضمن میں یہ مفہوم بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

قانون کے خلاف ہے کہ اس قسم کا معاشرہ قائم رہ سکے۔ خواہ یہ لوگ اس کے قیام و استحکام کے لئے کتنی ہی تدبیریں کیوں نہ کریں۔

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہو

(Briffault) کے الفاظ میں:

وہ نظامِ تہذیب جس میں حق و صداقت کو عادی طور پر نظر انداز کر دیا جائے، آخر الامر تباہ ہو کر رہتا ہے۔ ناانصافی سے کوئی فرد کیسا ہی کامیاب کیوں نہ ہوتا چلا جائے، وہ اجتماعی نظام جس کا وہ جزو ہے اور وہ جماعت جو اس ظلم و استبداد کے ثمرات سے نفع اندوز ہوتی ہے، ان ناہمواریوں کی وجہ سے انجام کار برباد ہو جاتی ہے۔ انتخابِ طبعی کے اٹل قانون کی بنا پر گناہ کی اجرت موت ہے۔

(The Making of Humanity)

وہ کہتا کہ ان لوگوں سے کہہ دو کہ تمہاری قوتیں اور سازشیں، خدا کے کائناتی قانون کو قطعاً نہیں روک سکتیں کہ وہ اپنے نتائج مرتب نہ کرے۔ تمہاری قوتیں، خدا کو عاجز نہیں کر سکتیں۔ (۸/۵۹ ؛ ۲۴/۵۷ ؛ ۲۹/۲۲ ؛ ۳۴/۵ ؛ ۳۲/۳۸) تم اس سے آگے نہیں نکل سکتے (۲۹/۴) تم اس کی راہ میں روک نہیں پیدا کر سکتے (۵۲/۴)۔ یہ انقلاب آکر رہے گا!

⁂

مفاد پرستانہ ذہنیت کی طرف سے اس انقلابی دعوت کی مخالفت صرف نظری دلائل طلبی تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ وہ دنائیت (Mean ness) کی عام روش کے مطابق، عملی چھیڑ چھاڑ بھی شروع کر دیتے ہیں۔ کہیں اس جماعت کی تکذیب ہوتی ہے کہیں استہزاء۔ کہیں لوگوں کو بہکایا جاتا ہے کہ ان کا ساتھ چھوڑ دیں۔ مقصد ان تمام حربوں سے یہ ہوتا ہے کہ اس جماعت کو دوسری باتوں میں الجھا کر، انہیں ان کے پروگرام سے غافل کر دیا جائے۔

ان سے اعراض برتنا ضروری ہے

اس مقام پر اس جماعت کیلئے ضروری ہوتا ہے کہ مخالفین کے اس الجھاؤ میں نہ آجائیں بلکہ ان سے دامن بچاتے ہوئے اپنے پروگرام میں آگے بڑھتے جائیں۔ یہی وہ مقام تھا جہاں نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ (اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ

الجَمِیۡلَ (۱۵/۸۵ نیز ۱۵/۳؛ ۴۳/۸۹؛ ۵۲/۴۵؛ ۵۴/۶؛ ۵۳/۲۹) جس انقلاب کے لئے تم جدوجہد کر رہے ہو وہ تو آکر رہے گا۔ وہ ان کے روکنے سے رک نہیں جائے گا۔ یہ لوگ خواہ مخواہ تمہارا دامن الجھا رہے ہیں کہ تم آگے نہ بڑھ سکو۔ سو تم ان لوگوں سے نہایت عمدگی سے دامن بچا کر نکل جاؤ۔ ان سے الجھو نہیں۔ دوسری جگہ ہے (وَاصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ وَاهۡجُرۡهُمۡ هَجۡرًا جَمِیۡلًا۔ ۷۳/۱۰) جو کچھ یہ کہتے ہیں اس پر کبیدہ خاطر مت ہو۔ مبادا اس سے تمہارے پائے استقلال میں لغزش آجائے۔ ان باتوں کا علاج یہ ہے کہ انہیں اَن سنی کر کے اُن سے نہایت خوبصورتی سے بچ کر نکل جائیے (وَذَرۡنِیۡ وَالۡمُكَذِّبِیۡنَ اُولِی النَّعۡمَةِ وَمَهِّلۡهُمۡ قَلِیۡلًا۔ ۷۳/۱۱؛ ۶۸/۴۴؛ ۷۴/۱۱) یہ اربابِ دولت، سرمایہ داروں کے نمائندے، جو اس طرح تمہاری مخالفت کر رہے ہیں انہیں میرے حوالے کردو۔ ان سے میرا قانون خود نپٹ لے گا۔ انہیں تھوڑی سی مہلت مل رہی ہے اس کے بعد انقلاب آئیگا۔ اور اس وقت ان کی سمجھ میں خود بخود آجائے گا کہ تم کیا کہتے تھے (وَلَتَعۡلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعۡدَ حِیۡنٍ۔ ۳۸/۸۸)۔ کہیں کہا گیا کہ (فَتَوَلَّ عَنۡهُمۡ فَمَاۤ اَنۡتَ بِمَلُوۡمٍ ۵۱/۵۴) ان سے اعراض برتو، اس سے تمہارے اوپر کوئی حرف نہیں آئے گا۔ کہیں کہا کہ ان کی وجہ سے کبیدہ خاطر نہ ہو۔ خدا تمہارے ساتھ ہے (۱۶/۱۲۸؛ ۵۲/۴۹) تم اپنی جماعت کی تنظیم میں لگے رہو۔ (۲۰/۱۳۰) ان کی پرواہ مت کرو۔

قانونِ مکافاتِ عمل کا اصول یہ ہے کہ ہر کام اور اس کا نتیجہ مرتب ہونے میں ایک وقفہ ہوتا ہے۔ جو بیج آج بویا جاتا ہے اس کا پھل اپنے وقت پر لگے گا۔ عمل اور ظہورِ نتائج کے درمیان وقفہ کو قانونِ امہال (مہلت کا قانون) کہا جاتا ہے۔ اسی قانون کے مطابق نظامِ ربوبیت کی تشکیل کی جدوجہد اور اس کے قیام کے وقت میں ایک وقفہ ہوتا ہے۔

مہلت کا وقفہ

یہی وقفہ یا مہلت کا زمانہ ہے جس میں اس جماعت سے تاکید کی جاتی ہے کہ وہ مخالفین کی اِدھر اُدھر کی باتوں میں نہ الجھیں بلکہ اپنے پروگرام کی تدریجی تکمیل میں مسلسل کوشش کرتے جائیں۔ چونکہ اس مدت میں ان کی طرف سے کوشش جاری رہتی ہے۔ لیکن اس کا مشہود نتیجہ سامنے نہیں آتا (کیونکہ اسے تو اپنے وقت پر سامنے آنا ہے) اس لئے انہیں قدم قدم پر سمجھایا جاتا ہے کہ اس تاخیر سے پریشان نہ ہوں یہ انقلاب آکر رہے گا، لیکن بتدریج، آہستہ آہستہ، قدم بقدم، نامعلوم طریق سے، اس طرح غیر محسوس انداز سے جس طرح ایک پودا بڑھتا پھولتا اور پھلتا ہے۔ اس لئے ان سے کہا جاتا ہے کہ جو شخص اس حقیقت سے انکار کرتا ہے

اس سے الجھنے کی ضرورت نہیں۔ اسے میرے قانون کے سپرد کر دو (فَذَرْنِیْ وَمَنْ یُّکَذِّبُ بِھٰذَا الْحَدِیْثِ ۶۸/۴۴)
میرا قانونِ مکافاتِ عمل، آہستہ آہستہ، بتدریج اس طرح پکڑے گا کہ انہیں معلوم بھی نہیں ہوگا یہ گرفت کہاں سے آگئی۔
(سَنَسْتَدْرِجُھُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ ۶۸/۴۴) موجودہ وقفہ صرف مہلت کا زمانہ ہے۔ یہ نہیں کہ ہمارا
قانون کمزور ہے اس لئے یہ اس کی گرفت میں نہیں آسکے۔ ہمارا قانون بڑی سخت گرفت کا مالک ہے (وَاُمْلِیْ
لَھُمْ اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْنٌ۔ ۶۸/۴۵) یہ کہتے ہیں کہ یہ "پاگل پن" کی باتیں ہیں کہ تم اپنا سب کچھ دوسروں کو دیدو
اس سے تمہیں دنیا اور آخرت کی خوشگواریاں نصیب ہو جائیں گی۔ ان سے کہو کہ تھوڑی دیر انتظار کرو (فَسَتُبْصِرُ وَ
یُبْصِرُوْنَ۔ بِاَیِّکُمُ الْمَفْتُوْنُ ۶۸/۵-۶) تم بھی دیکھ لوگے اور یہ بھی دیکھ لیں گے کہ کون پاگل پن کی باتیں کرتا ہے!
تم اس وقفے سے گھبراؤ نہیں۔ ہمارا قانون انہیں چاروں طرف سے گھیرے جا رہا ہے (وَاللّٰہُ مِنْ وَّرَآئِھِمْ
مُّحِیْطٌ۔ ۸۵/۲۰) اس لئے کہ وہ قانون ایسا نہیں جس پر ان کی تکذیبی کارروائیاں کچھ اثر کر سکیں یا اس کے نقوش
زمانے کے تغیرات سے مٹ جائیں۔ وہ قانون ایسے محفوظ مقام میں رکھا گیا ہے جہاں زمانے کے اثرات پہنچ
نہیں سکتے (بَلْ ھُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِیْدٌ۔ فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ۔ ۸۵/۲۱-۲۲) اس لئے یہ جو اپنی فراوانیٔ مال و دولت پر اتراتے
ہیں انہیں میرے قانون کے حوالے کر دو (۷۴/۱۱) یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا مال و دولت اسی طرح سے بڑھتا
چلا جائیگا، (ثُمَّ یَطْمَعُ اَنْ اَزِیْدَ ۷۴/۱۵) بالکل نہیں! جو لوگ ہمارے قانون کی مخالفت کرتے ہیں ان کا مال
و دولت کس طرح زیادہ ہوتا جائے گا؟ (کَلَّا اِنَّہٗ کَانَ لِاٰیٰتِنَا عَنِیْدًا ۷۴/۱۶) انہیں سخت مشقت
میں ماخوذ کیا جائے گا (سَاُرْھِقُہٗ صَعُوْدًا۔ ۷۴/۱۷) جو کچھ ہم کر رہے ہیں یونہی مذاق نہیں۔ ایک قولِ فیصل ہے
(اِنَّہٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّمَا ھُوَ بِالْھَزْلِ۔ ۸۶/۱۳-۱۴) ہم جانتے ہیں کہ یہ لوگ بڑی بڑی گہری سازشیں کر رہے
ہیں اور بڑی بڑی خفیہ تدبیریں سوچ رہے ہیں۔ لیکن ہمارا قانون اس سے بے خبر نہیں۔ وہ بھی اپنی جگہ اپنا
کام کر رہا ہے (اِنَّھُمْ یَکِیْدُوْنَ کَیْدًا وَّ اَکِیْدُ کَیْدًا ۸۶/۱۵-۱۶) بس تھوڑی سی مہلت کی بات ہے۔ اس کے
بعد یہ سامنے آجائے گا (فَمَھِّلِ الْکٰفِرِیْنَ اَمْھِلْھُمْ رُوَیْدًا ۸۶/۱۷) انہیں معلوم نہیں کہ خدا کا قانون سب کچھ
دیکھ رہا ہے (اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰہَ یَرٰی۔ ۹۶/۱۴) اگر یہ اپنی روش سے باز نہیں آئیں گے تو ان کے لئے روسیاہی
ہوگی (۹۶/۱۶-۱۷) اس وقت انہیں مہلت دی جاتی ہے (۷/۱۸۲؛ ۱۶/۶۱؛ ۳۵/۴۵) کہ یہ اپنی روش سے باز آجائیں۔

اس لئے کہ ہمارے قانون میں ظہورِ نتائج کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ جب وہ وقت آجاتا ہے تو پھر کوئی قوت اسے آگے پیچھے نہیں کرسکتی (۳۴/۳۴)۔ ابھی تم (اے رسول) ان کے اندر ہو۔ انہیں ان کی غلط روش کے انجام و عواقب سے آگاہ کر رہے ہو۔ اس لئے ابھی ان کے پاداشِ عمل کا وقت نہیں آیا (۳۳/۸)۔ جب تم انہیں چھوڑ کر نکل جاؤ گے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ان میں تبدیلیٔ احوال کی صلاحیت باقی نہیں رہی۔ اس کے بعد بساط اُلٹ جائے گی۔ پھر تم دیکھو گے کہ ان بڑے بڑے سرمایہ داروں کا حشر کیا ہوتا ہے جو نوعِ انسانی کے سامانِ پرورش کو اس طرح روکے ہوئے ہیں۔ (۶۳/۱۲-۱۶)۔ اس وقت ان کی جمع شدہ دولت کسی کام نہیں آئے گی (۶۹/۲۸ ; ۹۲/۱۱ ; ۱۱۱/۲)۔ انقلاب کی گھڑی انہیں آوازیں دے دیکر بلائے گی (۷۰/۱۷)، اس وقت یہ دیکھیں گے کہ جس طرف نگاہ اٹھاکر دیکھتے ہیں سامنے موت آتی دکھائی دیتی ہے وَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِن كُلِّ مَكَانٍ (۱۴/۱۷) یہ چاہیں گے کہ اس ذلت اور تباہی کے عذاب سے پہلے پہلے ختم ہو جائیں لیکن (وَمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ۱۴/۱۷) انہیں موت بھی تو نہیں آئے گی۔ اُس وقت ان کی حالت یہ ہوگی کہ نگاہیں پھٹ رہی ہیں۔ ڈھیلے باہر کو آرہے ہیں۔ یہ میدانِ جنگ سے بدحواس، سر پہ عورتوں کے دوپٹے اوڑھے بھاگے جارہے ہیں۔ اس وقت ان کے تمام اعزہ و اقربا اور دوست و رفیق ان کا ساتھ چھوڑ جائیں گے۔ حتیٰ کہ انکی نگاہ بھی کاشِ بہ چشم میں واپس نہیں آئے گی اور ان کے دل ڈوبتے چلے جائیں گے (۱۴/۴۳)۔ اس کے بعد یہ مجرمین ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے سامنے آئیں گے۔ ایک ایک زنجیر میں کئی کئی ہاتھ بندھے۔ ان کی زرہیں جن پر انہیں اس وقت اس قدر بھروسہ ہے، اس طرح نیچے گر رہی ہوں گی جیسے پگھلی ہوئی دھات کے قطرے گر رہے ہوں۔ ان کے چہرے آگ سے جھلسے ہوئے ہوں گے (۱۴/۴۹-۵۰)۔ یہ اپنے ملک میں ذلیل و خوار ہوں گے اور ان پہ یہ تباہیاں ایسے مقامات سے آئیں گی جو ان کے سان گمان میں بھی نہ ہوں گے۔ یہ اپنی اپنی جد و جہد میں مصروف ہوں گے اور انقلاب کا آہنی پنجہ انہیں آدبوچیگا (۱۶/۴۵-۴۶)۔

غلط اثر

لیکن مخالفین اس قانونِ تدریج و امہال سے الٹا اثر لیتے۔ وہ مذاق کرتے اور کہتے کہ جس تباہی اور بربادی سے تم ہمیں اس طرح ڈراتے دھمکاتے ہو، وہ ہے کہاں؟ وہ کب آئے گی، (وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۔ ۲۷/۷۱) اس کے جواب میں مخالفین سے تو کچھ کہنا بیکار تھا البتہ خود اپنی جماعت سے کہا جاتا کہ ان کی ان باتوں سے کہیں دل گرفتہ نہ ہو جانا (وَلَا تَكُن فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ ۲۷/۷۰)

خدا کا قانون برحق ہے۔ وہ نتیجہ خیز ہو کر رہے گا۔ ان لوگوں کی باتیں تمہارے دل میں جذبۂ مرعوبیت نہ پیدا کر دیں! فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِينَ لَا يُوقِنُونَ۔ (۳۰/۶۰) ہمارا قانون اُن لوگوں کے نقشے الٹ کر رکھ دیگا جو دنیا میں تعمیری نتائج ربوبیت پیدا کئے بغیر قوت اور اقتدار چاہتے ہیں (سَأَصْرِفُ عَنْ آيَاتِيَ الَّذِينَ يَتَكَبَّرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ...... ۷/۱۴۶)۔ یہ لوگ حصولِ اقتدار کے لئے ایسی تدابیر اختیار کرتے ہیں جس سے معاشرے میں ناہمواریاں پیدا ہوتی رہیں۔ لیکن ان کی ان تدابیر کا وبال خود انہی کے اوپر پڑے گا۔ یہ ہمارا اٹل قانون ہے جو نہ اس سے پہلے کسی کی خاطر بدلا ہے اور نہ اب بدلے گا۔ اگر کسی کو اس میں شک ہو تو اسے کہو کہ ذرا تاریخِ عالم پر نگاہ ڈالو اور دیکھو کہ اس قسم کا نظام کبھی کامیاب ہوا بھی ہے؟ (۳۵/۴۳-۴۴) لیکن بات وہی ہے جو پہلے کہی جا چکی ہے کہ ہر عمل کے ظہورِ نتائج کا ایک وقت متعین ہوتا ہے۔ وہ نتیجہ اس سے قبل سامنے آ نہیں سکتا (لِكُلِّ نَبَإٍ مُسْتَقَرٌّ وَسَوْفَ تَعْلَمُونَ۔ ۶/۶۷) اس وقت تم دیکھو گے کہ تمہارے مخالفین کی جڑیں کٹ جائیں گی (۵۴/۴۵)۔ چونکہ تمہارا نظام صحیح اصولوں پر استوار ہو رہا ہے اس لئے ہمارا قانون اسے کامیاب بنا کر چھوڑے گا (۳۰/۴۷) یہ ہم نے لکھ دیا ہے (۲۱/۱۰۵)۔ اگر دنیا میں صحیح نظام کے پیرووں اور غلط نظام کے متبعین کی زندگی اور انجام ایک جیسا ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کائنات میں ہمارا قانون کہیں کارفرما نہیں۔ قانون صرف یہی ہے کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ یہ تصور بالکل غلط ہے ان دونوں گروہوں کی زندگی اور اس کا مآل یکساں نہیں ہو سکتا (۳۸/۲۸ ؛ ۴۵/۲۱) یہ لوگ اگر اپنی غلط روش سے باز نہیں آتے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ اس انجام کا انتظار کر رہے ہیں جو اس سے پہلے ان ہی جیسی روش پر چلنے والی اقوام کا ہوا۔ (۱۰/۱۰۲ ؛ ۱۸/۵۵)۔ اگر یہی بات ہے تو ان سے کہدو کہ بہت اچھا! تم بھی انتظار کر رہے ہو، میں بھی انتظار کرتا ہوں (۳۲/۳۰ ؛ ۱۱/۱۲۲) میں تم سے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ تم جس نظام کے ماتحت زندگی بسر کر رہے ہو بسر کرتے جاؤ۔ ہم اس میں دخل اندازی نہیں کرتے۔ اور جس پروگرام کے ماتحت ہم زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں، ہمیں بسر کرنے دو۔ ہمارے تجربے میں تم دخل انداز مت ہو۔ نتیجہ خود بتا دے گا کہ کس کا پروگرام کامیابی کا موجب بنتا ہے اور کس کا نظام تباہی لاتا ہے

آخری نتیجہ

قُلْ يَا قَوْمِ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ ۖ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ مَنْ تَكُونُ

لَہٗ عَاقِبَۃُ الدَّارِ، اِنَّہٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۶/۱۳۶)، نیز ۱۱/۱۲۱-۱۲۲؛ ۲۰/۱۳۵؛ ۳۹/۳۹؛ ۴۲/۲۱)

ان سے کہدو کہ اے قوم مخالف! تم اپنے نقشوں کے مطابق کام کرتے جاؤ اور ہمیں اپنے پروگرام کے مطابق کام کرنے دو۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد معلوم ہو جائے گا کہ انجام کار کامیابی کا ٹھکانہ کس کے لئے ہے تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے کہ خدا کا قانون کبھی ان لوگوں کی کھیتی پروان نہیں چڑھنے دے گا جو دوسروں کے حقوق میں کمی کرتے ہیں۔

تم دیکھ لوگے کہ اِنَّہٗ لَا یُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ (۱۰/۱۷) مجرمین کبھی کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ اِنَّہٗ لَا یُفْلِحُ الْکٰفِرُوْنَ (۲۳/۱۱۷) اس کے قانون سے انکار کرنے والے کبھی کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکیں گے لَا یُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِیْنَ (۱۰/۸۱) ناہمواریاں پیدا کرنے والوں کے پروگرام میں کامیابی و شادکامی کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔ یہ خدا کا اٹل قانون ہے جو تمہارے سامنے آجائے گا۔ بس میں اتنا چاہتا ہوں کہ تم میرے پروگرام میں دخل انداز نہ ہو۔ تم میرے راستے میں روڑے مت اٹکاؤ۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہتا، تم مجھے کچھ نہیں کہو۔ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ نتائج سب کے سامنے آجائیں گے!

غور کیجیے! اپنے نظام (دین) کو مبنی علی الحق ثابت کرنے کا کس قدر سائنٹفک طریق ہے! کوئی نظری بحث نہیں۔ کوئی لفظی گورکھ دھندا نہیں۔ یوں باتیں ہو رہی ہیں گویا لیبارٹری (معمل) میں کھڑے ہیں۔ ٹسٹ کرنے کا عمل (Process) جاری ہے۔ کہا صرف یہ جا رہا ہے کہ جلدی مت کرو۔ اس طریق امتحان (Testing Process) کو ختم ہو لینے دو۔ امتحان کی نلکی (Test Tube) خود بتا دے گی کہ نتیجہ کیا نکلا؟ کس قدر محکم یقین ہے اپنے پروگرام کے حق ہونے کا! اور پھر یہ بھی دیکھئے کہ اس پروگرام کے نتائج اسی دنیا میں سامنے آجانے تھے (فسوف تعلمون) یہ نہیں کہا گیا کہ قیامت میں جا کر دیکھ لینا کہ کون جنت میں جاتا ہے اور کون جہنم میں۔ کہا یہ گیا ہے کہ ذرا توقف کرو۔ ہمارا پروگرام پورا ہو لینے دو۔ تم ابھی دیکھ لوگے کہ جنت کس کے حصے میں آتی ہے۔

ابھی دیکھ لوگے

قرآن نے اسی حقیقت کو قصۂ بنی اسرائیل کے ضمن میں بڑے واضح انداز میں بیان کیا ہے۔ حضرت موسیٰ سے کہا جاتا ہے کہ ہمارے احکام جو تمہیں دیئے گئے ہیں ان پر خود بھی نہایت محکم طور پر عمل پیرا ہو (فَخُذْهَا بِقُوَّۃٍ) اور

اپنی قوم کو بھی حکم دے کہ وہ انہیں بطریق احسن اختیار کریں (وَاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا) اس کے بعد ذہن اسی طرف جاتا ہے کہ یہ کہا جائے گا کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بنی اسرائیل کو یہ ملے گا اور وہ ملے گا، لیکن قرآن نے یہ نہیں کہا قرآن نے کہا ہے کہ جب بنی اسرائیل اس نظام خداوندی کو اپنے ہاں قائم کرلیں گے تو انہیں فوراً نظر آجائے گا کہ جن لوگوں نے اس قانون سے سرکشی برتی تھی اس کا انجام کیا ہوتا ہے (سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ۷/۱۴۵) یہ آیت بڑی غور طلب ہے۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ تم اس کی فکر نہ کرو کہ قوم فرعون کیا کچھ کررہی ہے تم اپنی تمام توجہات اور مساعی کو نظام خداوندی کے قیام پر مرکوز کردو۔ اس نظام کا قیام ہی ان کے غلط نظام کی تباہی کا موجب ہوجائیگا اس لئے کہ جب تعمیری نتائج پیدا کرنے والا نظام متمکن ہوجائے تو تخریبی نتائج پیدا کرنے والا نظام خود بخود ختم ہوجاتا ہے۔ (جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ) یہ لوگ جو دنیا میں بغیر تعمیری نتائج برآمد کئے، بڑے بننے کے دعویدار ہیں، میں انہیں اپنے قوانین کے زور سے ان کے مقام سے الگ کردوں گا (سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ..... ۷/۱۴۶) یعنی تم صرف ہمارے قانون کو ایک رائج نظام کی شکل میں اپنے ہاں نافذ کردو، فریق مقابل کا غلط نظام، اس کے زور دروں سے خود ختم ہوجائے گا۔ یہی کچھ رسول اللہ اور جماعت مومنین سے کہا گیا جب فرمایا کہ (وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ) جب یہ سرکش قوتیں تمہارے نظام میں بگاڑ پیدا کرنے کے لئے تدبیریں کریں تو تم کیا کرو؟ تم اور زیادہ توجہ اور تیزی سے اپنے آپ کو نظام خداوندی کی پناہ میں لے آؤ۔ اس طرح جیسے ایک نوزائیدہ بچہ خطرہ کے وقت اپنی ماں کی آغوش میں پناہ لیتا ہے اور وہاں اسے صرف پناہ ہی نہیں ملتی بلکہ سامان پرورش بھی مل جاتا ہے (فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ۔ تعوذ کے یہی معنی ہیں) اس لئے کہ خدا کا قانون فریق مقابل کی سب باتیں بھی سنتا ہے اور تمہاری حالت سے بھی باخبر ہے (اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۷/۲۰۰) اس کے بعد اس کی اور وضاحت کردی جب کہا کہ جو لوگ اپنے آپ کو قانون خداوندی سے ہم آہنگ رکھتے ہیں (اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا) ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ انہیں جب سرکش قوتوں کی طرف سے کوئی گزند پہنچتی ہے (اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا) تو وہ اس قانون پر اور زیادہ غور و فکر سے توجہ دیتے ہیں اور اس سے پوچھتے ہیں کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام حالات و مقتضیات ان کی آنکھوں کے سامنے بے نقاب ہوکر آجاتے ہیں (فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ۷/۲۰۱) اس کے بعد ان مخالف قوتوں کا مقابلہ کرنا

کچھ مشکل نہیں ہوتا

مخالفین سے یہ سب کچھ کہہ دیا گیا۔ لیکن وہ اپنی قوت اور دولت کے نشے میں مخمور تھے۔ وہ ان دلائل و براہین پر کب کان دھرتے تھے؟ انہوں نے اپنی مخالفت میں اور بھی شدت اختیار کرلی اور ٹھان لی کہ اس نظام نو کے داعی کی زندگی ہی ختم کردی جائے تاکہ یہ دعوت ہمیشہ کیلئے ختم ہو جائے۔ اب وہ وقت آگیا جب اس جماعت سے کہدیا گیا کہ تم ان سے قطع علائق کر کے الگ ہو جاؤ۔ تم ان سے کہدو کہ تمہارے اور ہمارے درمیان کوئی قدر مشترک باقی نہیں رہی۔ ہم جا رہے ہیں۔ اب تمہاری روشِ زندگی کے نتائج تمہارے لئے ہوں گے اور ہمارے نظام

قطع علائق

کے نتائج و ثمرات ہمارے لئے (لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ۔ ۱۰۹)۔ یہ لو! ہم چلے۔ اِنِّی مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ۔ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلَی اللّٰهِ۔

لیکن مفاد پرست گروہ اس طرح پیچھا کب چھوڑا کرتا ہے۔ مکہ کے متمول تاجر اور کعبے کے متولی کب برداشت کرسکتے تھے کہ (ان کے اپنے ہاں نہ سہی) دنیا کے کسی خطۂ زمین میں بھی ربوبیت عامہ کا نظام قائم ہو جائے۔ اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ اس نظام کے اثرات بہت دور رس ہوں گے۔ چنانچہ وہ آگے بڑھے اور اس نظام کے قیام کو بزور شمشیر روکنا چاہا۔

یہاں پہنچ کر وہ مقام آجاتا ہے جہاں اس نظام ربوبیت کے داعیوں کے لئے آخری فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ یا تو وہ ان سرکش قوتوں کے سامنے سپر ڈال کر، انسانیت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان کے آہنی پنجہ میں جکڑا رہنے دیں اور یا نوعِ انسان کی آزادی اور بہبود کیلئے سربکف میدان میں آجائیں۔ قرآن اس مقام پر دوسرے مسلک کی تائید کرتا ہے (یعنی نوعِ انسان کی منفعت کی خاطر اپنی جان دیدینا۔) اگر آپ غور کریں تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) اس مقام پر جان سپردگی، ربوبیت کے پروگرام ہی کی ایک (اور آخری) کڑی ہوتی ہے۔ نظام ربوبیت کی بنیاد کس اصول پر ہے؟ اس اصول پر کہ انسانی ذات (Human Personality) کی تربیت (Development) "دینے" (اعطی) سے ہوتی ہے یعنی انسان کے پاس جو کچھ ہے اسے نوعِ انسان کی منفعت کے لئے وقف کردے۔ انسان کے پاس (اپنی

استعداد کی کمائی (یعنی) مال ہوتا ہے اور (خدا کی دی ہوئی) جان۔ جب تک ربوبیتِ عامہ، مال دینے سے

تسلیم جاں ہے زندگی!

ہوتی رہتی ہے، یہ مال دیئے جاتا ہے۔ اور جب ایسا وقت آجائے کہ ربوبیت عامہ کے لئے اس کی جان کی ضرورت پڑ جائے تو یہ جان بھی دیدیتا ہے۔ اس طرح اس کی ذات، حیاتِ جاوید (Immortality) حاصل کرلیتی ہے۔ لہٰذا اس مقام پر جاں بکف میدان میں آجانے کا قرآنی حکم، اسی سلسلہ تربیتِ ذات کی آخری کڑی ہے۔ دیکھئے قرآن نے "تلوار نازل کرنے" کا ذکر کس مقام پر کیا ہے! سورۂ حدید (کی ان آیات کو ایک دفعہ پھر سامنے لائیے جو پہلے گذر چکی ہیں اور جن) میں کہا گیا ہے کہ اللہ ان "شکاریوں" کو پسند نہیں کرتا جو خود موٹا ہونے کی خاطر نوعِ انسان کا شکار کرتے ہیں (وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ۔ ۵۷/۲۳) یہ وہ لوگ ہیں جو ہمیشہ اپنے فائدے کو سامنے رکھتے ہیں اور اس کے لئے سب کچھ سمیٹ کر جمع رکھنے کی فکر کرتے رہتے ہیں۔ چونکہ یہ خود غرضانہ روش بڑی معیوب ہوتی ہے اور انہیں خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ اس طرح یہ لوگ سوسائٹی میں بدنام نہ ہو جائیں اس لئے یہ اس قسم کے قانون بنا دیتے ہیں، جن کی رو سے اس طرح دولت جمع کرنا قانوناً جائز (Legal) قرار پا جائے اور زر اندوزی اور مفاد پرستی معاشرہ کا معمول بن جائے (الَّذِينَ يَبْخَلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ۔ ۵۷/۲۴)۔ اس کے بعد قرآن نے بتایا ہے کہ اس (غلط) معاشرہ کی جگہ صحیح معاشرہ قائم کرنے کے لئے کیا صورت اختیار کی جائے گی۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے لئے حسب ذیل پروگرام وضع کیا گیا ہے۔

(i) لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ (۵۷/۲۵) ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجا۔ یہ پہلا مرحلہ انہام و تفہیم کا ہے یعنی دلائل و براہین سے ان میں ذہنی تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کرنا۔

(ii) وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (۵۷/۲۵)

"اور ان کے ساتھ ہم نے قانون عدل بھیجا تاکہ نوعِ انسانی میں توازن قائم رکھا جا سکے"

یعنی ایسا معاشرہ متشکل کیا جائے جس میں نوعِ انسانی کی منفعت اور ربوبیت کے نظام کو قانون کی رو سے قائم کیا جائے۔

نزولِ شمشیر

(iii) وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (۵۷/۲۵)

"اور ہم نے فولاد (کی شمشیر) نازل کی جس میں بڑی قوت ہے اور نوع انسانی کی منفعت کا راز پوشیدہ ہے" یعنی اگر ایسا وقت آجائے کہ مفاد پرست گروہ اس نظام کے قیام میں عملاً مزاحمت کرے یا اس نظام کو تباہ و برباد کرنے کی کوشش کرے اور نہ تو دلائل و براہین سے بات سمجھنے کی کوشش کرے اور نہ ہی آئین و قانون کا احترام کرے، تو اس وقت اس کے سوا چارہ نہیں رہے گا کہ ان کی انسانیت سوز سرکشی کو تلوار کے زور سے روکا جائے۔ اسی سے یہ بھی دیکھا جا سکے گا کہ خود نظام ربوبیت قائم کرنے والی جماعت میں، لوگوں کی تربیت ذات کس حد تک ہو چکی ہے اور کتنے لوگ ایسے ہیں جو اپنے پروگرام کے ان دیکھے نتائج پر یقین رکھتے ہوئے، اس نظام کے قیام میں جان تک دیدینے کے لئے تیار ہیں
وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ - (۵۷/۲۵)

قرآن کا بیشتر حصہ اس اہم نقطہ کی تشریح ہے کہ "تلوار" (قوت) کا استعمال کہاں کرنا چاہیئے اور کیسے کرنا چاہیئے۔ اس تفصیل میں جانے کا یہ مقام نہیں۔ (اس کے لئے میری کتاب معراج انسانیت میں "جہاد" کا باب دیکھنا چاہیئے) اس مقام پر صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ قرآن کی رو سے قوت

"لادیں" ہو تو ہے زہر ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاق

اور یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کی رو سے "دین" کا مفہوم کیا ہے؛ نوع انسانی کی ربوبیت اور اس کے ذریعے انسانی ذات کی تربیت۔ یعنی ایسے معاشرے کا قیام جو خدا کی صفت رب العالمینی کا مظہر ہو اور جس میں انسان کی اپنی ذات کی تکمیل ہو جائے۔ قرآن اس معاشرے کا ضابطہ (code) ہے اور "تلوار" اس کی پاسبان۔ قرآن تلوار کی نگہداشت کرتا ہے کہ یہ بے محل اٹھنے پائے اور تلوار، قرآن کی محافظت کرتی ہے کہ کوئی اسے غیر مؤثر (Ineffective) نہ بنا دے۔

ایں دو قوت حافظ یک دیگر اند
کائنات زندگی را محور اند

ان مسلح مزاحمتوں کو روکنے کا سلسلہ برسوں تک جاری رہا تا آنکہ ایک ایک کرکے یہ تمام قوتیں تباہ ہو گئیں۔

حقوقِ انسانیت میں کمی کرنے والوں کی جڑیں کٹ گئیں (فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا۔ ۶/۴۵) اور خدا کی ربوبیت عالمینی کا نظام دنیا بھر کی نگاہوں میں باعثِ حمد و ستائش بن گیا۔ (وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۶/۴۵) اور

وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا (۳۹/۶۹)

اور زمین اپنے پرورش دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھی

ایک ضمنی گوشہ

میں نے جو کچھ گزشتہ صفحات میں لکھا ہے (اور جو کچھ اس کے بعد آئے گا) اس میں آپ نے ایک چیز کو نمایاں طور پر محسوس کیا ہوگا۔ اور وہ یہ کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کی سند میں صرف قرآن کی آیات پیش کی ہیں۔ تاریخ اور روایات سے کچھ نہیں لکھا (حتیٰ کہ میں نے یہ بھی نہیں بتایا کہ نبی اکرمؐ نے جس نظامِ ربوبیت کو متشکل فرمایا اس کے تفصیلی خط و خال کیا تھے اور وہ کب تک علیٰ حالہ قائم رہا) اس کی یہ وجہ نہیں کہ تاریخ و روایات میں قرآنی نظامِ ربوبیت کی تائید میں کچھ نہیں ملتا۔ تفحص و تجسس سے ان میں، اس کی تائید میں، شہادات مل سکتی ہیں۔ لیکن ان تاریخی روایات کی کیفیت یہ ہے کہ ان میں جہاں کسی مسئلہ کی تائید میں کچھ ملتا ہے، وہاں، اس کی تردید میں بھی بہت کچھ مل جاتا ہے۔ ان میں مخالف اور موافق دونوں قسم کی شہادات موجود ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان ذرائع سے آج تک کسی جزئی سے جزئی مسئلہ کے متعلق بھی کوئی متفق علیہ فیصلہ نہیں مل سکا حتیٰ کہ آپ یہ بھی نہیں طے کرسکے کہ نماز میں ہاتھ سینہ پر باندھنے چاہئیں یا اس سے نیچے۔ آمین اونچی آواز سے کہنی چاہیئے یا خاموشی سے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر ان کتابوں سے مسئلہ زیرِ نظر کی تائید میں کچھ پیش کیا جائے تو ان ہی کتابوں سے اس کے خلاف بھی بہت کچھ نکل آئے گا۔ اس کے بعد یہ بحث چھڑ جائے گی کہ ان میں سے کونسی چیز غلط اور کونسی صحیح ہے۔ (اور اس بات کا فیصلہ آج تک نہیں ہوسکا کہ ان میں سے کون سی چیز غلط ہے اور کون سی صحیح) چنانچہ اگلے دنوں ایک بحث چھڑی کہ زمین کا بٹائی پر دینا جائز ہے یا نہیں اور رسول اللہ اور صحابہ کے زمانہ میں اس باب میں کیا عمل رہا تھا۔ ایک فریق کا دعویٰ تھا کہ یہ جائز نہیں۔ دوسرا کہتا تھا کہ جائز ہے۔ دونوں فریق اپنے دعوے کی تائید میں احادیث پیش کر رہے تھے اور اس کے مدعی تھے کہ ان کی پیش کردہ احادیث صحیح ہیں اور فریقِ مقابل کی غلط۔ یہی صورت ہر مسئلہ میں پیش آجاتی ہے۔ دین میں سند (Authority) خدا کی کتاب ہے جس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے، اور جس میں کسی قسم کا اختلاف نہیں۔ اس لئے دین میں جس چیز کو بطور سند پیش کیا جاسکتا ہے وہ صرف

قرآن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے نظامِ ربوبیت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے قرآن ہی سے لکھا ہے۔

ایک بات بالکل واضح ہے اور وہ یہ کہ اگر آپ کو یہ تسلیم ہے کہ جو کچھ ان صفحات میں لکھا گیا ہے وہ قرآن کی رُو سے صحیح ہے، تو اس کے بعد ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ نبی اکرمؐ نے اسی کے مطابق معاشرہ کی تشکیل فرمائی ہوگی۔ اس لئے کہ نبی اکرمؐ کا فریضۂ حیات ہی یہ تھا کہ آپ قرآن کے مطابق نظام قائم کریں۔ آپ کا کوئی ارشاد یا عمل قرآن کے خلاف ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس معیار کے مطابق ہمارے لئے آسان ہو جاتا ہے کہ ہم اس سارے تاریخی مواد کو (جو ہمارے ہاں چلا آرہا ہے) قرآن کی روشنی میں پرکھ کر دیکھ لیں۔ اس اصول کے ماتحت، جو کچھ قرآن کے مطابق ہوگا اس کے متعلق ہم کہہ سکیں گے کہ گمانِ غالب ہے کہ تاریخ کے یہ بیانات صحیح ہیں۔ اس اصول کی روشنی میں یہ باتیں اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہیں کہ رسول اللہ اپنے ہاں کیوں درہم دینار نہیں رہنے دیا کرتے تھے اور آپ نے کیوں کوئی چیز بطور ترکہ کے نہیں چھوڑی۔ یا یہ کہ اس نظام کی تشکیل کے دوران میں آپ نے کیوں یہ فرمایا کہ

جس کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ سواری ہو وہ اس شخص کو دیدے جس کے پاس سواری نہیں ہے۔ جس کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ توشہ ہو وہ اس شخص کو دیدے جس کے ہاں توشہ نہ ہو۔ ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ آپ نے مال کی بہت سی قسمیں بیان فرمائیں حتیٰ کہ ہم نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ ضرورت سے زیادہ کسی مال پر بھی ہمارا حق نہیں۔

اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد امام ابن حزم نے (المحلیٰ میں) لکھا ہے کہ

حضرتِ عمرؓ نے ارشاد فرمایا کہ جو کچھ میں نے بعد میں سمجھا ہے اگر پہلے سمجھ لیتا تو مالداروں کی ضرورت سے زیادہ مال کو چھین کر فقراء و مہاجرین میں تقسیم کر دیتا[1]۔

---

[1] ابو محمد بن حزم نے اس فقہی مسئلہ پر بھی بحث کی ہے کہ جن لوگوں کے پاس رزق کی زیادتی ہو اُن سے رزق چھین کر ضرورت مندوں کو دیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ اس باب میں وہ معترضین کی رائے بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

اور یہ لوگ خود ہی کہتے ہیں (یعنی معترضین) اگر کوئی شخص پیاسا ہو اور اسے مرنے کا خوف ہو، تو اس شخص کا فرض ہے کہ جہاں سے اس کو پانی مل سکتا ہو لے لے۔ اور ضرورت پڑے تو اس پر قتال بھی کر سکتا ہے۔

ابو محمد بن حزم کہتے ہیں کہ آخر اس میں کیا فرق ہے کہ پیاس کی بنا پر اپنے آپ سے موت کو رفع کرنے

(باقی صـ ۲۲۵ پر)

لیکن اگر ہم اس کے برعکس یہ مسلک اختیار کریں (جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے) کہ جو کچھ ہمارے پاس کتبِ روایات و سیر میں آیا ہے اسے صحیح تسلیم کرلیں اور پھر اس کے مطابق قرآن کا مفہوم متعین کریں تو یہ روش بداہتاً غلط ہوگی۔ اس لئے کہ تاریخ بہرحال ظنی ہے اور قرآن یقینی۔ ظنی چیز کو یقینی کی روشنی میں پرکھنا صحیح ہوگا نہ کہ یقینی کو ظنی کے تابع رکھنا ہماری تاریخ (جس میں کتبِ روایات و سیر و آثار شامل ہیں) ہمارے اس دور میں مرتب ہوئی جب ہمارا معاشرہ قرآنی خطوط اور منہاجِ نبوت سے ہٹ کر پھر سے مفاد پرستوں کے تابع آچکا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب خلافت کی جگہ ملوکیت آچکی تھی اور زندگی کے ہر شعبے پر متغلبین اور متسلطین چھا چکے تھے۔ ملوکیت اور سرمایہ پرستی ایک ہی سکے کے دو رُخ ہوتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جو تاریخ اس دور میں مرتب ہوگی اس میں عہدِ رسالتمآب کا صحیح صحیح نقشہ کس طرح آسکے گا؟ اس لئے کہ اگر اس وقت اس عہد کا صحیح صحیح نقشہ پیش کردیا جاتا تو اس سے صاف نظر آجاتا کہ اس دور کا معاشرہ کس طرح رسول اللہ کے زمانے کے معاشرے سے یکسر مختلف تھا۔ ملوکیت کا استبداد اسے کس طرح گوارا کرسکتا تھا کہ اسے کہا جائے کہ جو کچھ تم کرتے ہو وہ خدا کے حکم اور رسول اللہ کے عمل کے بالکل خلاف ہے۔ یہ وجہ ہے کہ ہمارے پاس رسول اللہ کے دور کی صحیح [illegible] (جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے) ہماری

(۲۲۴ صفحہ کا بقیہ فٹ نوٹ)

کے لئے تو یہ لوگ قتال کو مباح قرار دیتے ہیں اور بھوک اور برہنگی کی بنا پر اپنے آپ کو موت سے بچانے کے لئے یہ لوگ قتال کو جائز قرار نہیں دیتے۔ یہ امر اجماع کے، قرآن کے، سنن کے، قیاس کے، سب کے خلاف ہے۔

ابو محمد بن حزم کہتے ہیں کہ کسی مسلمان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اضطرار کی حالت میں مُردار یا سور کا گوشت کھالے۔ حالانکہ اسے ایسا کھانا مل سکتا ہے جو اس کے ساتھی کی ضرورت سے زیادہ ہے۔ وہ ساتھی خواہ مسلمان ہو، خواہ ذمی ہو۔ کیونکہ اس کھانے والے آدمی پر فرض ہے کہ وہ بھوکے کو کھلائے۔ جب یہ بات اس طرح ہے تو وہ مردار اور سور کا گوشت کھانے کیلئے مضطر نہیں ہے۔ اور اس کے لئے جائز ہے کہ وہ اس کے لئے قتال کرے۔ اگر قتال کی صورت میں یہ شخص مارا جائے تو اس کے قاتل پر قصاص واجب ہوگا۔ اور اگر روکنے والا مارا جائے تو وہ خدا کی لعنت میں گرفتار ہوگا۔ کیونکہ اس نے ایک حق کو روکا ہے اور یہ باغیوں کے گروہ کا کام ہے اور حق تعالیٰ کا ارشاد ہے (فان بغت احدٰهما علی الاخرٰی فقاتلوا التی تبغی حتی تفیٓء الی امر اللہ) اور ایک حق کو روکنے والا اپنے اس بھائی

یعنی جس کا اس پر حق ہے باغی ہے۔ اور اسی بنا پر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مانعین زکوٰۃ سے قتال فرمایا تھا۔ وباللہ التوفیق۔
(المحلی۔ جلد ۶۔ صفحہ ۱۵۶ - ۱۵۹)

تاریخ اس دور میں مرتب ہوئی جب منبر و محراب سے بادشاہ کو ظل اللہ کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ جس دور میں ملوکیت جیسی یکسر خلاف قرآن چیز کو ظل اللہ بنا دیا گیا ہو اس میں سرمایہ داری اور مفاد پرستی کیوں حلال وطیب نہ قرار پا چکی ہوگی اس دور کی مرتب شدہ تاریخ میں قرآنی نظام ربوبیت کی تو جھلک تک بھی دکھائی نہیں دے سکتی۔ بس اتنا ہی ہوسکتا ہے کہ یہاں وہاں کوئی بکھرے ہوئے ٹکڑے مل جائیں جن سے تصویر کے کچھ بے ربط سے نقوش نظر آجائیں۔ اندریں حالات کسی کا یہ مطالبہ کہ جس نظام ربوبیت کا تصور قرآن پیش کرتا ہے، تاریخ سے ثابت کرو کہ رسول اللہ کے زمانے میں وہی نظام قائم تھا، اور اگر تم اسے ثابت نہیں کر سکتے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نظام کا جو نقشہ از روئے قرآن پیش کیا گیا ہے وہ غلط ہے، ایک ایسا مطالبہ ہے جو علم وحقیقت کیخلاف اور مغالطہ آفرینی پر مبنی ہے۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ جو نقشہ یہاں پیش کیا گیا ہے وہ اس مسلک کیخلاف ہے جو مسلمانوں میں متواتر چلا آرہا ہے اور جس کی رو سے "ہر شے پر انفرادی ملکیت بے حد نہایت جائز ہے" تو اس کے متعلق گذارش ہے کہ مسلمانوں میں تو بادشاہت (ملوکیت) بھی تیرہ سو سال سے متواتر چلی آرہی ہے۔ اگر اس تواتر کے باوجود ملوکیت خلاف اسلام ہے تو مسلک سرمایہ پرستی محض تواتر کی دلیل سے کس طرح اسلام کے عین مطابق قرار پا سکتا ہے؟

یاد رکھئے کہ دین میں سند نہ تاریخ کے مشمولات ہیں اور نہ مسلمانوں کے متواتر و متوارث عقائد و مسالک۔ سند ہے صرف قرآن۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے قرآنی نظام ربوبیت پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ صرف یہ دیکھئے کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ قرآن کی رو سے صحیح ہے یا غلط۔ وذالک دین القیّم۔

ایک اہم اعتراض

اس ضمن میں ایک سوال البتہ ایسا ہے جسے اگر صاف نہ کیا گیا تو وہ ذہنوں میں خلجان پیدا کرنے کا موجب ہوسکتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوگا کہ اگر قرآنی نظام ربوبیت میں انفرادی ملکیت باقی نہیں رہے گی، اگر اس میں کوئی شخص دولت جمع نہیں کر سکے گا، تو صدقہ و خیرات اور زکوٰۃ۔ یتیموں کی پرورش۔ قرابتداروں سے حسن سلوک۔ مسکینوں کی امداد۔ غریبوں کی مدارات حتیٰ کہ ترکہ و میراث سے متعلق تمام احکام منسوخ ہو جائیں گے حالانکہ ان احکام سے سارا قرآن بھرا پڑا ہے اور ان پر عمل پیرا ہونے کی سخت تاکید آئی ہے۔ ان احکام کی موجودگی اس کی دلیل ہے کہ قرآن انفرادی

ملکیت کو مٹانا نہیں چاہتا۔ وہ دولت جمع کرنے کی ممانعت نہیں کرتا۔

سوال واقعی بڑا اہم ہے اس لئے اسے اچھی طرح سے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

سب سے پہلے اس حقیقت کو پیش نظر رکھئے کہ قرآن نے اپنے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ پیش کی ہے کہ اگر یہ خدا کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف سے ہوتا تو اس کی تعلیم میں باہمی اختلاف ہوتا رہتا۔ اس لئے قرآن کی کلی تعلیم کو سمجھنے کے لئے اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ کوئی ایسا نقشہ، ایسا نظام، ایسا تصور زندگی جس میں قرآن کے احکام باہمدگر متخالف و متضاد دکھائی دیں، قرآن کی صحیح تعبیر کے مطابق نہیں ہو سکتا۔ قرآن کی وہی تعبیر صحیح ہوگی جس میں اس کے تمام احکام و اصول ایک دوسرے سے موافق ہوں۔

آپ شروع سے آخر تک سارا قرآن دیکھئے۔ اس میں دولت جمع کرنے کی سخت ممانعت آتی ہے۔ آپ پورے قرآن سے ایک آیت بھی ایسی نہیں پیش کر سکتے جس میں دولت جمع کرنے کا حکم یا اجازت ہو۔ اس کے بعد یہ سوچئے کہ یہ کہنا کہ کوئی شخص جتنی جی چاہے دولت جمع کر لے، لیکن اگر اس میں سے کچھ روپیہ بطور زکوٰۃ دیدے تو باقی جمع کردہ دولت حلال و طیب ہو جاتی ہے، قرآن کی منشاء کے مطابق قرار پا سکتا ہے؟ (جبکہ اس نے، جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، دولت جمع کرنے کی سخت مخالفت کی ہے!) دولت کے متعلق قرآن کے اس بنیادی تصور کی رُو سے یہ ماننا پڑے گا کہ زکوٰۃ کا یہ مفہوم قرآنی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ مفہوم اس بنیادی تصور کے خلاف جاتا ہے۔ اور قرآن کا دعوےٰ ہے کہ اس میں کوئی اختلاف اور تضاد نہیں۔ اس ایک مثال کے بعد آگے بڑھئے۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، قرآن نے نظام ربوبیت کے قیام کو پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھنے سے تشبیہ دی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ پہاڑ پر دوڑ کر نہیں چڑھا جاتا، آہستہ آہستہ قدم بقدم، ٹھہر ٹھہر اور رُک رُک کر بتدریج، چڑھا جاتا ہے۔ ہمیں کبھی بعض اوقات دم پھول جاتا ہے۔ معلوم نہیں انسان نے ذاتی ملکیت کا تصور کب سے پیدا کیا لیکن جب سے بھی پیدا کیا ہو آج ایسا دکھائی دیتا ہے گویا ذاتی ملکیت کا جذبہ "انسانی فطرت میں" داخل ہے۔ ہر شخص ایسا محسوس کرتا ہے کہ اگر اشیاء پر ذاتی ملکیت نہ رہنے دی جائے تو کوئی شخص برضا و رغبت کوئی کام نہیں کرے گا۔ محنت اور جی لگا کر کام کرنے کے تمام محرکات ختم ہو جائیں گے۔ صدقہ خیرات میں کوئی لذت نہیں رہے گی۔ اس لئے اس قسم کا نظام جس میں ذاتی املاک

نہیں، نہ صرف ناکام رہے گا بلکہ ناقابلِ عمل بھی ہوگا۔ جب صورت یہ ہو تو کسی سے یہ کہنا کہ وہ کل صبح اپنی تمام املاک ختم کردے (یا انہیں ختم کردیا جائے گا)، فی الواقعہ ایک ناقابلِ عمل طریق کار کو اختیار کرنا ہوگا۔ علاوہ بریں، انسان نے جو معاشرہ (انفرادی مفاد کی بنیادوں پر) قائم کر رکھا ہے اس میں ہر فرد یہ جانتا ہے کہ اس کا اور اس کے بال بچّوں کا زندہ رہنا اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ اس کے اپنے پاس کچھ ہو۔ وقت پڑنے پر کوئی کسی کا پُرسانِ حال نہیں ہوتا۔ وہی دولت کام آتی ہے جو اس کی ملکیت میں ہو۔ اس لئے ان حالات میں کسی سے یہ کہنا کہ کل صبح اپنا سب کچھ ہمارے حوالے کردو' ایک ناممکن مطالبہ ہے۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن افراد کو اس معاشرے سے اُس معاشرے تک آہستہ آہستہ لیجاتا ہے۔ ایک طرف اُن کی ذہنیت میں تبدیلی پیدا کرتا جاتا ہے اور دوسری طرف نئے نظام کے مطابق ایسے حالات پیدا کرتا جاتا ہے جن میں انسان کو اطمینان ہوتا جاتا ہے کہ اگر میں نے یہ کچھ دیدیا تو اس سے بھوکا نہیں مروں گا۔ وہ اس طرح بتدریج' قدم بقدم' اس معاشرے کو اس نئے معاشرے میں تبدیل کرنے کی صورت پیدا کرتا ہے۔ صدقہ دخیرات بیع وشری، لین دین، ترکہ ومیراث وغیرہ کے تمام احکام اس عبوری دور (Transitional Period) سے متعلق ہیں۔ جوں جوں حالات بدلتے جاتے ہیں، عبوری دور کے یہ احکام پیچھے رہتے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ احکام، حالات سے مشروط ہوتے ہیں۔ مثلاً قرآن میں زنا کی سزا مقرر ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایسے معاشرتی حالات پیدا کرنا چاہتا ہے جس میں زنا کے امکانات کم ہوتے ہوتے بالکل معدوم ہوجائیں اور ایک ایسا وقت آجائے کہ کوئی شخص زنا کا مرتکب ہی نہ ہو۔ اب ظاہر ہے کہ اس وقت زنا کی سزا کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ یہ حکم موجود تو رہے گا لیکن نافذ العمل نہیں ہوگا۔ یا مثلاً قرآن میں ہے کہ قسم توڑنے کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا یا ایک غلام آزاد کرنا ہے (۵/۸۹) یہ واضح ہے کہ قرآن نے آئندہ کے لئے غلامی کو بند کردیا تھا لیکن جو غلام اس وقت معاشرے میں موجود تھے اُن کے متعلق مختلف احکامات دیدیئے تھے جن سے وہ رفتہ رفتہ معاشرہ میں جذب ہوجائیں۔ اب ظاہر ہے کہ جسوقت وہ غلام معاشرے میں جذب ہوجائیں اور کوئی نیا غلام بنایا نہ جاسکے تو غلامی کا وجود ختم ہوجائیگا۔ اسوقت یہ حکم کہ "کفارہ میں غلام کو آزاد کرو" نافذ العمل نہیں رہے گا۔ اسی طرح اگر کوئی معاشرہ ایسا مرفہ الحال ہوجائے کہ اس میں بھوکوں اور مسکینوں کا وجود ہی باقی نہ رہے سب کھاتے پیتے ہوں، تو یہ حکم بھی ساقط العمل ہوجائے گا کہ دس مسکینوں کو کھانا کھلاؤ۔ اُس وقت اسلامی نظام فیصلہ کرے گا کہ اس کے بدلے میں کفارہ کے لئے کیا کرنا چاہیئے۔ خود ہماری تاریخ میں ہے کہ حضرت عثمانؓ کے زمانے

میں لوگ "زکوٰۃ" کا روپیہ جھولیوں میں لئے لئے پھرتے تھے اور کوئی لینے والا نہیں ملتا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ ایسے معاشرہ میں صدقہ وخیرات کے تمام احکام ساقط العمل رہ جائیں گے۔ یا مثلاً اگر کوئی حکومت ایسا انتظام کردے کہ ہر ضرورتمند کو حکومت کی طرف سے قرضہ مل جائے تو پرائیویٹ لین دین کے معاملات ختم ہو جائیں گے اور ان سے متعلقہ احکام بھی جاری نہ رہیں گے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص ترکہ چھوڑ کر نہ مرے تو اس پر وراثت سے متعلق احکام نافذ ہی نہیں ہوں گے۔ ان مثالوں سے آپ نے دیکھ لیا کہ احکام ہمیشہ حالات سے مشروط ہوتے ہیں۔ اگر حالات ایسے پیدا ہو جائیں جن میں ضرورت باقی نہ رہے تو یہ احکام نافذ العمل نہیں رہیں گے۔ یاد رکھئے، اس وقت بھی یہ احکام منسوخ (Abrogate) نہیں ہوں گے۔ صرف ساقط العمل (Inoperative) ہو جائیں گے۔ اگر کسی وقت پھر وہی حالات پیدا ہو جائیں، تو پھر وہی حکم نافذ العمل ہو جائے گا۔ (جس طرح، پانی نہ ملنے کی صورت میں وضو کا حکم ساقط العمل اور تیمم کا حکم نافذ العمل ہو جاتا ہے۔ اور جب پانی مل جائے تو پھر وضو کا حکم نافذ ہو جاتا ہے اور اگر ایسا انتظام ہو جائے کہ ملک میں ہر جگہ پانی دستیاب ہو تو پھر تیمم سے متعلق حکم بالکل معطل ہو جائے گا)

ہم نے دیکھا ہے کہ قرآن کی رُو سے

(i) تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری نظام کے سر ہوتی ہے۔ (اس کی عملی شکل کیا ہوگی اس کا فیصلہ وہ نظام کرے گا)

(ii) عفو، یعنی ضرورت سے زائد، فردِ متعلقہ کی ملکیت نہیں ہو سکتا۔ اسے ربوبیتِ عامہ کے لئے کھلا رہنا چاہیئے۔ (یہ الگ بات ہے کہ اسلامی نظام ان زوائد کو فرد کی تحویل میں رہنے دے اور صرف عند الضرورت انہیں طلب کرے یا ساتھ کے ساتھ ہی اپنی تحویل میں لیتا جائے۔)

(iii) "ذاتی ملکیت" اگر ہو سکتی ہے تو روزمرہ کی عام مستعملہ اشیاء میں ہو سکتی ہے۔ لیکن کسی فرد کو اس کی ضرورت ہی نہ ہوگی کہ وہ ان اشیاء کو فروخت کرے۔ اس لئے عملاً "ملکیت" استعمال تک محدود رہ جائے گی۔ یہی اشیاء بطور ترکہ آگے منتقل ہو سکتی ہیں۔ اگرچہ اس کی اولاد اس ترکہ کی بھی محتاج نہ ہوگی کیونکہ اس کی تمام ضروریات معاشرہ خود پوری کر رہا ہوگا۔

ان حالات میں آپ خود سوچ لیجئے کہ ایسے معاشرے میں صدقہ وخیرات، بیع وشریٰ، اور وصیت وراثت[1] کے

---

[1] (فٹ نوٹ صفحہ ۲۳۰ پر دیکھئے)

احکام کی ضرورت کہاں پیش آئے گی۔ یہ سب احکام عبوری دور میں ساتھ چلیں گے اور جوں جوں معاشرہ، نظام ربوبیت

(فٹ نوٹ نمبر ۵ صفحہ ۲۲۹) وراثت کے متعلق تو قرآن نے بالتصریح فرمایا ہے کہ بلا محنت و مشقت کئے، محض باپ کے ترکہ سے دولتمند بن جانا، سرمایہ پرستی کی بنیاد ہے۔ چنانچہ وہ سورۃ الفجر میں واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ مفاد پرستوں کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ۸۹/۱۹) وہ میراث کے مال کو سمیٹ کر کھا جاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کی رو سے میراث کے احکام اس عبوری دور سے متعلق ہیں جس میں ہنوز اس کا نظام ربوبیت قائم نہ ہوا ہو۔ نہ کہ مستقل معاشی قدر۔ جس چیز کو وہ مفاد پرستوں کا مسلک قرار دے کر اس بری طرح لتاڑتا ہے، اسے وہ کس طرح ربانیون کا مسلک قرار دے سکتا ہے؟ ویسے بھی آپ غور کیجئے۔ ہم ہمیشہ فخر سے بیان کرتے ہیں (اور یہ چیز ہے بھی قابل فخر) کہ اسلامی تعلیم کی بنیاد انسانی مساوات پر ہے۔ وہ پیدائشی تفوق کو قطعاً روا نہیں رکھتا۔ اس کے ہاں برہمن کے بیٹے اور شودر کے بچے میں کوئی فرق نہیں۔ اس کی بارگاہ میں محمودؔ اور ایازؔ ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔ اس لئے اس میں ذات پات کی کوئی تمیز نہیں۔ یہاں تک تو ہم بیان کرتے ہیں۔ لیکن پیدائش کا وہ فرق جس کی بنا پر زندگی کے ہر شعبے میں مستقل فرق اور امتیاز پیدا ہوتا ہے، ہمارے ہاں بالکل جائز اور درست (بلکہ ضروری) قرار دیا جاتا ہے۔ یعنی ہم یہ تو کہتے ہیں کہ سید کے بیٹے کو یہ حق نہیں کہ وہ محض سید کے گھر میں پیدا ہو جانے سے سوسائٹی میں مستحقِ فضیلت سمجھا جائے، لیکن ہم کبھی نہیں سوچتے کہ ایک کروڑپتی کے گھر میں پیدا ہونے والا بچہ، محض اس کے گھر میں پیدا ہونے کی وجہ سے، پیدائشی کروڑپتی ہو جاتا ہے۔ اور پھر اس دولت کی بنا پر (جس کے حصول میں اس کی محنت کو کوئی دخل نہیں ہوتا) سوسائٹی کے بڑے سے بڑے امتیازات خرید لیتا ہے۔ اگر اسلام کا اصول یہ ہے کہ پیدائش کا حادثہ (Incident Of Birth) کسی امتیاز و تفوق کا موجب نہیں بن سکتا تو وہ اسے کس طرح روا رکھ سکتا ہے کہ امیر کے گھر میں پیدا ہونے والا بچہ محض پیدائش کی رُو سے ایسے امتیازات کا مالک بن جائے جو دولت کا لازمی نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ احکام اس وقت تک کے لئے ہیں جب تک صحیح قرآنی نظام وجود میں نہیں آتا۔ جب یہ نظام قائم ہو جائے گا تو اس وقت وہی مسلک ہوگا جس کی طرف نبی اکرمؐ نے یہ کہہ کر اشارہ فرما دیا نحن معشر الانبیاء لا نورث، انبیاء کا گروہ وراثت نہیں چھوڑا کرتا اور یہ ظاہر ہے کہ جو چیز انبیاء کے لئے جائز نہ ہوگی وہ مومنین کے لئے کس طرح جائز ہوگی۔ مومنین تو انبیاء ہی کے متبع ہوتے ہیں۔ یہ چیز قرآنی نظام ربوبیت میں ممکن العمل ہو جائے گی۔

سے قریب ہوتا جائے گا یہ احکام پیچھے کھسکتے چلے جائیں گے۔ تا آنکہ یہ نظام اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ جلوہ بار ہو جائے۔ اس وقت "یہ زمین بدل جائے گی، یہ آسمان بدل جائے گا" (یوم تبدل الارض غیر الارض والسموٰت - ۱۴/۴۸) اور انسانی معاشرہ کی موجودہ اقدار کی جگہ اور اقدار لے لیں گی۔ اس لئے کہ اس وقت تمام نوعِ انسانی (ذاتی مفاد کے پیچھے بھاگنے کی بجائے) خدا کی ربوبیتِ عامہ کے قیام کے لئے اُٹھ کھڑی ہوگی۔ یَوۡمَ یَقُوۡمُ النَّاسُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ (۶/۸۳)

باب دہم

پس چہ باید کرد؟

جیسا کہ گذشتہ باب میں لکھا جاچکا ہے، نبی اکرمؐ نے اپنے جاں نثار رفقائے کار کی معیت میں تیئس برس کی مسلسل تگ و تاز سے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق، قرآن کے اس نظام کو متشکل فرما دیا جسے اس نے انسانی معاشرہ کا منتہیٰ قرار دیا ہے۔ لیکن بعد کے مسلمانوں نے اس پروگرام کو پس پشت ڈال دیا اور انفرادی مفاد پرستی کے اسی نظامِ کہن کو پھر سے مسلط کر دیا جسے یہ خود ہی کچھ عرصہ پہلے (عہد رسالتمآب میں) توڑ چکے تھے۔ بعد کے مسلمان

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست
خود سرِ تختِ ملوکیت نشست

اس انفرادی مفاد پرستی کا وہی نتیجہ نکلا جس کی بابت قرآن نے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ یعنی بھوک اور خوف کا عذاب۔ ذلت اور رسوائی کی لعنت۔ عقلِ بے باک کی فرماں روائی۔ مفاد کا باہمی تصادم۔ اور اس تصادم سے حسد، بغض، منافرت، عداوت کے جذبات کی برانگیختگی۔ یہ ہے وہ جہنم جس میں مسلمان صدیوں سے خود بھی مبتلا چلا آرہا ہے اور (اس کی وجہ سے) باقی دنیا بھی مبتلائے عذاب ہے۔ "اس کی وجہ سے"، اس لئے کہ اگر یہ اس پروگرام کو آگے بڑھاتا جو قرآن نے تجویز کیا تھا تو وہ پھیلتے پھیلتے پوری نوعِ انسانی کو محیط ہو جاتا اور اس طرح دنیا اس عذاب سے بچ جاتی جس میں وہ آج اس طرح

ماخوذ ہے۔

یہ تبدیلی کس طرح سے ہوئی اور وہ کون کون سی قوتیں تھیں جنہوں نے اس نظام کی جگہ پھر سے وہی پہلا نظام مسلط کردیا، ایک تفصیل طلب تاریخی بحث ہے جس میں ہم جانا نہیں چاہتے (کیونکہ یہ ہمارے موضوع پیش نظر سے خارج ہے)۔ قرآن نے اس ساری سرگذشت کو سورۂ اعراف کی چند آیات میں سموکر رکھ دیا ہے جہاں کہا کہ (وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا ۔ ۷/۱۷۵)۔ انہیں اس شخص کی سرگذشت سناؤ جسے ہم نے اپنا ضابطہ قانون دیا۔ اس نے اس پر عمل کیا اور اس کے زندہ نتائج اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ لئے۔ لیکن

مسلمانوں کی سرگذشت

اس کے بعد (فَانْسَلَخَ مِنْهَا) وہ اس نظام سے اس طرح نکل کر الگ ہوگیا جس طرح کسی جانور کی کھال کھینچ لی جائے اور اس کے گوشت پر اس کا نشان تک بھی دکھائی نہ دے۔ اس قوم نے اس طرح قرآن کو چھوڑا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ (فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ۔ ۷/۱۷۵) شیطان نے اسے جھٹ سے آن دبوچا۔ وہ تو اس تاک میں بیٹھا تھا کہ کب نظام قرآنی کے محفوظ قلعے سے نکلے اور میں اسے دبوچ لوں۔ شیطان نے کیا دبوچنا تھا، یہ قرآن چھوڑنے کا فطری نتیجہ تھا!

مگر کوتاہی ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

قرآن کہتا ہے کہ اگر یہ مشیت کے قانون کے مطابق زندگی بسر کئے جاتے، تو ہم انہیں آسمان کی بلندیوں تک لیجاتے۔ (وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا ۷/۱۷۶) لیکن یہ معاشی مفاد پرستیوں کے ساتھ چپک گئے اور اپنے خود ساختہ نظام کی اتباع کرنے لگ گئے (وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۷/۱۷۶) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انفرادی مفاد کی لامتناہی ہوس نے ان میں جوع الکلب کی سی کیفیت پیدا کردی کہ اسے کھلاؤ یا دھتکارو، ہر حال میں اس کی زبان باہر نکلی رہتی ہے (فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۔ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ۷/۱۷۶) یہ کیفیت ہر اس قوم کی ہوجاتی ہے جو ہمارے ضابطۂ قانون ربوبیت کو جھٹلائے۔ لہٰذا تم اس قوم کی کہانی اپنے دور کے مخاطبین کو سناؤ تاکہ وہ غور وفکر کریں کہ ہمیں کیا ہوگیا (فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۷/۱۷۶) ان سے کہو کہ تم سوچو کہ کس قدر بُری حالت ہوتی ہے اس قوم کی جو خدا کے ضابطہ کی تکذیب کرے اور کس قدر کمی واقع ہوجاتی ہے

ان کے غش کی ربوبیت میں سَآءَ مَثَلًا الْقَوْمُ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَ اَنْفُسَهُمْ كَانُوْا یَظْلِمُوْنَ (۷/۱۷۷)

ل؎ اس مقام پر ایک ایسے شبہ کا ازالہ بھی ضروری سمجھا جاتا ہے جو اکثر ذہنوں کو پریشان کئے رکھتا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اگر یہ نظام انسانی زندگی کے تقاضوں کو اس حسن و خوبی سے پورا کرنے والا (اس لئے "انسانی فطرت" کے عین مطابق) تھا تو پھر یہ مسلسل آگے کیوں نہ بڑھتا گیا، تھوڑے سے عرصے کے بعد ختم کیوں ہو گیا۔ میں نے اس سوال کا جواب اپنی متعدد تحریروں میں دیا ہے۔ لیکن ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم ایک نکتہ کا اعادہ یہاں بھی کر دیا جائے۔ قرآن کی تعلیم سے مترشح ہے کہ قرآن سے پہلے ذہن انسانی کے بچپن کا زمانہ تھا اس لئے اس دور میں زندگی کے اصول شعوری طور پر سمجھ میں نہیں آسکتے تھے۔ لیکن قرآن تاریخ کے اس دور میں نازل ہوا جب ذہن انسانی اپنے عہد طفولیت کے بعد، عالم شباب (یا سن شعور) میں قدم رکھ رہا تھا۔ لہٰذا اب وہ زمانہ آرہا تھا کہ جذبات کی بجائے، انسان کے عقل و شعور سے اپیل کی جاتی۔ چنانچہ قرآن کی ساری اپیل عقل و شعور اور فکر و تدبر سے ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ جس زمانہ (چھٹی صدی عیسوی) میں قرآن نازل ہوا ہے، ذہن انسانی اپنی پختگی تک نہیں پہنچ چکا تھا۔ اس نے فقط اپنے عہد طفولیت کو چھوڑا تھا۔ اب اسے رفتہ رفتہ، پختگی تک پہنچنا تھا۔ نبی اکرمؐ نے اپنی فقید المثال تعلیم اور سیرت سے قرآنی اصولوں کو معاشرہ میں نافذ العمل کر کے دکھا دیا (تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ اصول ناممکن العمل نہیں ہیں) لیکن اس زمانہ کی دنیا ہنوز ذہنی طور پر تو اس سطح پر نہیں آچکی تھی کہ وہ ان اصولوں کو (یا اُن کی بنیادوں پر قائم کردہ معاشرہ کو) شعوری طور پر اپنا سکے۔ یہ چیزیں ابھی اس کے شعور میں سما ہی نہیں سکتی تھیں۔ اگر مسلمان ایسے اسی "ایمان بالغیب" کے انداز سے جس سے یہ معاشرہ قائم ہوا تھا آگے چلاتے رہتے تو یہ آگے بڑھتا رہتا۔ لیکن انہوں نے اس طریق کو چھوڑ دیا اور شعوری طور پر دنیا ہنوز اس قابل نہ تھی کہ اسے اختیار کر سکتی۔ اس لئے یہ نظام ختم ہو گیا۔ اب آہستہ آہستہ ذہن انسانی، قرآنی اصولوں کو شعوری طور پر قبول کر رہا ہے (کتنی ہی باتوں کو وہ قبول کر چکا ہے۔ جو باقی ہیں انہیں بھی رفتہ رفتہ قبول کرلے گا۔ جب اس نے اس نظام کو بھی شعوری طور پر سمجھ لیا اور قبول کر لیا تو پھر وہ اس سے پیچھے نہیں ہٹے گا۔ کیونکہ انسانی فکر میں ارتقاء ہے، رجعت نہیں۔ لہٰذا زمانہ قریب آرہا ہے کہ قرآن کے اس نظام ربوبیت کو شعوری طور پر اپنا لے۔ دیر یہی ہے کہ اسے دنیا کی صاحب فکر قوموں تک پہنچا دیا جائے۔

قرآن نے قوموں کے استخلاف و استبدال (succession and Substitution) کے جو قوانین بیان کئے ہیں ان پر غور کیجئے۔ حقائق و بصر کی ایک عجیب دنیا آپ کے سامنے آجائے گی۔ ان قوانین کی تفاصیل طول طویل ہیں۔ لیکن اس نے ان قوانین کے اصل الاصول کو سورۂ محمد کی آخری آیت میں نہایت حسن و ایجاز سے سمٹا کر بیان کر دیا ہے۔ جہاں فرمایا کہ هَاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (۴۷/۳۸) تم وہ ہو جنہیں یہ دعوت دی گئی تھی کہ تم نوعِ انسانی کے مفادِ کلی کے لئے سب کچھ کھلا رکھو۔ لیکن تم نے اس کی جگہ "سمیٹنے اور جمع کرنے" کا شیوہ اختیار کر لیا (فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ) لیکن اس سے تم نے خود اپنا ہی نقصان کیا تم نے مال و دولت کو روکا تو تمہاری اپنی ذات کی نشو و نما رک گئی (وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ) اللہ کو تمہاری دولت کی ضرورت نہ تھی۔ تمہیں اس کے نظام کے محتاج تھے (وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ) بہر حال اسے اچھی طرح سمجھ لو کہ اگر تم نے اس نظام سے روگردانی کی تو وہ تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو لے آئے گا۔ اور وہ پھر تمہاری جیسی نہیں ہوگی (۴۷/۳۸)۔ اس نے کہہ دیا کہ تمہیں اقوامِ عالم پر جس قدر افضلیت نصیب ہوئی ہے وہ صرف اس نظام کی وجہ سے ہے جو تم نے ربوبیتِ عامہ کے لئے قائم کیا ہے۔ اگر تم اس کی جگہ پھر اسی مفاد پرستی کے نظامِ کہن کو لے آؤ گے تو یہ امتیازات و تفوقات سب چھن جائیں گے۔ چنانچہ مسلمانوں سے یہی ہوا۔ یاد رکھئے کہ قوموں کی ہلاکت و بربادی کی یہی شکل نہیں ہوتی کہ وہ قوم طبعی طور پر فنا کر دی جائے اور صفحۂ ارض پر اس قوم کا کوئی ایک فرد بھی باقی نہ رہے۔ تباہی کی بدترین شکل یہ ہے کہ وہ قوم طبعی طور پر تو زندہ رہے لیکن اس کا شمار زندہ قوموں میں نہ ہو۔ یہی وہ عذاب ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى (۸۷/۱۳) کہ جہنم میں نہ انہیں موت آئے گی اور نہ ہی زندگی نصیب ہوگی۔ غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ مسلمان صدیوں سے اسی جہنم کے عذاب میں مبتلا چلا آرہا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ قوم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قعرِ مذلت میں گر گئی، یا اس کی باز آفرینی کی کوئی صورت بھی ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ اس کا امکان ہے۔ لیکن اس کی صورت وہی ہے۔

وہی دیرینہ بیماری، وہی نامحکمی دل کی!
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی!

سرگزشت آدم اگر یہ پھر خدا کے ضابطہ کو اپنا راہنما بنالیں، تو پھر وہی فراوانیاں حاصل ہو جائیں گی اور اگر اس سے بدستور روگرداں رہے تو یہی حالت رہے گی (مَن يَهْدِ اللهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِي وَمَن يُضْلِلْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ۷/۱۷۸) اس کے لئے قرآن میں بیان کردہ قصۂ آدم کو پھر سے سامنے لائیے۔ قرآن کہتا ہے کہ آدم جنت میں تھا جہاں اسے کھانے پینے، رہنے سہنے کے متعلق کسی قسم کی پریشانی نہ تھی رزق کی کشائش اور سامانِ زیست کی فراوانی تھی۔ یہ اس لئے تھا کہ معاشی پریشانیاں اس مقصد عظیم کی راہ میں حائل نہ ہوں جس کے لئے اسے پیدا کیا گیا تھا۔

آدم ابلیس[1] کے چکمے میں آگیا۔ فرزندانِ آدم میں سے ہر ایک اپنی اپنی فکر میں لگ گیا۔ وہ ایک دوسرے سے دور دور ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ یہ بُعد حسد اور کینے، بغض اور عداوت میں تبدیل ہو گیا۔ رزق کی کشائش، تنگی میں بدل گئی۔ آدم بھوک، برہنگی، بے سروسامانی، خوف و ہراس کے عذاب میں مبتلا ہو گیا۔ اس طرح آدم جنت سے نکل گیا۔ اب اس کی ساری توانائیاں محض روٹی حاصل کرنے اور اولاد پالنے کی فکر میں ضائع ہو گئیں زندگی کا وہ بلند مقصد جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا تھا اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

آدمؑ مایوس ہو گیا۔ اس کی فضائے حیات میں امید کی کوئی کرن باقی نہ رہی۔ وہ بے حد غمگین اور اداس رہنے لگا۔ وہ اپنی زندگی سے بیزار ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ کیا کرے؟

لیکن اس سے خدا نے کہا کہ مایوس اور غمگین ہونے کی کوئی بات نہیں۔ تمہارا جرم ایسا نہیں، جس کی تلافی نہ ہو سکے۔ تم ہمارے بتائے ہوئے راستے پر چل نکلو، سیدھے جنت میں پہنچ جاؤ گے اس کے بعد تم جنت سے نکالے نہیں جاؤ گے۔ اس لئے کہ یہ جنت تمہیں کافی تجربے کے بعد ملے گی۔ یہ تمہارے خونِ جگر سے تعمیر ہو گی۔ یہ تمہارے کاموں کا نتیجہ ہو گی (وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ۔ لَكُمْ فِيهَا فَاكِهَةٌ كَثِيرَةٌ مِّنْهَا تَأْكُلُونَ ۴۳/۷۲-۷۳) یہ وہ جنت ہے جس کے تم اپنے اعمال کے عوض میں مالک بنائے گئے ہو۔ اس میں تمہارے لئے سامانِ زیست کی فراوانیاں ہیں۔

---

[1] ابلیس، ابلاس سے ہے جس کے معنی ہی مایوسی اور ناامیدی ہے۔

یہ ہے آدم کا تمثیلی قصہ از روئے قرآن ۔ اور یہی ہے امتِ مرحومہ کی سرگذشت! عہدِ رسالتمآبؐ میں (جب قرآنی پروگرام سامنے تھا) مسلمان اس جنت میں تھا جس میں "دودھ کی نہریں بہتی تھیں اور شہد کے حوض بھرے تھے"۔ اسے ہر قسم کی فراوانیاں حاصل تھیں (اِنَّآ اَعْطَیْنٰكَ الْكَوْثَرَ) اس کے بعد یہ "ابنِ آدم" اس جنت سے نکل گیا اور اس پر چاروں طرف سے مایوسی چھا گئی ۔ یہ مایوسی آج اپنی انتہا تک پہنچ چکی ہے ۔ اس عذاب سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور یہ طریقہ وہی ہے جو آدم کو بتایا گیا تھا ۔ یعنی (فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۲/۳۸) جس نے قرآنی پروگرام کو اپنا ضابطۂ حیات بنالیا اس کے لئے کوئی خوف و حزن نہیں ہوگا ۔ قرآن کا پروگرام اس کے سوا کیا ہے کہ

با مسلماں گفت جاں بر کف بنہ
ہر چہ از حاجت فزوں داری بدہ

لیکن اصل سوال یہ سامنے آتا ہے کہ جس حالت سے ہم آج گزر رہے ہیں، اس میں آغازِ کار کیسے ہو وبات شروع کہاں سے کی جائے؟ اس نظام کی خشتِ اولیں کون رکھے، اس کی ابتدا کیسے ہو؟ یہ ہے وہ سوال جو ان قلوب کو وقفِ اضطراب رکھتا ہے، جنہوں نے سمجھ لیا ہے کہ کرنے کا کام یہی ہے کہ اس نظام کو دوبارہ متشکل کیا جائے ۔ ان کی گاڑی یہیں آکر رُک جاتی ہے ۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس سوال کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے ۔

ذرا تصور میں لائیے اس منظر کو کہ قحط سالی کا زمانہ ہے غلہ کمیاب ہے ۔ اوپر سے نئی فصل بونے کا زمانہ آگیا ہے ۔ دو کسان ایک دوسرے کی ہمسائیگی میں رہتے ہیں ۔ ان میں سے ہر ایک کے پاس ایک ایک من گیہوں ہے ۔ ایک کسان اٹھتا ہے اور اپنا گیہوں پسوا کر لے آتا ہے ۔ دو ہی گھنٹے بعد اس کے ہاں سفید گیہوں کی نہایت عمدہ روٹیاں پکنی شروع ہو جاتی ہیں جنہیں وہ بھی خوش ہو کر کھاتا ہے اور اس کے بچے بھی[1]۔

لیکن دوسرا کسان اپنا گیہوں سر پر اٹھا کر باہر لیجاتا ہے اور اس کھیت میں ڈال آتا ہے جو اس نے آیندہ

---

[1] میں نے اس مثال کو اپنی کتاب "اسباب زوالِ امت" میں بھی بیان کیا ہے ۔

فصل کے لئے تیار کر رکھا ہے۔ اس کے گھر میں گیہوں کی روٹیاں نہیں پکتیں۔ اسے اور اس کے بچوں کو اکثر اوقات باجرہ اور مکئی پر گزارہ کرنا پڑتا ہے۔ اور بعض اوقات فاقے تک کی بھی نوبت آجاتی ہے۔ لیکن وہ اس عسرت کو برداشت کرتا ہے۔ ہر صبح اٹھ کر، اپنے کھیت میں چلا جاتا ہے۔ دن بھر محنت کرتا ہے۔ چھ سات مہینے مسلسل، کڑکڑاتے جاڑے اور چلچلاتی دھوپ میں اپنا لہو پانی ایک کر دیتا ہے۔ اس کے بعد اس کی کھیتی پکتی ہے اور اس کا سارا گھر غلہ سے بھر جاتا ہے۔ اب اسی غلہ میں سے یہ اور اس کے بچے سال بھر تک مزے سے کھاتے ہیں۔ اور آئندہ فصل کے لئے بیج بھی رکھ لیتے ہیں۔ اب اس سلسلہ کا ایک دور (cycle) بندھ جاتا ہے۔

پہلے کسان نے اپنی نگاہ، قریبی مفاد (Immediate Gain) پر رکھی۔ اس نے چار دن عیش[1] کر لئے۔ اس کا حال (Present) خوشگوار ہو گیا۔ لیکن مستقبل (Future) میں اس کا کوئی حصہ نہ رہا (مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۔ ۲/۱۰۲)

دوسرے کسان نے اپنی نگاہ "مستقبل" پر رکھی۔ شروع شروع میں اسے تکلیف تو ضرور ہوئی لیکن اس کے بعد اس کا حال بھی خوشگوار ہو گیا اور مستقبل بھی درخشندہ۔ (فی الدنیا حسنة وفی الآخرة حسنة)

لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کون سی چیز تھی جس کی بنا پر اس دوسرے کسان نے مفادِ عاجلہ سے صرفِ نظر کر کے، اتنی جانکاہ مشقتوں کو مول لیا، فاقے جھیلے، مصیبتیں برداشت کیں، اس قدر محنت کی، حالانکہ دوسرے کسان کی مثال اس کے سامنے تھی کہ دو گھنٹے میں اس کے گھر عمدہ عمدہ روٹیاں پکنی شروع ہو گئی تھیں۔ اس سوال کا جواب ظاہر ہے۔ اس کسان کو یقین تھا کہ جو دانہ آج مٹی میں ملایا جا رہا ہے، اس سے سات سات سو دانے نکلیں گے۔ مستقبل کا یہی یقین تھا جس کی بنا پر اس نے مفادِ عاجلہ کو چھوڑا اور اس قدر مصائب اور تکالیف برداشت کیں۔ اگر اسے اس امر کا یقین نہ ہوتا کہ اس پروگرام سے ایسے درخشندہ نتائج مرتب ہوں گے تو وہ کبھی اپنی متاعِ عزیز (گیہوں) کو اس طرح مٹی میں نہ ملا دیتا۔ مستقبل کے ان دیکھے

ایمان بالغیب

نتائج پر اس طرح کا محکم یقین "ایمان بالغیب" کہلاتا ہے۔ لہٰذا یہ کسان کا ایمان بالغیب ہے جو اسے مفادِ عاجلہ کی جاذبیت میں کھو جانے سے باز رکھتا ہے اور اتنا عرصہ محنت اور مشقت کی زندگی بسر کرنے پر آمادہ کر دیتا ہے۔

---

[1] عیش کے معنی عربی زبان میں روٹی کے ہیں۔ یہیں سے معاش لفظ بنا ہے۔

لیکن اس کسان کی مثال میں پھر بھی یہ شکل تھی کہ اس نے خود بھی اس سے پیشتر کئی بار اس قسم کا تجربہ کیا تھا، اور اسی طرح بار بار دوسروں کی کھیتی کو اُگتے بھی دیکھا تھا۔ اس لئے اس کا یہ ایمان، درحقیقت ایمان بالغیب (ان دیکھے نتائج پر ایمان) نہ تھا۔ اس کا ایمان سنۃ اللہ (خدا کے غیر متبدل قوانین) پر تھا اس حقیقت پر ایمان کہ کائنات کا یہ قانون اٹل ہے کہ اگر زمین کو ایک خاص طریق پر تیار کیا جائے، پھر اس میں بیج ڈالا جائے اور اس کے بعد ایک خاص انداز سے اس کی دیکھ بھال کی جائے، تو یہی دانہ فصل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

لیکن ذرا سوچئے کہ اگر کسی شخص نے نہ تو پہلے ایسا تجربہ کیا ہو اور نہ ہی اس نے کسی اور کی کھیتی کو اُگتے دیکھا ہو۔ اور اس سے ایک شخص آکر کہے کہ اپنے غلے کو باہر لیجا کر مٹی میں ملا آؤ۔ اس سے کھلیان تیار ہو جائے گا، تو اس تجویز پر عمل پیرا ہونے کے لئے کسان کو بڑے محکم یقین کی ضرورت ہوگی۔ پہلے تو اس کا اپنا دل اس پر آمادہ نہیں ہوگا۔ اگر وہ کسی نہ کسی طرح آمادہ ہو بھی جائے گا تو دوسرے لوگ اسے "پاگل" قرار دے کر اس کا مذاق اڑائیں گے۔ یہ چیز بھی اس کے دل میں تذبذب پیدا کر دے گی۔ وہ اس سے کہیں گے کہ تیری مت ماری گئی۔ تم نے اس سے پہلے کبھی دیکھا سنا کہ اچھے بھلے اناج کو مٹی میں ملا دیا جائے تو اس سے غلے کا ڈھیر برآمد ہو جائے۔ اگر وہ ان حوصلہ شکن اور شکوک انگیز باتوں کو بھی برداشت کر لے گا تو تخم ریزی اور فصل کی تیاری کا درمیانی عرصہ بڑے بیم و رجا میں گزرے گا۔ کسی دن ذرا تیز ہوا چلی اور وہ گھبرایا۔ کہیں زور کا مینہ برسا اور وہ ڈرا۔ غرضیکہ اسے قدم قدم پر ڈرانے اور بہکانے والے چھلاوے دکھائی دیں گے۔ اگر وہ ان تمام صبر آزما اور ہمت شکن مراحل سے بخیر و خوبی گزر گیا تب کہیں جا کر اسے یقین آئے گا کہ ایک دانہ واقعی کھلیان پیدا کر دیتا ہے!

ابتدا کرنیوالے

اس مثال سے آپ اس جماعت کا اندازہ لگایئے جو نظامِ ربوبیت کے قیام کے لئے سب سے پہلی بار اٹھتی ہے۔ جو تصور اُن کے سامنے پیش کیا جاتا ہے وہ دنیا جہان سے نرالا ہوتا ہے جو پروگرام ان کے لئے وضع کیا جاتا ہے، وہ زمانہ کی عام روش سے یکسر الگ ہوتا ہے۔ زمانے کا معمول یہ چلا آرہا ہے کہ ہر شخص "لینے" کی فکر کرے۔ اسی میں اس کی حفاظت ہے۔ یہی اس کی اپنی عقل کا تقاضا ہوتا ہے اور یہی سارے زمانے کی روش۔ اسی روش اور معمول کا "زندہ نتیجہ" ہر شخص کے سامنے ہوتا ہے (اس کسان کی طرح جو اپنا غلہ پسوا کر روٹیاں پکانے لگ جاتا ہے)۔ اس کے برعکس ان سے کہا جاتا ہے کہ زندگی کے تحفظ کا راز "لینے" میں نہیں

"دینے" میں ہے نہ "لینے" کا فائدہ (مفاد عاجلہ) بالکل سامنے ہوتا ہے۔ لیکن "دینے" کا فائدہ، نگاہوں سے یکسر اوجھل ہوتا ہے۔ اس جماعت کو اس "نئے" پروگرام پر آمادہ کرنے کے لئے صرف ایک ہی قوت کارفرما ہو سکتی ہے یعنی اس امر پر یقینِ محکم کہ زندگی کا یہی نظریہ صحیح ہے اور یہ پروگرام زندہ اور پائندہ نتائج برآمد کر کے رہے گا۔ یہ کبھی ناکام نہیں رہے گا اس کا نام ہے ایمان بالغیب۔ یعنی اس پروگرام کے ان دیکھے نتائج پر محکم یقین۔ غیر متزلزل یقین۔ قرآن، السابقون الاوّلون (Pioneers) کی اس جماعت کے لئے، اسی ایمان بالغیب کو سنگِ بنیاد قرار دیتا ہے۔ بعد میں آنے والے تو اس پروگرام کے حسین نتائج کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں لیکن السابقون الاوّلون (۹/۱۰۰) کی یہ جماعت صرف اس کے ان دیکھے نتائج پر ایمان رکھنے سے اس پر عمل پیرا ہو سکتی ہے۔ برٹرنڈرسل کے نزدیک "مہذب اور وحشی میں فرق یہ ہے کہ مہذب انسان مستقبل کے حظائظ کے لئے امروز کے آلام برداشت کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ خواہ مستقبل دور ہی کیوں نہ ہو"۔

(A History of western Philosophy)

قرآن کا پہلا ورق

قرآنِ کریم کا پہلا ورق اُلٹیے۔ اس کی ابتدا، اسی نظامِ ربوبیت کے تعارف سے ہوتی ہے (الحمد للہ رب العالمین زندگی کا وہی نقشہ ستائش کے قابل ہے جو قانونِ خداوندی کے مطابق، تمام نوعِ انسانی کی ربوبیت کا ضامن ہو) اس تعارف کے بعد اس جماعت کا ذکر سامنے آتا ہے، جس نے پہلی بار، اس پروگرام کو عمل میں لانا ہوتا ہے۔ اس ضمن میں کہا جاتا ہے کہ (ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ ۲/۲) اس پروگرام کے صحیح اور یقینی ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اس لئے اس سے دل میں کسی قسم کا اضطراب نہیں پیدا ہونا چاہیئے۔ (ریب کے معنی شک و شبہ اور اضطراب دونوں ہیں) لیکن یہ ضابطۂ حیات صرف ان لوگوں کی راہ نمائی کر سکتا ہے جو اس کے ان دیکھے نتائج پر یقینِ محکم رکھیں (ھُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ ۲/۳) اس کے بعد اس پروگرام کے وہ دونوں اصول بیان ہوئے ہیں جن پر اس کی ساری عمارت اٹھتی ہے یعنی اقامت الصلوٰۃ اور سامانِ نشو و نما کو کھلا رکھنا (وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ۲/۳) پھر یہ بتایا گیا ہے کہ اس یقین آفرینی کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اس پیش کردہ تصور اور اس کے عملی پروگرام پر غور کریں اور اس طرح اس کی صداقت پر ایمان لائیں۔ اس کے ساتھ تاریخی یادداشتوں سے

اس حقیقت پر غور کریں کہ اس سے پہلے بھی یہی تصورِ حیات اور پروگرام دنیا کے سامنے آتا رہا ہے۔ اُس وقت اس نے کیا نتائج مرتب کئے تھے اور اس کے خلاف نظریاتِ زندگی کی حامل قوموں کا کیا انجام ہوا تھا۔ (وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ - ۲/۴) اس طرح انہیں مستقبل کی زندگی اور اس کی پائندگی پر یقین آ جائے گا (وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ - ۲/۴) جو جماعت اس طرح یقین پیدا کر کے اس راستے پر چل پڑے گی، اس کی کھیتی پروان چڑھے گی اور اس کے بیج فصل بن جائیں گے۔ (اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۲/۵)

لہٰذا اس نئے تجربہ، نئے پروگرام، نئے اندازِ زندگی کے لئے السابقون الاولون کا یقینِ محکم (ان دیکھے نتائج پر ایمان) ہی وہ قوت ہے جس کے آسرے وہ اس انقلابی نظریہ کو اختیار کر کے اس کے حصول کے لئے جادہ پیما ہو سکتے ہیں۔ اسی لئے دوسری جگہ کہا ہے کہ اس نظریۂ زندگی کی خوشگواریوں اور اس کے خلاف دوسرے تصورِ حیات کی ہلاکت انگیزیوں سے صرف ان ہی لوگوں کو آگاہ کیا جا سکتا ہے جو خدا کے قانونِ ربوبیت کے ان دیکھے نتائج کی عظمت کو اپنے دل میں لئے ہوں (اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ - ۳۵/۱۸) اور اس کے لئے اقامت الصلوٰۃ اختیار کریں (وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ) اور اس حقیقتِ کبریٰ پر ایمان رکھیں کہ دوسروں کی نشوونما سے درحقیقت ان کی اپنی نشوونما ہوتی ہے (وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ ۳۵/۱۸) اس ایمان بالغیب کے سہارے یہ جماعت اس جدید پروگرام کو لے کر چلے گی۔ لیکن یہ راہ "خراماں خراماں ارم" کی راہ نہیں جس میں ہر طرف پھولوں کے فرش بچھے ہوں۔ یہ راہ کانٹوں کی راہ ہے۔ اس میں قدم قدم پر ایسے خطرناک تصادم ہوں گے اور اس قسم کے ہول انگیز واقعات و حوادث پیش آئیں گے کہ یہ گھبرا کر پکار اٹھیں گے کہ۔ خدا کی وہ نصرت کہاں ہے جس کا ہم سے وعدہ کیا گیا تھا! چنانچہ اس راستے پر چلنے والوں سے پہلے ہی کہہ دیا گیا کہ

صبر آزما مراحل

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۔ (۲/۲۱۴)

کیا تم سمجھتے ہو کہ تم اس جنتی زندگی میں یونہی پہنچ جاؤ گے، درآنحالیکہ تم پر ابھی ایسے واقعات گزرے ہی نہیں

جو ان لوگوں کو پیش آتے تھے جو تم سے پہلے اس راہ پر چلے تھے۔ ان پر اس قدر سختیاں اور مصیبتیں آئیں کہ ان کے دل دہل گئے۔ یہاں تک کہ اس پروگرام کا داعی اوّل (رسول) اور اس کے ساتھی (مومنین کی جماعت) پکار اُٹھے کہ۔ اے نصرتِ الٰہی! تیرا وقت کب آئے گا؟

اسی لئے کہا گیا ہے کہ یہ راستہ بڑا کٹھن اور یہ منزل بڑی دشوار گزار ہے۔ اس میں استقامت کی بڑی ضرورت ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (۴۱/۳۰) جن لوگوں نے خدا کے قانونِ ربوبیت کو اپنا نصب العین بنا لیا اور اس راہ پر نہایت استقلال و استقامت سے گامزن ہو گئے تو، یہ ہیں وہ لوگ کہ قانونِ ربوبیت کے نتائج مرتب کرنے والی کائناتی قوتیں ان کی ممد و مددگار ہوں گی۔ تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ۔ (۴۱/۳۰) جو انہیں یقین دلائیں گی کہ ان کے لئے خوف و حزن کا کوئی مقام نہیں۔ (اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا۔ (۴۱/۳۰) اور وہ انہیں اس "جنت" کی بشارتیں دیں گی جن کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا (وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (۴۱/۳۰) اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ قوتیں ان کے قریبی مفاد کی زندگی (حیٰوۃ الدنیا) میں بھی ان کی رفیق و سازگار ہوں گی اور مستقبل کی زندگی میں بھی ان کی معین و مددگار (نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ (۴۱/۳۱) اور اس طرح قریب و مستقبل (دنیا و آخرت) دونوں میں، جو کچھ ان کا جی چاہے گا ملے گا۔ اور جو کچھ طلب کریں گے اُن کے سامنے آجائے گا۔ (وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَشْتَھِیْٓ اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَدَّعُوْنَ (۴۱/۳۱)

اس دعوتِ انقلاب کی مخالفت ہوگی ہر اس مفاد پرست گروہ کی طرف سے جو دوسروں کی کمائی پر جینے اور عیش کرنے کا خوگر ہو چکا ہے۔ ذرا غور کرنے پر یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی کہ یوں تو دنیا میں ہر شکار میں ایک لذت ہوتی ہے لیکن یہ لذت اپنی انتہا تک پہنچ جاتی ہے جب ایک انسان، کسی دوسرے انسان کا شکار کر رہا ہو۔ معلوم انسان کے خون میں کیا لذت ہے کہ (کہتے ہیں کہ) جب شیر کے منہ کو آدمی کا خون لگ جائے، تو وہ پھر کسی جانور کے خون سے مطمئن نہیں ہوتا۔ شیر کا تو پتہ نہیں، لیکن انسانوں کی دنیا تو ہمارے سامنے ہے۔ اس میں یہ حقیقت ڈھکی چھپی نہیں کہ ہر انسان، دوسرے انسان کے شکار کی گھات میں لگا رہتا ہے۔ انسان کی ساری تاریخ درحقیقت اسی سلسلۂ صید و صیاد کی تاریخ ہے۔

قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

جس چیز نے دنیا کو ایسا جہنم بنا رکھا ہے جس کے شعلے دلوں کو لپیٹے ہوئے ہیں (نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ۔ پ ۳۰) وہ اس کے سوا کیا ہے کہ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح دوسرے کے خون کی رنگینی اس کے چہرے کی سرخی کا باعث بن جائے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب کوئی جماعت اس نظامِ ربوبیت کے قیام کی کوشش کرے گی جس میں کوئی ایسا شخص جس میں کمانے کی استطاعت ہے کسی دوسرے انسان کی محنت سے نفع بھی حاصل نہ کر سکے اور کوئی شخص رزق کے سرچشموں کو اپنی ملکیت قرار دے کر دوسرے انسانوں کو خدا کی نعمت سے محروم نہ کر دے، تو ان لوگوں کی طرف سے اس جماعت کی مخالفت ضروری ہے جن کے منہ کو انسان کا خون لگ چکا ہے۔ اس مخالفت میں سرمایہ داروں اور

مفاد پرستوں کی طرف سے مخالفت

مذہبی پیشواؤں کی جماعت پیش پیش ہوگی کیونکہ یہی لوگ دوسروں کی کمائی پر موٹے ہوتے ہیں۔ وہ ایک طرف (بزعمِ خویش) "علمی دلائل" پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ اس قسم کا نظام "انسانی فطرت" کے خلاف ہے۔ ان کی دلیل یہ ہوگی کہ اگر تمام لوگوں کی ضروریاتِ زندگی پوری ہوتی جائیں گی، تو وہ کام ہی نہیں کریں گے۔ یا یہ کہ جب کسی شخص کو یہ معلوم ہوگا کہ اسے اس کی ضروریات سے زیادہ کچھ نہیں مل سکتا، تو وہ محنت کرنے میں اپنی جان کیوں مارے گا؟ وہ کہیں گے کہ انسان ضرورت کے تقاضوں سے مجبور ہو کر کام کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اس سے کام لینے کا کوئی اور طریقہ ہی نہیں (Mandeville) کے الفاظ میں:۔

غریبوں سے کام لینے کی ایک ہی شکل ہے اور وہ یہ کہ انہیں محتاج رکھا جائے۔ عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی ضروریات کو تھوڑا تھوڑا پورا کیا جائے۔ انہیں ضروریاتِ زندگی کی طرف سے بے نیاز کر دینا حماقت ہے۔

(Fable Of the Bees)

یا (Townsend) کے الفاظ میں:

بھوک کا کوڑا ایسا سخت ہے جو وحشی سے وحشی اور تند سے تند جانور کو بھی رام کر لیتا ہے۔ اس نے سرکش سے سرکش انسان مطیع و فرمانبردار بن جاتا ہے۔ اس لئے اگر تم غریبوں سے کام لینا چاہتے ہو، تو اس کا ذریعہ فقط ایک ہے یعنی بھوک۔ بھوک ہی وہ جذبہ محرکہ ہے جس سے غریب اور محتاج ہر قسم کا کام کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔

(Dissertation on the poor Laws)

چنانچہ (Defoe) نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ "اگر غریبوں کی مدد کی گئی تو وہ سہل انگار ہو جائیں گے۔ انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دینا چاہیے۔ وہ اپنا رزق آپ تلاش کریں اور کام نہ ملنے کی صورت میں فاقہ کشی کریں۔ وہ کہیں گے کہ یہی طریقہ ہے جس سے پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے اور ہر شخص دن رات محنت میں لگا رہتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جن لوگوں کی آنکھیں صرف قریبی مفاد خویش کو دیکھتی ہیں اور اس سے آگے نہیں جاتیں۔ ان کے علم کی حد بھی ایسی ہی تنگ ہوتی ہے (...... وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا۔ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ...... ۵۳-۲۹/۳۰)

دوسری طرف مذہبی پیشواؤں کا گروہ آگے بڑھے گا اور نہایت تقدس و طمطراق سے فتویٰ صادر کر دے گا کہ جو شخص اپنے سرمایہ میں سے زکوٰۃ نکال دیتا ہے اس کا سارا سرمایہ پاک اور طیب ہو جاتا ہے۔ جو شخص اپنی کمائی سے یا بزرگوں کی وراثت سے زمین، جائیداد وغیرہ خریدتا ہے، وہ اس کا شرعاً جائز مالک ہے۔ اس کی ملکیت پر نہ کوئی حد عائد کی جا سکتی ہے اور نہ ہی اسے اس سے محروم کیا جا سکتا ہے۔ غریب اور امیر کی تفریق خود خدا نے رکھی ہے۔ اس لئے اس تفریق کو مٹانا منشائے خداوندی کے خلاف ہے۔ اگر دنیا میں غریبوں کا طبقہ نہ رہے۔ تو صدقہ اور خیرات کے تمام احکام بے معنی ہو کر رہ جائیں۔ اگر لوگ جائیدادیں چھوڑ کر نہ مریں، تو وراثت اور وصیت کے تمام قوانین بے مطلب ہو جائیں۔ لہٰذا (ربوبیت عامہ کی) یہ نئی آواز، الحاد اور بے دینی ہے۔ یہ اس مسلک کے خلاف ہے جو اسلاف سے متواتر چلا آ رہا ہے۔ عوام ان "دلائل" سے مطمئن ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ وہ ہر موجودہ سسٹم کے اس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ اس کی جگہ کسی دوسرے نظام کے متعلق سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے۔ وہ ایسی جہنمی زندگی میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ لیکن اپنے دل و دماغ سے کام لے کر اپنے نظام میں تبدیلی کی جرأت نہیں کرتے (وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ ۖ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ۷/۱۷۹) یہ جہنمی وہ ہیں کہ دل رکھتے ہیں لیکن اس سے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن راستہ دیکھ کر چلنے کی زحمت کبھی گوارا نہیں کرتے۔ کان رکھتے ہیں لیکن سننے کی

ل Quoted by E.H Carr in "The new Society"

ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔ کہتے یہ ہیں کہ جس راہ پر ہم چلتے چلے آرہے ہیں وہی راہ حق و صداقت کی راہ ہے۔ یہ انسان نہیں حیوان ہیں (اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ ۷/۱۷۹) بلکہ ان سے بھی گئے گذرے (بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۷/۱۷۹)۔ حیوانات کی تو پھر بھی یہ حالت ہے کہ انہیں صرف ایک وقت میں پیٹ بھرنے کی فکر ہوتی ہے، جمع کرنے کی نہیں۔ اور انسان کا یہ عالم ہے کہ اس کا کبھی پیٹ ہی نہیں بھرتا۔ ایسا انسان حقیقت سے کس قدر بے خبر ہے (اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۷/۱۷۹) قرآن کہتا ہے کہ یہ "دلائل" انسان کے خود ساختہ مفاد پرستانہ مسلک کے ہیں۔ خدائی نظام کے نہیں۔ خدائی نظام کی دعوت یہ ہے کہ ارض (معاشی پیداوار کا ذریعہ) تمام نوعِ انسانی کے لئے کھلا ہے۔ اس کا مقصد ہی یہ ہے کہ تمام نوعِ انسانی (الناس) نہایت خوشگواری سے (طیبًا) کھائے پیئے (یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا ۲/۱۶۸) لیکن شیطان یہ چاہتا ہے کہ انسانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کر دے۔ لہٰذا اس کے مسلک کی پیروی نہ کرنا (وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ۲/۱۶۸) وہ اس مقصد کے لئے ایسے نظام کی تلقین کرتا ہے جس میں ناہمواریاں رہیں اور ہر شخص بخل کرے۔ (اِنَّمَا یَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ ۲/۱۶۹) دیکھنا! کہیں ایسا نہ ہو کہ تم نا سمجھی سے اس نظام کو خدا کا نظام سمجھنے لگ جاؤ (وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۲/۱۶۹) ایسے نظام کو "نظامِ شریعت" بتانے والوں سے کہو کہ تم خدا کی کتاب سے اس کی سند لاؤ۔ وہ اس سے کبھی سند نہیں لا سکیں گے۔ لیکن اس کے جواب میں کہیں گے کہ ہمارے اسلاف یہی کچھ کہتے چلے آرہے ہیں جو ہم کہتے ہیں۔ کیا وہ نہیں جانتے تھے کہ خدا کا نظام کیا ہے؟ (وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَیْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا ۲/۱۷۰) قرآن کہتا ہے کہ ذرا سوچو کہ یہ کیا دلیل ہے! یعنی "ہم آباؤ اجداد کے نقشِ قدم پر چلتے رہیں گے خواہ وہ راہ عقل و فکر کے بھی خلاف ہو اور ہدایتِ خداوندی کے بھی

۱؎ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، ارض کے متعلق قرآن نے وضاحت کر دی ہے کہ یہ تمام ضرورتمندوں کے لئے کھلی رہنی چاہیئے (سواءً للسائلین ۴۱/۱۰) لہٰذا اس کی حلال شکل یہی ہے کہ یہ سب کے لئے کھلی رہے۔ اگر یہ ذاتی ملکیت میں لا کر روک لی جائے تو یہ "محصورہ" ہو جائے گی جس کی قرآن نے مخالفت کی ہے۔ لہٰذا ارض کی پیداوار حلال و طیب اسی صورت میں قرار پائے گی جب یہ قرآن کے منشاء کے مطابق ربوبیت عامہ کیلئے کھلی رہے۔ خود لفظ حلال کے یہی معنی ہیں "کھلا ہوا"۔ قرآن کی رو سے

حلال کے معنی ہیں "جسے قانون خداوندی نے عام استعمال کے لئے کھول رکھا ہے"

خلاف" (اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ۲/۱۷۰) قرآن کہتا ہے کہ اگر اس پارٹی نے اس طرح استقامت برتی اور تمام مخالفتوں کا مقابلہ کرتی ہوئی آگے بڑھتی گئی تو اس کے بعد وہ وقت آجائے گا جب مشیت کے اٹل قانون کے مطابق ان کا تعمیری پروگرام، مخالفین کے تخریبی پروگرام پر غالب آجائے گا۔ اسی کا نام انقلاب ہے۔

ظہورِ انقلاب

اگرچہ اس (انقلاب) کی ترتیب ایک عرصہ سے شروع ہو چکی ہوتی ہے (یعنی اس وقت سے جب سے اس جماعت نے اس انقلابی فکر کو عام کرنا شروع کیا تھا) لیکن اس کا ظہور اس طرح دفعتہً، غیر متوقع طور پر ہوتا ہے کہ مخالف قوتیں دیکھتی کی دیکھتی رہ جاتی ہیں کہ یہ کیا ہو گیا۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے سورۂ انعام میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا عَلٰى مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ۝ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَاۤ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ؕ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ (۶/۳۱-۳۲)

یہ جماعت جو سمجھے بیٹھی تھی کہ خدا کے قانون سے ان کا کبھی آمنا سامنا (ٹکراؤ) ہی نہیں ہوگا، تباہ ہو کر رہے گی۔ حتیٰ کہ جب انقلاب کی گھڑی دفعتہً نمودار ہو جائے گی تو وہ کفِ افسوس مل کر کہیں گے کہ اس باب میں جو کچھ ہماری طرف سے ہوتا رہا، اس پر ہمیں ندامت ہے۔ لیکن ان کی یہ پشیمانی اس وقت ہوئی جب ان کے اعمال اپنا نتیجہ مرتب کر چکے تھے۔ ان کے اعمال کس قدر ناہمواریاں پیدا کرنے والے تھے! اس وقت وہ دیکھیں گے کہ قریبی مفاد پرستی کا نظریۂ زندگی کس طرح بچوں کا کھیل اور سعیٔ لاحاصل تھا۔ اس کے برعکس جن لوگوں نے اپنی جدوجہد کو خدا کے قانونِ ربوبیت سے ہم آہنگ رکھا، ان کے مستقبل کی نئی زندگی کس قدر منفعت بخش ثابت ہوئی۔ اے کاش! یہ لوگ اس حقیقت کو پہلے سمجھ لیتے۔

انقلاب کی ساعت (یعنی ظہورِ نتائج کے وقت)، پشیمانی اور ندامت کچھ کام نہیں دے گی۔ اس لئے کہ نتائج برآمد ہونے کے بعد پیچھے نہیں مڑا کرتے۔ اسی لئے دوسری جگہ کہا ہے کہ تم شروع ہی سے اپنی تمام توجہات اس نظامِ زندگی پر مرکوز کر دو جو معاشرہ میں توازن پیدا کرنے کا موجب ہے (فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ الْقَيِّمِ ۳۰/۴۳) قبل اس کے کہ نتائج

مرتب ہو کر سامنے آجائیں۔ کیونکہ جب نتائج سامنے آجاتے ہیں تو پھر واپس نہیں جایا کرتے (مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ۔ ۳۰/۴۳)۔ اُس وقت، جس طرح یہ دونوں جماعتیں (اس نظام کی موافق اور مخالف) ایک دوسرے سے الگ الگ تھیں، ان کی جدوجہد کے نتائج بھی متمیز طور پر الگ الگ سامنے آجائیں گے (يَوْمَئِذٍ يَّصَّدَّعُوْنَ)۔ جس جماعت نے قانونِ خداوندی سے انکار کیا تھا، اس کی منکرانہ جدوجہد کے نتائج اس کے سامنے ہوں گے (مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ) اور جس نے صلاحیت بخش پروگرام پر عمل کیا تھا اور اس طرح اپنے مستقبل کی زندگی کے لئے زمین ہموار کر لی تھی (وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ ۳۰/۴۴) تو اس جماعت کے ایمان اور اعمالِ صالحہ کے نتائج، زندگی کی مرفہ الحالی اور خوشگواری کی شکل میں سامنے آجائیں گے۔ (لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْ فَضْلِهٖ ۔ ۳۰/۴۵) یہ وہ خوشگواریاں ہیں جن سے اول الذکر (انکار کرنے والی جماعت) محروم رہے گی (اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۳۰/۴۵)

یہ کچھ یوں ہی اتفاقیہ (By chance) نہیں ہو جائے گا بلکہ خدا کے اُس قانون کے مطابق ہوگا۔ وہ قانون جس نے اعلان کر رکھا ہے کہ

اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ۔ (۳۸/۲۸)

کیا (یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ) ہم ان لوگوں کو جو دنیا میں ناہمواریاں پیدا کرتے ہیں، ان لوگوں کے برابر کر دیں گے جو ہمارے قانونِ ربوبیت پر ایمان رکھتے ہیں اور ہمواریاں پیدا کرنے والے پروگرام پر عمل پیرا ہوتے ہیں؟ کیا وہ لوگ جو اپنی معاشی زندگی کو ہمارے قانون سے الگ رکھتے ہیں (فجار)، ان کے برابر ہو جائیں گے جو اپنی زندگی کو ہمارے قانون سے ہم آہنگ رکھتے ہیں؟

یہ ناممکن ہے کہ ان دونوں جماعتوں کی زندگی ایک جیسی ہو جائے۔ اندھا اور بینا کبھی برابر نہیں ہو سکتے (وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۳۵/۱۹)۔ نہ ہی اندھیرا اور روشنی ایک جیسے ہو سکتے ہیں (وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ ۳۵/۲۰) اور نہ ہی سایہ اور دھوپ (وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ ۔ ۳۵/۲۱) اور نہ ہی مردہ اور زندہ برابر ہو سکتے ہیں (وَمَا يَسْتَوِي الْاَحْيَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ ۳۵/۲۲) اس لئے اس راہ پر چلنے والے اور اس سے نکل جانے والے کبھی طرح

برابر ہو سکتے ہیں۔ (أَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا لَا يَسْتَوُونَ ۔ ۳۲/۱۸) قرآن کہتا ہے کہ یہ لوگ جو معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرنے والے پروگرام پر عمل پیرا ہوتے ہیں، یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ان لوگوں جیسے ہو جائیں گے جو زندگی کے صحیح نصب العین پر ایمان رکھتے ہیں اور پھر ہمواریاں پیدا کرنے والے پروگرام کو اختیار کرتے ہیں۔ ان کی زندگی اور موت کبھی یکساں نہیں ہو سکتی۔ ان کا فیصلہ جو یہ اپنے ذہن میں کئے بیٹھے ہیں بالکل غلط ہے۔ (أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ أَنْ نَجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَاءً مَحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ) انہیں یہ معلوم نہیں کہ یہ تمام سلسلۂ کائنات تعمیری نتائج کو مرتب کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اس لئے ہو نہیں سکتا کہ اعمال کا صحیح صحیح نتیجہ مرتب نہ ہو (۴۵/۲۲) جب حقیقت یہ ہے تو یہ ناممکن ہے کہ اس قانونِ زندگی سے انکار کرنے والی جماعت (کافرین) اس جماعت پر غالب آجائے جو اس قانون کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائے ہوئے ہے (وَلَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا ۔ ۴/۱۴۱) انکار کرنے والی جماعت اس خیال کو دل سے نکال دے کہ وہ اس دوسری جماعت کو پچھاڑ دیں گے (لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ ۔ ۲۴/۵۷ ؛ ۸/۵۹) اس لئے کہ صحیح پروگرام پر عمل پیرا ہونے والی جماعت کی نصرت خدا نے اپنے اوپر فرض کر رکھی ہے (وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ ۔ ۳۰/۴۷) خدا نے لکھ دیا ہے کہ اس کا قانون اور وہ جماعت جو اس کی حامل ہوگی غالب رہے گی (كَتَبَ اللَّهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِي إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ ۔ ۵۸/۲۱) غلبہ اور سرفرازی صرف قانونِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے حاصل ہو سکتی ہے (مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعِزَّةَ فَلِلَّهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا ۔ ۳۵/۱۰) یہی وہ بنیادی اصول ہے جس کی سمت ابھر وہ نظریہ جو زندگی میں خوشگواریاں پیدا کرنے کا موجب ہے، ترقی کرتا جاتا ہے (إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ ۔ ۳۵/۱۰) اور اس کی یہ ترقی ہموار جد و جہد کے سہارے ہوتی ہے (وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ ۔ ۳۵/۱۰) اس کے برعکس جو لوگ معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرنے کے لئے خفیہ تدابیر کرتے رہیں، انہیں سخت سزا بھگتنی پڑے گی۔ (وَالَّذِينَ يَمْكُرُونَ السَّيِّئَاتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ)

آخری کامیابی

اور آخر الامر ان کی تدابیر تباہ و برباد ہو کر رہیں گی (وَمَكْرُ أُولَٰئِكَ هُوَ يَبُورُ ۔ ۳۵/۱۰) اس طرح انجام کار اس گروہ کی جڑیں کٹ جائیں گی جو لوگوں کے حقوق میں کمی کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد خدائے ربّ العالمین کا قانونِ ربوبیت سب کے لئے وجہِ ستائش بن جائے گا۔

(فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ - ۶/۴۵) اس خدا کا قانون جس کی ربوبیت پستیوں اور بلندیوں کو محیط ہے (فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ - ۴۵/۳۶)۔ جس کا نظامِ نشو و نما تمام کائنات پر چھایا ہوا ہے (رَبِّ الْعَالَمِیْن - ۴۵/۳۶) معاشی اور آفاقی دنیا میں کبریائی صرف اسی کے لئے ہے (وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۴۵/۳۷)۔ اس لئے کہ اس کا قانون بڑا غالب اور محکم ہے۔ (وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ - ۴۵/۳۷) وہ کہتا ہے کہ قوت و ضعف، اقتدار و محکومیت، عزت و ذلت کے فیصلے خدا کے کائناتی قانون کے مطابق ہوتے ہیں۔ نہ کہ لوگوں کے خود ساختہ آئین و اصول کے مطابق (۳/۲۵)۔ یہاں قانون یہ ہے کہ ہر عمل اپنے نتائج مرتب کرتا ہوا آگے بڑھتا جاتا ہے تا آنکہ وہ اس مقام تک پہنچ جاتا ہے جہاں اس کے نتائج مشہود شکل میں سامنے آجاتے ہیں۔ یہی اس کا مستقر (جائے قرار) ہوتا ہے (۶/۶۷) اسی کا نام وہ "میعادِ مقرر" (اجل) ہے جو ہر قوم کے لئے متعین ہوتی ہے۔ اس میعاد کا تعین کہیں خارج سے نہیں ہوتا بلکہ قانونِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے۔ اس دوران میں وہ دیکھتا جاتا ہے کہ اس قوم کے کون کون سے اعمال ایسے ہیں جن کے نتائج باقی رہنے کے قابل ہیں اور کون کون سے ایسے جو مٹا دینے کے قابل ہیں۔ یہ فیصلے خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتے رہتے ہیں (۱۳/۳۹) لہٰذا، یہ میعاد درحقیقت اس وقفے کا نام ہے جس میں اس قوم کا غلط نظام اپنے نتائج مرتب کرتا ہوا نقطۂ آخریں تک پہنچ جاتا ہے جہاں وہ کسی کے سنبھالے نہیں سنبھل سکتا نہ کسی کے روکے رُک سکتا ہے (۱/۴۴)۔ کوئی عمل خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، اس قانون کی زد سے باہر نہیں رہ سکتا۔ ہر ایک نتیجہ خیز ہوتا ہے (۱۶/۴۴)۔ اس کی گرفت بڑی سخت ہے (۴۴/۱۶ ؛ ۸۵/۱۲) اور اس کا مواخذہ بڑا محکم (۴۳/۱۶)۔ لہٰذا جس انقلابِ عظیم کے متعلق تمہیں کہا جا رہا ہے، وہ آکر رہے گا (۲۲/۱۷)، اس وقت یہ تمام سرکش اور متمرد اربابِ اقتدار جو اس وقت اس نظام کی مخالفت میں اس قدر زوروں پر ہیں، خاسر و ناکام، تباہ حال ہو کر ادھر اُدھر بھاگ اٹھیں گے (۱۴/۴۵-۵۲)۔ اُن سے کہا جائے گا کہ اب کہاں بھاگے جا رہے ہو (۲۱/۱۲-۱۴)۔ اب کہیں پناہ نہیں مل سکتی (۷۵/۱۱)۔ اُس وقت اُن سے کہا جائے گا کہ یہ ہے تمہارا اعمال نامہ (۳۶/۴۴-۲۶-۲۹) جو اس وقت اس انقلاب کے رنگ میں بے نقاب ہو کر تمہارے سامنے آیا ہے (۴۵/۲۳)۔ اس وقت ان کی یہ حالت ہو جائے گی جیسے "کٹے ہوئے کھیت یا بجھے ہوئے کوئلے" (۲۱/۱۴)۔ پھر ان پر نہ آسمان روئے گا، نہ زمین صف ماتم

بچھائے گی (۵۷/۲۳)۔ اور نہ ہی ہم متاسف ہوں گے (۹۱/۱۵)۔ اس لئے کہ یہ سب کچھ ہمارے لگے بندھے قانونِ مکافات کے مطابق ہوگا۔ یونہی اندھا دھند فیصلے کا نتیجہ نہیں ہوگا۔ جس کے بعد انسان خود ہی پشیمان ہو جاتا ہے کہ یہ میں نے کیا کر دیا۔ لہٰذا اُن سے کہو کہ جو کچھ تم سے کہا جاتا ہے (کہ تمہارا انجام یہ ہوگا) اس پر ہنسو نہیں، خون کے آنسو روؤ (۵۳/۶۰) کہ یہ مقام رونے ہی کا ہے۔

قرآنِ کریم ان محکم حقائق اور بیّن شواہد سے ان لوگوں کے دلوں میں، جو اس انقلابِ ربوبیت کے لئے سب سے پہلے تیار ہوتے ہیں، یقینِ راسخ پیدا کرتا ہے، اور، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہی وہ قوت ہے جس کے آسرے پر وہ ایسے عظیم انقلاب کے لئے کمربستہ ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اگر آج کا مسلمان یہ سمجھتا ہے کہ نظامِ ربوبیت ہی وہ صحیح نظام ہے جس کے مطابق قرآن انسانی معاشرہ کی تشکیل چاہتا ہے اور اسے اس کا یقینِ محکم ہے کہ جو جماعت اس توازن بدوش انقلاب کا عزم لے کر اٹھے گی وہ یقیناً کامیاب ہوگی، تو اس کیلئے کچھ اور سوچنے اور سمجھنے کی ضرورت نہیں۔ کرنے کا کام یہ ہے کہ جن افراد کے دل میں یہ حقیقت ایک زندہ ایمان کی شکل میں جاگزیں ہو چکی ہے، انہیں ایک مرکز پر اکٹھا کر لیا جائے اور اسکے بعد اس قرآنی نظام کی دعوت کا سلسلہ وسیع کرنا شروع کر دیا جائے۔ اس وقت دنیا، اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے جہنم میں اس بُری طرح سے ماخوذ ہے کہ اسے اس سے نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اس نے اپنے خودساختہ نظامہائے حیات کو ایک ایک کر کے آزما لیا ہے اور ہر تجربے کے بعد وہ بے ساختہ پکار اٹھتی ہے کہ ع

تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی

یہی نہیں، بلکہ ہر نیا تجربہ اسے نئی قسم کی مشکلات میں الجھا دیتا ہے۔ اس وقت ساری دنیا پر عجیب انداز کی مایوسی چھائی ہوئی ہے۔ وہ ہر دَور سے اُٹھنے والی گرد کو بڑی حسرت سے دیکھتی ہے کہ شاید اسی میں وہ شاہسوار چھپا ہو جو اس کے مصائب و مشکلات کا خاتمہ کر دے۔ لیکن اس کے بعد پھر مایوس ہو کر بیٹھ جاتی ہے۔ کہ اسے اس گرد میں رہنما کی جگہ راہزن دکھائی دیتا ہے۔ ان حالات میں اگر کسی جگہ کے مسلمانوں نے خدا کے اس نظامِ ربوبیت کو عملی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کر دیا تو وہ یقین مانیں کہ ساری دنیا کی امامت انہی کے حصہ میں آجائے گی۔ اور جنت سے نکلا ہوا آدم، جو آج اس طرح مبتلائے غم واندوہ، حیران و پریشان

مارا مارا پھر رہا ہے، پھر سے جنّت میں پہنچ جائے گا۔

خدا کا آفاقی قانون

یہ تو وہ طریقِ کار ہے جس سے نظامِ ربوبیت، انسانوں کے ہاتھوں سے قائم ہوتا ہے لیکن اگر انسان اس کے قیام میں کوشش نہ کریں، تو بھی یہ خدا کے آفاقی قانون کے مطابق جسے عام طور پر زمانے کا تقاضا کہا جاتا ہے، ایک نہ ایک دن قائم ہو کر رہے گا۔ لیکن خدا کا آفاقی قانون (انسانی عمر کی نسبت سے) بڑا سست رفتار ہے۔ آپ کائنات کے نظامِ ارتقاء (Evolution) کو دیکھئے۔ کسی نوع (Species) میں ایک ذرا سی تبدیلی کے لئے ہزارہا سال لگ جاتے ہیں۔ اسی لئے قرآن میں ہے کہ "خدا کا ایک ایک دن ہزار ہزار اور پچاس پچاس ہزار سال کا ہوتا ہے" (دیکھئے ۲۲/۴۷ ؛ ۳۲/۵ ؛ ۷۰/۴)

لہٰذا آفاقی قانون کے مطابق نظامِ ربوبیت کے قیام میں نامعلوم کتنا عرصہ لگ جائے۔ اس دوران میں انسانیت مصیبتوں اور شقتوں کے جس جہنم سے گزرے گی وہ ظاہر ہے۔ لیکن اگر اسی آفاقی قانون کے ساتھ انسانی رفاقت شامل ہو جائے تو ہزار ہزار سال کا یہی عرصہ سمٹ کر دنوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ قرآن میں ہے کہ عادِ پرستانہ ذہنیت کے لوگ مذاق اڑاتے ہیں کہ وہ تباہی اور بربادی کہاں ہے جس سے تم ڈرا رہے ہو؟ خدا کا وہ عذاب کب آئے گا؟ جس انقلاب کا تم ذکر کر رہے ہو، وہ آتا کیوں نہیں؟ (وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ ۲۲/۴۷) جواب میں کہا جاتا ہے کہ ان سے کہدو کہ خدا کا وعدہ غلط نہیں ہوا کرتا، وہ تباہی آکر رہے گی۔ بات صرف یہ ہے کہ خدا کا ایک دن تمہارے اعداد و شمار کے مطابق، ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے (وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ - ۲۲/۴۷) اس لئے آفاقی قانون کے مطابق، اس غلط نظام کی تباہی کچھ عرصہ بعد ظہور میں آئے گی۔

انسانی رفاقت

لیکن جب اسی آفاقی قانون کے ساتھ محمد رسول اللہ والذین معہٗ کی رفاقت شامل[1] ہو گئی، تو وہ تباہی دنوں میں سامنے

---

[1] ہم اس سے پہلے تفصیلاً لکھ چکے ہیں کہ انسانوں کی دنیا میں "خدا کے کام" کس طرح خود انسانوں کے ہاتھوں سے سرانجام پاتے ہیں اس کا نام رفاقت یا تقویٰ ہے یعنی انسانوں کا قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ ہو جانا تاکہ اس قانون کے عملی نتائج جلدی سامنے آجائیں۔

آگئی اور قریش نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ یہ موعودہ انقلاب کس طرح آکر رہا ہے۔ چنانچہ وہی سوال جب نبی اکرمؐ سے کیا گیا (یعنی عذاب کب آئے گا؟) تو آپ کی زبان سے کہلایا گیا کہ (اِنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ وَّمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ۔ ۱۳۵/۶) جس انقلاب کا وعدہ کیا گیا ہے وہ یقیناً آنے والا ہے تمہاری کوششیں اسے روک نہیں سکتیں۔ بس اتنا ہے کہ تم اپنے پروگرام پر عمل کرتے جاؤ اور مجھے اپنے پروگرام پر عمل کرنے دو (قُلْ یٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰی مَکَانَتِکُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ۔ ۱۳۶/۶) تھوڑے ہی دنوں کے بعد نتیجہ تمہارے سامنے آجائے گا (فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ۔ ۱۳۶/۶) یعنی انقلاب دونوں صورتوں میں آکر رہے گا۔ لیکن اگر اسے تنہا آفاقی قانون کے سپرد کردیا گیا تو یہ پروگرام اپنی منازل ہزار ہزار سال کے دنوں میں طے کرے گا۔ اور اس میں بڑی بڑی تباہیوں کا سامنا بھی ہوگا۔ اور اگر اس کے لئے انسانوں کی جماعت اٹھ کھڑی ہوئی تو (فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ) وہ ابھی سامنے آجائے گا اور نسبتاً امن و سکون سے قائم ہوجائے گا۔ (Lesli paul) اس باب میں لکھتا ہے:-

> انسان اپنی زندگی میں فطری عمل ارتقاء کے خلاف چلتا ہے وہ اس کا انتظار نہیں کرتا کہ حوادثِ عالم اپنے طریق پر اس کے مقصد کی سمت چلیں۔ نہ ہی وہ زمانہ کا انتظار کرتا ہے کہ وہ اس کا ساز گار ہو۔ وہ حوادث کو مجبور کردیتا ہے کہ وہ اس کے پروگرام کے مطابق چلیں۔ وہ جس چیز کی خواہش کرتا ہے، اس کے مطابق اپنا پروگرام مرتب کرلیتا ہے اور پھر عملِ تخلیق سے اپنے ماحول پر غلبہ پاکر اسے اپنا ساز گار بنالیتا ہے.... جو کچھ اس کائنات میں انسان کے ہاتھوں سے وجود میں آیا ہے، فطرت کا عملِ تخلیق و ارتقاء اسے کروڑوں برس میں بھی پیدا نہیں کرسکتا تھا۔
>
> (Annihilation Of Man)

آپ غور کیجئے کہ قرآن کا پیغام کیا تھا؟ یہ درحقیقت انقلاب کا پیغام تھا۔ ان تمام غلط نظریہ ہائے زندگی اور تصوراتِ حیات کے خلاف جن پر انسانی معاشرہ کی بنیادیں رکھی جاتی تھیں۔ قرآن نے ان تصورات کو ایک ایک کرکے گنایا اور واضح الفاظ میں بتادیا کہ یہ تصورات غلط ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ان تصورات کو بھی وضاحت سے بیان کردیا جن کے مطابق صحیح انسانی معاشرہ متشکل ہوسکتا ہے۔ نبی اکرمؐ نے مسلسل جہاد سے،

غلط تصورات حیات کو مٹا دیا اور ان کی جگہ اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق صحیح تصورات کو عملاً متشکل فرما دیا۔ یعنی جو انقلاب خدا کے آفاقی قانون کے مطابق ہزاروں سال کے بعد ظہور پذیر ہوتا، اس جماعت کی رفاقت سے وہی انقلاب چند سال کی مدت میں سامنے آگیا۔ کچھ عرصہ کے بعد اس قوم نے ان تصورات کو چھوڑ دیا اور پھر سے وہی غلط تصورات ان کے معاشرے کے اجزاء بن گئے۔ یعنی انسانوں نے خدا کے قانون کی رفاقت چھوڑ دی۔ اب یہ انقلاب پھر تنہا آفاقی قانون کے سپرد ہو گیا۔ آپ دیکھئے کہ اس ہزار سال کے عرصہ میں، غلط تصورات کس طرح ایک ایک کرکے پیچھے ہٹتے گئے اور ان کی جگہ، صحیح تصورات (یا ان تصورات سے ملتے جلتے تصورات) آہستہ آہستہ مسلط ہوتے چلے گئے۔ مثلاً قرآن نے کہا تھا کہ ملوکیت (Kingship) کا نظام باطل کا نظام ہے۔ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ انسانی معاملات کا حل باہمی مشاورت سے ہونا چاہیئے۔ آپ دیکھئے کہ دنیا کس طرح کشاں کشاں اس انقلاب کی طرف چلی آ رہی ہے۔ اگرچہ دنیا ابھی تک اس باب میں، اس منزل تک نہیں پہنچی جو قرآن نے متعین کی تھی۔

قرآنی تصوّرات کو زمانہ خود قبول کر رہا ہے

لیکن بایں ہمہ اس کا ہر قدم شہنشاہیت کے بت کو توڑ کر شورائیت کی طرف اٹھ رہا ہے۔

پھر اس نے کہا تھا کہ پیشوائیت (Priesthood) کا ادارہ (Institution) باطل کی بنیادوں پر قائم ہے۔ خدا اور بندوں کے درمیان کسی ذریعے اور واسطے کی ضرورت نہیں۔ آپ دیکھئے کہ دنیا سے کس طرح پیشوائیت کا خاتمہ ہو رہا ہے۔

اس نے کہا تھا کہ غلامی (Slavery) نوعِ انسانی کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔ خدا نے ہر فرزندِ آدم کو ایک جیسا پیدا کیا ہے اور آدمی بہ حیثیت آدمی ہونے کے مستحق تکریم ہے (وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ) آپ نے دیکھا ہے کہ دنیا نے کس طرح غلامی کو لعنت قرار دے کر مٹا دیا۔

اس نے کہا تھا کہ رنگ، نسل، زبان، وطن (قومیت) کی تفریق و تقسیم یکسر باطل ہے۔ تمام نوعِ انسانی ایک عالمگیر برادری ہے۔ ساری دنیا کے انسان، امتِ واحدہ کے افراد ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ دنیا کس طرح رفتہ رفتہ اسی تصور کو اپنانے کی فکر کر رہی ہے[1]۔

(۱؎ فٹ نوٹ صفحہ ۲۵۴ پر دیکھئے)

یہ سب کچھ خدا کے کائناتی قانون کی رُو سے از خود ہو رہا ہے۔ یہی ہے وہ قانون جسے قرآن سنۃ اللہ کہہ کر پکارتا ہے (اور جسے اقبالؔ "فطرت کے لطیف اشاروں" سے تعبیر کرتا ہے) یہی وہ قانون ہے جو اس امر کا فیصلہ کرتا ہے کہ دنیا میں کونسا نظریہ، تصور یا نظام، باقی رہنے کے قابل ہے اور کونسا مٹ جانے کا مستحق (۱۳/۳۹)۔ یہ قانون آہستہ آہستہ، بتدریج ایسے حالات پیدا کرتا رہتا ہے جن کی رُو سے تخریبی نتائج کے حامل تصورات مٹتے جاتے ہیں اور تعمیری نتائج کے ضامن تصورات ان کی جگہ لیتے جاتے ہیں۔ قرآن کی اصطلاح میں اس طریقِ عمل کو "احقاقِ حق اور ابطالِ باطل" کہا جاتا ہے (۸/۸، ۲۱/۱۸) اس قانون کا اصل

(صفحہ ۲۵۳ کا فٹ نوٹ)

لہ یہ حقیقت کس قدر دل خراش ہے کہ آج جبکہ ساری دنیا زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر قرآنی تصورات کے قریب آرہی ہے؛ مسلمانوں کی مملکتیں ان تصورات کے قبول کرنے میں سب سے پیچھے ہیں۔ آج دنیا میں شخصی حکومتیں کہیں ہیں تو مسلمانوں کے ہاں۔ تھیوکریسی (ملائیت اور پیر پرستی) اپنی بدترین شکل میں ان کے ہاں موجود ہے۔ نسلی اور جغرافیائی امتیازات ان کے ہاں موجود ہیں۔ اور تو اور اگر آج صفحۂ ارض پر کہیں غلام بنائے جاتے ہیں تو حجاز کی مقدس سرزمین میں۔ خود پاکستان میں اگر سیاسی دستور مُلّا کی دی ہوئی "شریعت" کے مطابق بن گیا تو غلام اور لونڈیاں شرعاً جائز قرار پائیں گی۔ اسلئے کہ یہاں یہ فتویٰ دیدیا گیا ہے کہ اسلامی شریعت میں جنگ کے قیدیوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنایا جائے گا۔ (ملاحظہ ہو "رسائل و مسائل" از ابو الاعلیٰ صاحب مودودی۔ یا "غلام اور لونڈیاں" شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام۔) لیکن اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، قرآنی تصورات کو قبول کرنے کے دو ہی طریقے ہیں۔ ایک ایمان بالغیب کی رو سے (جس طرح عہدِ نبی اکرمؐ کے مسلمانوں نے انہیں قبول کیا)۔ اور دوسرے شعوری طور پر (جس طرح اب دنیا کی قومیں فکری طور پر انہیں غیر شعوری انداز سے قبول کئے جا رہی ہیں)۔ قرآن پر ایمان مسلمان کے دل میں باقی نہیں رہا (اس لئے کہ مُلّا کی شریعت اور تفسیر نے قرآن کو بالکل چیستان بنا رکھا ہے)۔ اور مسلمانوں کی فکری صلاحیتیں ایک عرصہ سے مفلوج ہو چکی ہیں، کیونکہ اسے بتایا گیا ہے کہ مذہب کے معاملے میں سوچنا جرم ہے۔ اس میں آنکھ بند کر کے اسی طریق پر چلتے رہنا چاہیئے جو طریق اسلاف سے متوارث چلا آتا ہے۔ لہٰذا جب حالت یہ ہو کہ نہ ان کے سینے میں ایمان کی حرارت باقی رہی ہو، اور نہ ان کے ذہن میں بصیرت کی روشنی، تو یہ قرآنی تصورات کو قبول کس طرح سے کریں؟

الاصول (جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) یہ ہے کہ باقی وہی رہتا ہے جو نوعِ انسانی کی عالمگیر منفعت کا موجب ہوتا ہے۔ باقی سب کچھ خس و خاشاک کی طرح بہ جاتا ہے (۱۳/۱۷)۔ یہی وہ "شجرِ طیب" ہے جس کی جڑیں پاتال میں گئی ہیں اور شاخیں بامِ فلک کو چومتی ہیں (۱۴/۲۴-۲۸)

اسی قانون کے مطابق، قرآن نے کہا ہے کہ سرمایہ داری کا مفاد پرستانہ نظام، باطل کا نظام ہے۔ اس لئے یہ باقی نہیں رہ سکتا۔ باقی وہی نظام رہے گا جو نوعِ انسانی کی ربوبیت و منفعت کا ضامن ہوگا۔ ظاہر ہے کہ جس طرح قرآن کے پیش کردہ دوسرے انقلابات بتدریج آ چکے ہیں یا آ رہے ہیں، یہ معاشی انقلاب بھی آ کر رہے گا۔

اس حقیقت کا اعتراف کس طرح ہو رہا ہے اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے۔ چند صفحات پہلے، امریکہ کے نامور جرنلسٹ (Jack Belden) کی اس کتاب (China Shakes The World) کا ذکر آ چکا ہے، جو اس نے انقلابِ چین کے متعلق لکھی ہے۔ مغرب کے بڑے بڑے مدبرین نے اس کتاب کی تعریف کی ہے۔ بیلڈن اس کتاب کے پیش لفظ میں لکھتا ہے کہ دنیا حیران ہے کہ چین کا یہ انقلاب رونما کس طرح ہو گیا! "خاقانِ چین" (چیانگ کائی شک) لامحدود قوتوں کا مالک تھا۔ پھر اس کے ساتھ امریکہ کی مدد شامل تھی جہاں سے اسے اسلحہ اور دیگر سامانِ جنگ با فراط مل رہا تھا۔ اس قوت و دولت اور ساز و یراق کی موجودگی میں، چیانگ کائی شک کو کس طرح شکست مل گئی اور سرزمینِ چین میں امریکہ جیسی مملکت کی بساطِ سیاست کس طرح الٹ گئی؟ بیلڈن لکھتا ہے کہ اس تحیر انگیز واقعہ کے اسباب و علل دریافت کرنے کے لئے دنیا بیتاب ہے۔ لیکن

> نہ تو حکومتِ امریکہ اور امریکی پریس، نہ ہی امریکہ کے عوام اور ان کے وہ نمائندے جو شرقِ بعید کے قونصل خانوں میں بیٹھے ہیں، نہ کاروباری حلقے اور نہ ہی فوجی ادارے، اپنی نگاہ کو اپنے ذاتی یا قومی مفاد کی تنگ وادی سے آگے لے جاتے ہیں، تاکہ وہ اہلِ چین کے درد آگیں اور پُر از جذبات قلوب تک جا پہنچیں

اس کے بعد بیلڈن لکھتا ہے کہ

> ان تمام لوگوں کو (جو اس انقلاب کی صحیح علت معلوم کرنا چاہتے ہیں) محمدؐ کے ان الفاظ کی یاد دلا دینا چاہیئے

جو وہ مکہ کے سوداگروں سے کہا کرتے تھے کہ

كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ۔ وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ (۸۹/۱۷ — ۱۸)

نہیں! (تمہاری ہلاکت و بربادی کا اصل سبب یہ ہے کہ) تم یتیم کی عزت نہیں کیا کرتے تھے اور ایک دوسرے کو مسکین کی روٹی کا انتظام کرنے کی ترغیب نہیں دیا کرتے تھے۔

آپ نے غور کیا کہ اس غیر مسلم امریکی جرنلسٹ کی نگاہ کس طرح قرآن کے ان حقائق تک پہنچی ہے جو اس نے چودہ سو سال پہلے بیان کئے تھے؟ لہٰذا قرآن کا پیش کردہ معاشی انقلاب آکر رہے گا۔ اس کے متعلق قرآن کریم سے نہایت لطیف اشارات ملتے ہیں (جو اپنے وقت پر حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آتے جائیں گے)۔ مثلاً سورۂ انبیاء میں ہے کہ موجودہ نظامِ معیشت (جس کی رو سے ایک فرد بلاحدود و قیود رزق کے سرچشموں کو اپنی ملکیت میں لے لیتا ہے اور وہ اس کے بعد اس کی نسل میں ورثتاً منتقل ہوتے رہتے ہیں، قرنہا قرن سے چلا آرہا ہے (بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ (۲۱/۴۴) اس سے یہ لوگ سمجھنے لگ گئے ہیں کہ یہی نظام صحیح فطرت کے مطابق نظام ہے اور اس کے صحیح ہونے کی دلیل بھی یہی پیش کرتے ہیں کہ یہ اتنے زمانے سے چلا آرہا ہے۔ لیکن قرآن کہتا ہے (اور ہمارے زمانے کے انسانوں سے بالخصوص کہتا ہے کہ)، کیا یہ لوگ دیکھ نہیں رہے کہ ہمارا کائناتی قانون، ایک غیر مرئی قوت کے زور سے، کس طرح معیشت کے ان لامحدود ذرائع کو، ان لوگوں کے ہاتھوں سے چھین چھین کر، ان کی ذاتی ملکیتوں کو کم کرتا چلا جارہا ہے (اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا)، کیا یہ نہیں دیکھتے کہ ہم معاشی وسائل (ارض) کو ان بڑے بڑے لوگوں (اَطْرَافِهَا) کے ہاتھوں سے کم کرتے جارہے ہیں (اطراف کے معنی رؤسا اور اکابر ہیں)۔ اس کے بعد ہے کہ کیا یہ لوگ (محض اس دلیل کی بناء پر کہ موجودہ نظام قرنہا قرن سے چلا آرہا ہے اور ان کی ذاتی ملکیت میں کوئی تصرف نہیں کر سکتا۔) ہمارے قانون پر غالب آنا چاہتے ہیں (اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ (۲۱/۴۴)) قرآن کہتا ہے کہ اب وہ دور گزر گیا۔ اب وہ زمانہ آرہا ہے جس میں انصاف کی رو سے میزان کھڑی کی جائے گی (وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ (۲۱/۴۷)) اس میزان کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کسی کی محنت میں کوئی کمی نہیں کر سکے گا۔ اور محنت کرنے والے کی محنت کا ذرہ ذرہ نتیجہ خیز ہوگا۔ اس کا حساب سرمایہ دار اور زمیندار نہیں کیا کرے گا کہ محنت کش کا حصہ کیا ہے اور اس کا کتنا۔ اس کا حساب وہ معاشرہ کرے گا جو قوانینِ خداوندی کے

مطابق تشکل ہوگا۔ (فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ۚ وَإِن كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا ۗ وَكَفَىٰ بِنَا حَاسِبِينَ ۔ ۲۱/۴۷) سورۃ الرعد میں بھی اس حقیقت کو دہرایا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ لوگ بڑی بڑی محکم تدابیر کرتے رہتے ہیں کہ (یہ نظام اس طرح قائم رہے لیکن) خدا کی تدبیر بڑی جامع ہے۔ وہ کامیاب ہو کر رہے گی (۱۳/۴۲) اور ربوبیت عالمین کا دور آکر رہے گا۔ لیکن جس طرح دوسرے انقلابات کے ظہور پذیر ہونے میں (آفاقی قانون کے مطابق) اتنا وقت لگا ہے، اسی طرح (اگر) اسے بھی آفاقی قانون کے سپرد رکھا گیا تو، اس میں بھی وقت لگے گا۔ (اگرچہ فطرت کے اشاروں سے کچھ ایسا مترشح ہوتا ہے کہ اس کا زمانہ اب کچھ زیادہ دُور نہیں) نیز جس طرح دوسرے انقلابات تک پہنچتے پہنچتے نوعِ انسان کو جاں کاہ مشقتوں میں سے گزرنا پڑا ہے، اس انقلاب تک پہنچنے میں بھی اسی قسم کے جگر سوز مراحل میں سے گزرنا پڑیگا اگر انسان وحی کی بات مان لے اور اس کے پروگرام کو از خود اختیار کرلے تو نہ صرف یہ کہ اس سے عمل اور اس کے نتیجہ کا درمیانی عرصہ ہی بہت کم ہو جاتا ہے، بلکہ انسان تباہیوں اور بربادیوں کے بغیر، منزلِ مقصود تک جا پہنچتا ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ اپنی فکر سے اپنے لئے راہیں تراشتا رہے اور ناکام تجربوں میں اپنا وقت اور توانائی ضائع کرتا رہے، تو اسے منزل تک پہنچنے میں وقت بھی بہت زیادہ لگتا ہے اور راستے میں ہزارہا نادیدہ مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں، وحی کی راہنمائی انسانی محنت میں بڑی کفایت کر دیتی ہے[1]۔ فرشتوں نے جس آدم کے خمیر میں آگ کی چنگاریاں اور خون کے چھینٹے دیکھے تھے، وہ آدم وہی تھا جو وحی کی راہ نمائی کے بغیر سفرِ زندگی طے کرنا چاہتا تھا۔ اس کے برعکس دوسرا آدم وہ ہے جو سفرِ حیات میں وحی کی راہ نمائی سے راستہ متعین کرتا ہے، اس کے متعلق کہہ دیا کہ (لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۔) وہ راستہ کے خطرے سے محفوظ و مامون رہے گا۔ نیز یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان جب، کائناتی قانون کے مطابق زندگی کے صحیح اصولوں کو قبول کرتا ہے تو اس کی نگاہوں کے سامنے راستہ واضح انداز میں نہیں آتا۔ دھندلا سا نقشہ سامنے آتا ہے اور اسے صحیح راستہ تک پہنچنے کے لئے مزید کد و کاوش کرنی پڑتی ہے۔ جس میں پھر خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور تباہیاں آتی ہیں۔ (تفصیل اس کی آخری باب میں ملے گی)

بہر حال، ہم کہہ یہ رہے تھے کہ دنیا میں نظامِ ربوبیت تو قائم ہو کر رہنا ہے اگر اسے آفاقی قانون پر چھوڑ دیا گیا تو، اس نظام تک پہنچتے پہنچتے، انسان کو اعصاب شکن ٹھوکریں کھانی پڑیں گی اور نہ معلوم کتنے خون کے

[1] Economises Human Efforts.

دریا اور آگ کی خندقیں پار کرنی پڑیں۔ قرآن میں ہے کہ

یٰاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰی رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ (۸۴/۶)

اے انسان! تو خدا کے (نظام) ربوبیت تک پہنچے گا تو ضرور لیکن سخت صبر آزما مشقتوں کے بعد۔

قرآنی دور

لیکن اگر اس نے اپنا پروگرام یمن وسعادت کے ہاتھوں میں دیدیا۔ تو اس کا حساب بہت آسان ہوجائے گا۔ (فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ۔ فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا۔ ۸۴/۷-۸) جو قوتیں اس معاشرہ کے قیام میں حائل ہوں گی انہیں راستہ سے ہٹا دیا جائے گا۔ چنانچہ سورۃ المطففین میں ہے کہ وہ معاشرہ یقیناً برباد ہوجائے گا جس میں لوگوں کی حالت یہ ہو کہ وہ دوسروں سے لیں (ناپ تول کر) پورا لیں اور جب ان کا معاوضہ دیں تو اس میں ہمیشہ کمی کریں۔ (وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ یُخْسِرُوْنَ۔ ۸۳/۱-۳) قرآن کہتا ہے کہ یہ لوگ اپنے دل میں یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ یہ ہمیشہ اسی طرح کرتے رہیں گے! بالکل نہیں ایک زمانہ عظیم (A Great Age) آنے والا ہے جس میں

یَّوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ (۸۳/۶)

تمام نوع انسانی خدا کی ربوبیت عامہ کیلئے اُٹھ کھڑی ہوگی۔

ان مفاد پرست قوتوں کو، جو اس دور کے آنے کی راہ میں حائل ہو رہی ہیں، راستہ سے ہٹا دیا جائے گا (اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ۔ ۸۳/۴) بعث کے معنی ہیں ہر چیز کسی کی آزادی کی راہ میں حائل ہوتی ہو اسے راستے سے ہٹا دینا۔ اس طرح وہ دور آجائے گا جس میں ..... خدا کا قانونِ ربوبیت تمام آفاقی قوتوں کو ساتھ لیے، جلوہ بار ہوگا۔

وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا (۸۹/۲۲)

تیرا رب اور فرشتے قطار در قطار آئیں گے۔

اور اس طرح

وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا (۳۹/۶۹)

زمین اپنے ربوبیت عطا کرنے والے کے نور سے جگمگا اُٹھے گی۔

اور تمام حمد و ستائش، خدا کی ربوبیتِ عامہ کے لئے وقف ہو جائے گی۔ اور انسان پکار اٹھے گا کہ

فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۴۵/۳۶)

تمام حمد و ستائش اس اللہ کے لئے ہے جس کی ربوبیت کا ظہور کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہو رہا ہے

اور جس کی ربوبیت کا نور تمام اقوام عالم میں جگمگا رہا ہے۔

اس وقت کبریائی اسی کے نظام کے لئے ہو گی۔ (وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۴۵/۳۷)

اور اس وقت یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ قرآن نے کس طرح کہا تھا کہ یہ نظام، تمام نظامِ عالم پر غالب آجائے گا (لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ) اور اس حتم و یقین کے ساتھ کہا تھا جسے صرف وحی کی زبان ہی کہہ سکتی ہے۔ سورۂ یونس کی اس آیت کو دیکھئے اور پھر سوچئے کہ دنیا کی کوئی آواز بھی اس یقین کے ساتھ ایسا اعلان کر سکتی تھی؟ فرمایا:

وَيَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ؕ قُلْ اِيْ وَرَبِّيْۤ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ؕ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ (۱۰/۵۳)

یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ جس انقلاب کی بابت تم ہم سے دن رات کہتے رہتے ہو، کیا وہ سچ مچ واقعہ ہو کر رہے گا؟

ان سے کہو کہ ہاں! میرے خدا کا قانونِ ربوبیت اس پر شاہد ہے کہ وہ انقلاب واقعہ ہو کر رہے گا۔ تم اس کے قانون کو شکست نہیں دے سکتے۔ تم اس انقلاب کو روک نہیں سکتے۔ یہ واقعہ ہو کر رہے گا۔

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے

یہ جہاں معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

یہی وہ معاشرہ ہے جس کے متعلق برگساں نے کہا ہے کہ وہ

ہر وقت آگے بھی بڑھتا رہتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اپنا توازن بھی قائم رکھے جاتا ہے۔

(Creative Evolution)

یہ معاشرہ آگے بڑھے گا کیونکہ یہ اس خدا کی صفات کا مظہر ہوگا جو خود صراطِ مستقیم پہ جا رہا ہے (11/56) اور ذی المعارج (بلندیوں کی طرف جانے والا (3/70)) ہے۔ اور اپنے توازن کو اس لئے قائم رکھے گا کہ اس خدا کی صفات (اسماء حسنیٰ) پورا تناسب رکھے ہوئے ہیں۔

بابُ یازدہم

حرفِ آخر

کس نباشد در جہاں محتاج کس
نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

گذشتہ اوراق میں نظامِ ربوبیت کے تفصیلی گوشے پھیلی ہوئی شکل میں آپ کے سامنے آچکے ہیں۔ چونکہ پھیلی ہوئی تفاصیل، ذہنِ انسانی میں بالعموم ذرا دیر سے محفوظ ہوتی ہیں، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان تفاصیل کا ملخّص، سمٹی ہوئی شکل میں بھی پیش کر دیا جائے تاکہ جو کچھ کہا گیا ہے اس کا مفہوم، کتاب ختم ہونے سے پہلے پھر آپ کی نگاہوں کے سامنے آجائے۔ انسان، دو چیزوں کا نام ہے۔ ایک ہے اس کا جسم اور دوسری چیز ہے اس کی ذات، خودی انا، نفس۔ اس کا جسم طبعی قوانین کے مطابق کام کرتا ہے اور ایک دن، ان ہی قوانین کے مطابق ختم ہو جائے گا۔ لیکن اس کی ذات، نہ طبعی قوانین کے مطابق زندہ ہے اور نہ ہی طبعی قوانین کے مطابق اس کی موت واقع ہو گی۔ اس میں حیاتِ جاوداں کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے۔ لیکن زمان و مکان کے موجودہ تقاضوں کے مطابق، اسے اپنی توانائیوں کے اظہار اور انہیں بروئے کار لانے کے لئے جسم کی ضرورت ہے۔ لہٰذا انسان کے لئے تربیتِ ذات (یعنی اس کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما) کے لئے، جسم کی پرورش بھی ضروری ہے۔

جسم کی پرورش (حیوانی جبلت یا) عقل کے سپرد کی گئی ہے۔ اس کے لئے عقل اپنا فریضہ سمجھتی ہے کہ سامانِ زیست زیادہ سے زیادہ سمیٹے اور اسے جمع رکھے۔ یعنی عقل کا کام "لینا" ہے۔

لیکن انسانی ذات کی تربیت کے لئے قانون یہ ہے کہ وہ جس قدر اپنی قوتوں کو عام کردے گی، اسی قدر اس میں استحکام پیدا ہوگا۔ یعنی انسانی ذات کا کام "دینا" ہے۔

کشمکش لہٰذا عقل اور انسانی ذات کے تقاضوں میں تضاد ہے۔ اسی تضاد سے ان دونوں میں کشمکش پیدا ہوتی ہے۔ اس کشمکش کا حل انسانی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

ایک گروہ نے اس کا حل یہ سوچا کہ انسان اپنی توجہ صرف تربیتِ ذات پر مرکوز کردے اور عقل کے تقاضوں کو پامال کرتا جائے۔ اس نے کہا کہ تربیتِ ذات کا راز، جسم کے فنا کر دینے میں ہے۔ یہ گروہ روحانیین یا مذہب پرستوں کا گروہ کہلاتا ہے۔

دوسرے گروہ نے کہا کہ انسانی ذات کوئی چیز نہیں، انسانی زندگی کا مقصود، جسم کی پرورش ہے۔ اس لئے عقل کو اپنے فریضہ کی ادائیگی میں بیباک چھوڑ دینا چاہیئے۔ یہ گروہ مادئین یا میکانکی تصورِ حیات کے حاملین کا کہلاتا ہے۔

قرآن نے کہا کہ یہ دونوں نظریئے غلط ہیں۔ انہوں نے اس کشمکش کا جو حل تجویز کیا ہے، وہ غالبؔ کا شاعرانہ حل ہے جس میں اس نے اپنے محبوب سے کہا تھا کہ

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو؟

میں تمہیں اپنی طرف کھینچتا ہوں۔ تم کھنچ کر چلے آؤ۔ کشاکش ختم ہو جائے گی۔ یعنی ایک گروہ نے عقل سے کہہ دیا کہ تم جسم کے تقاضوں کا خیال چھوڑ دو، کشاکش ختم ہو جائے گی۔ دوسرے گروہ نے نفسِ انسانی سے کہہ دیا کہ تم اپنی ہستی کا تقاضا چھوڑ دو، کشاکش کا علاج ہو جائے گا۔ قرآن نے کہا کہ مفاہمت کا یہ طریق غلط ہے۔ سر درد کا علاج سر کے کاٹ دینے میں نہیں۔ انسانی ذات کو اپنی تربیت اور اپنی توانائیوں کے اظہار کے لئے جسم کی ضرورت ہے۔ اس لئے جسم کی پرورش اور نگہداشت کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری طرف اس نے کہا کہ اصل مقصود، انسانی ذات کی تربیت و استحکام ہے۔ جسم اس کا صرف ذریعہ ہے۔ ذریعہ کو مقصد بنا لینا اور اصل مقصد

کو نظر انداز کر دینا، حقیقت سے چشم پوشی اور بہت بڑی حماقت ہے۔ زندگی کا صحیح پروگرام یہ ہے کہ عقل کے تقاضے بھی پورے ہوتے رہیں اور اس کے ساتھ، تربیت و استحکام ذات کا مقصد عظیم بھی حاصل ہوتا چلا جائے۔ اقبال کے الفاظ ہیں۔

غربیاں را زیرکی سازِ حیات
شرقیاں را عشق رازِ کائنات

زیرکی از عشق گردد حق شناس
کارِ عشق از زیرکی محکم اساس

عشق چوں با زیرکی ہمبر شود
نقشبند عالمِ دیگر شود

خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنہ
عشق را با زیرکی آمیزدہ

قرآن کی ساری تعلیم کا ماحصل یہی ہے۔ یعنی ایسا پروگرام جس سے عقل کے تقاضے بھی پورے ہوتے جائیں اور اس کے ساتھ تربیت و استحکام ذات بھی سرانجام پاتی چلی جائے۔

قرآن نے کہا کہ جب تک افراد الگ الگ رہیں گے، ہر فرد کی عقل اپنے اپنے مفاد کے تحفظ کے لئے کوشاں رہے گی۔ اس کا لازمی نتیجہ باہمی مفاد کا تصادم فلہذا استقلِ مفاد ہے۔ اس تصادمِ مفاد کا حل یہ ہے کہ افراد کو اپنی ضروریاتِ

قرآنی نظام

زندگی کی بہم رسانی کی فکر آپ نہ ہو۔ تمام افراد کی ضروریاتِ زندگی (رزق) کی فراہمی کی ذمہ داری معاشرہ پر ہو۔ اس طرح تمام افرادِ معاشرہ ایک گھرانے کے فرد بن جائیں۔

آب و نان ماست از یک مائدہ
دودۂ آدم "کنفسٍ واحدہ"

ظاہر ہے کہ اس انداز پرورش کے لئے، رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت میں رہنے کی بجائے، معاشرہ کی تحویل میں رہیں گے۔ اس لئے اس نے کہہ دیا کہ "ارض" (سامانِ معیشت) پر انفرادی ملکیت نہیں ہو سکتی۔

حق زمیں را جز متاعِ ما نہ گفت
ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت

جب افرادِ معاشرہ کو ان کے اور ان کی اولاد کے سامانِ زیست کی طرف سے اس طرح بے فکر کر دیا گیا تو عقل کے تقاضوں کی تسکین ہو گئی۔ اب یہی عقل فردِ متعلقہ کے مفاد کے تحفظ میں ہراساں و پریشاں رہنے کی بجائے، انسانی ذات کے فیصلوں کو بروئے کار لانے کا ذریعہ بن گئی۔ یعنی اس طرح عقل "خود بیں" ہونے کی بجائے "جہاں بیں" ہو گئی۔ نبی اکرم کے ارشاد کے مطابق، اب "ابلیس مسلمان ہو گیا"۔ اب اس کا کام فرد کے مفاد کے تحفظ کی بجائے، پوری نوعِ انسانی کے مفاد کا تحفظ قرار پا گیا۔ اب انسانی ذات کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ رہی کہ وہ اپنی تمام توانائیوں کو "دینے" میں صرف کر دے۔ اب "لینے" کا سوال ہی باقی نہ رہا۔ "دینے" سے مراد یہ ہے کہ انسان کے تمام تخلیقی کارنامے اور ان کا ماحصل، دوسروں کی نشوونما اور ارتقائے انسانیت کے لئے عام ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ اس معاشرے میں افراد کی ذاتی ملکیت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ ہر فرد کی تمام ضروریاتِ زندگی کا کفیل معاشرہ ہوگا اور تمام افرادِ معاشرہ کی استعداد، بہبودِ کلی کے لئے وقف ہو گی۔

یہ ہے وہ پروگرام جس سے عقلِ انسانی کے تقاضے بھی پورے ہو جائیں گے اور تربیتِ ذات کا مقصدِ عظیم بھی حاصل ہو جائے گا۔

چونکہ انسانی ذات، صفاتِ خداوندی کی مظہر ہے اسلئے اس کی تربیت کے لئے اللہ کو بطورِ آئیڈیل سامنے رکھا جاتا ہے۔ یعنی یہ دیکھنے کے لئے کہ انسانی ذات کی تربیت کس حد تک ہو چکی ہے، یہ دیکھنا ہو گا کہ وہ کس حد تک صفاتِ خداوندی سے ہم آہنگ ہو چکی ہے۔ اس کا نام قرآن کی اصطلاح میں خدا کے رنگ

صبغتہ اللہ میں رنگے جانا ہے (صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۲/۱۳۸)

مردِ حق از حق بگیرد رنگ و بو

مردِ حق از حق پذیرد رنگ و بو

خدا کی ان صفات کا علم صرف بذریعہ وحی ہو سکتا ہے۔ قرآن میں ان صفات کا تفصیلی ذکر ہے، اس لئے تربیتِ ذاتِ انسانی کے پرکھنے کا معیار قرآن ہے۔

قرآن کا منتہیٰ اس قسم کے معاشرے کی تشکیل جس میں

(i) تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی کا کفیل خود معاشرہ ہو۔
(ii) کسی فرد کی ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہ ہو۔ اور اس طرح
(iii) عقل کے تقاضوں کی تسکین کے بعد انسان پورے جذب و انہماک سے نوعِ انسانی کی بہبود کی میں مصروف ہو جائے اور اس سے اس کی ذات کی تربیت و استحکام ہوتا جائے۔

قرآن کا منتہیٰ ہے۔ لیکن وہ اس منتہیٰ تک بتدریج پہنچاتا ہے۔ صدقہ و خیرات کی ترغیبات اور لین دین کے ضوابط اور وصیت و میراث کے متعلقہ احکام، اس عبوری دور سے متعلق ہیں، جس سے گزر کر منتہیٰ تک پہنچنا ہوتا ہے لیکن اس عبوری دور سے متعلق احکام اور پروگرام میں بھی ہر قدم کا رخ اسی منتہیٰ کی طرف اٹھتا ہے۔ اس طرح اس عبوری دور سے گزرتے گزرتے یہ معاشرہ از خود اس منتہیٰ تک جا پہنچتا ہے۔ یہ منتہیٰ خدا کی صفت ربّ العالمینی (تمام نوعِ انسانی کی ربوبیت) کا مظہرِ تامہ ہوگا۔ اس معاشرہ کے قیام کے لئے قرآن نے تفصیلی پروگرام بتا دیا ہے۔ اس کی بنیادی کڑی یہ ہے کہ انسان کو حتمی اور پختہ یقین ہو کہ

(i) انسانی زندگی جسم کی پرورش (مفادِ عاجلہ) تک محدود نہیں۔ نفسِ انسانی میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ حیاتِ جاوداں حاصل کرلے۔ اس لئے زندگی ایک جوئے رواں ہے جس کا خاتمہ موت کے ساتھ نہیں ہو جاتا۔ لہٰذا انسان کی نگاہ قریبی مفاد کے ساتھ مستقبل (آخرت) کی خوشگواریوں پر بھی رہنی چاہیئے۔
(ii) نفسِ انسانی صفاتِ خداوندی کا مظہر ہے۔ اس لئے اس کی تربیت (نشوونما) سے مفہوم یہ ہے کہ اس میں صفاتِ خداوندی (اسمار الحسنیٰ) کی نمود زیادہ سے زیادہ ہوتی جائے۔
(iii) نفسِ انسانی کی تربیت کا راز "دینے" میں ہے۔ یعنی اس میں کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو کس حد تک نوعِ انسانی کی عالمگیر ربوبیت اور حسنِ کائنات میں اضافہ کے لئے وقف کرتا ہے۔

جب افراد کے دل میں اس قسم کا یقین (ایمان) پختہ ہو جائے، تو اس کی زندگی کی تمام حرکات و سکنات سے اس کا مظاہرہ ہونا شروع ہو جاتا ہے اور اس سے معاشرہ میں ایسی فضا پیدا ہو جاتی ہے جس سے یہ سلسلہ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس قسم کی فضا پیدا کرنے کا نام (قرآن کی اصطلاح میں) قیامِ صلوٰۃ ہے۔ اس مقصد کے لئے ان افراد کے جو وقتی اجتماعات ہوں گے انہیں صلوٰۃ کا مؤقت فریضہ کہا گیا ہے۔

قیامِ صلوٰۃ کا لازمی نتیجہ "ایتائے زکوٰۃ" یعنی نوعِ انسانی کی نشوونما ہوگا۔ لہذا اس نظام کا نقطۂ ماسکہ ہے قیامِ صلوٰۃ وایتائے زکوٰۃ۔ یہی اسلام کا مفہوم ہے۔ لہذا اسلام کی رُو سے، وہی تصور، وہی نظریہ، وہی نظام قابلِ حمد وستائش ہے، جو قانونِ خداوندی کے مطابق، نوعِ انسانی کی عالمگیر ربوبیت کا کفیل ہے (الحمد للہ رب العالمین)

نبی اکرمؐ نے اپنے رفقاء کی جماعتؓ کی معیت میں عمر بھر کی مسلسل جدوجہد کے بعد اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، اس قرآنی نظام کو قائم فرمایا۔ لیکن بعد میں پھر وہی مفاد پرستانہ قوتیں غالب آگئیں اور یہ نظام نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اب یہی مسلک جسے مفاد پرستانہ قوتوں نے وضع کیا تھا۔ اسلام کے نام سے، صدیوں سے مسلمانوں کے ہاں رائج چلا آتا ہے۔ ہمارا مذہب پرست طبقہ اسی اسلام کا حامی اور علمبردار ہے اور اس کے پاس اس کی سند صرف یہ ہے کہ یہ ہمارے اسلاف سے ہم تک متوارث چلا آرہا ہے۔ حالانکہ دین کی سند قرآن ہے جس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے اور جو ہمارے پاس اسی شکل میں (حرفاً حرفاً) محفوظ ہے جس شکل میں اسے اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ کی وساطت سے نوعِ انسانی کو دیا تھا۔ مسلمانوں کی اس روش کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ خود بھی جہنم کے عذاب میں مبتلا ہیں اور ان کے ساتھ باقی دنیا بھی سکون ناآشنا۔

اس جہنمی حالت سے نکلنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ مسلمان اندھی تقلید چھوڑ کر، قرآن کے حقائق پر غور کرے اور سوچے کہ خدا کا ضابطہ کس قسم کا نظام قائم کرنے کے لئے آیا تھا اور ہم نے کیا کر رکھا ہے۔ اس طرح جنت سے نکلے ہوئے آدم کو پھر سے جنت مل سکتی ہے لیکن اگر مسلمانوں نے اپنا رخ نہ بدلا اور قرآن کے پروگرام کو اپنی زندگی کا لائحۂ عمل نہ بنایا، تو اس نظام کو کوئی اور قوم اپنا لے گی اور وہی کام جو ان کے ہاتھوں انجام پانا تھا، کسی اور کی وساطت سے تکمیل کو پہنچ جائے گا۔ خدا کا قانون، نہ کسی خاص قوم سے وابستہ ہے نہ کسی خاص ملک و وطن کی حدود میں مقید۔ وَللہ المشرق والمغرب ؎

محفلِ ما بے مے و بے ساقی است ساز قرآں را نواھا باقی است

زخمۂ ما بے اثر افتد اگر آسماں دارد ہزاراں زخمہ ور

ذکرِ حق از امتاں آمد غنی از زمان و از مکاں آمد غنی

ذکرِ حق از ذکر ہر ذاکر جداست　　احتیاج روم و شام اوراکجاست
حق اگر از پیش ما بردار دش　　پیش قومے دیگرے بگذار دش
ترسم از روزے کہ محرومش کنند
آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند

دیکھئے قرآن اس باب میں کس قدر واضح الفاظ میں تنبیہ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

هَاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (۴۷/۳۸)

تم وہ لوگ ہو جو اس ضابطہ پر ایمان کے مدعی ہو، جو تمہیں یہ کہتا ہے کہ تم اپنی کمائیوں کو نوعِ انسانی کے بہبود کُلی کے لئے کھلا رکھو۔

اور تم کیا کرتے ہو؟

فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ (۴۷/۳۸)

تم سب کچھ اپنے لئے سمیٹ کر رکھ لیتے ہو۔ یاد رکھو اس سے تم دوسروں کو محروم نہیں کرتے بلکہ خود اپنے آپ کو خدا کی نعمتوں سے محروم کرتے ہو۔

تم سمجھتے ہو کہ چونکہ تم خدا کے ضابطہ پر ایمان کے مدعی ہو اس لئے خدا اپنے اس ضابطہ کو بروئے کار لانے کے لئے تمہارا محتاج ہو چکا ہے یہ کس قدر غلط خیال ہے۔

وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ (۴۷/۳۸)

اللہ کا قانون تمہارا محتاج نہیں۔ تم اس کے محتاج ہو۔

اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ۔

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (۴۷/۳۸)

اگر تم اسی طرح اگریز کی راہیں تراشتے رہے تو وہ تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے آئے گا۔ اور وہ قوم تمہارے جیسی نہیں ہو گی۔

یہ ہے خدا کا اٹل قانون جو نہ کسی کی مقدس آرزوؤں کی رعایت کرتا ہے اور نہ ہی کسی کے فریبِ نفس سے دھوکا

کھاتا ہے۔

لَیْسَ بِاَمَانِیِّکُمْ وَلَآ اَمَانِیِّ اَھْلِ الْکِتٰبِ (۴/۱۲۳)

یہ نہ تو تمہاری آرزوؤں کے مطابق بدلتا ہے اور نہ ہی (تمہارے فریقِ مقابل) اہلِ کتاب کی آرزوؤں کے مطابق

اس کا قانون یہ ہے کہ

مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِہٖ وَلَا یَجِدْ لَہٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا (۴/۱۲۳)

جو قوم بھی ناہمواریاں پیدا کرنے والا پروگرام اختیار کرے گی، وہ اس کا نتیجہ بھگتے گی۔ خدا کے قانون کے علاوہ نہ اس کا کوئی حمایتی ہوگا نہ سرپرست۔

اس کے برعکس

وَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِکَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّۃَ وَلَا یُظْلَمُوْنَ نَقِیْرًا۔ (۴/۱۲۴)

جس قوم کے افراد (مرد ہوں یا عورت) خدا کے ضابطہ کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیتے ہوئے ہمواریاں پیدا کرنے والے پروگرام پر عمل پیرا ہوں گے، تو اس قوم کے حصے میں جنت آئے گی اور اس میں کسی قسم کی کمی نہیں کی جائے گی۔

اب تم خود ہی سمجھ لو کہ

وَمَنْ اَحْسَنُ دِیْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْھَہٗ لِلّٰہِ وَھُوَ مُحْسِنٌ .... (۴/۱۲۵)

اس سے بہتر نظامِ زندگی اور کس قوم کا ہوگا جو قانونِ خداوندی کے سامنے جھک جائے اور توازن بدوش پروگرام کو اپنا لائحہ عمل بنا لے۔

وَذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ۔ یہ ہے محکم اور متوازن نظامِ ربوبیتِ خداوندی۔

اس نظام سے جس قسم کا مثالی معاشرہ وجود میں آتا ہے اس کی تصویر اقبالؔ نے ان الفاظ میں کھینچی ہے ؎

ساکنانش در سخن شیریں چو نوش | خوب روی و نرم خوی و سادہ پوش

تکرشاں بے درد و سوزِ اکتساب | رازدانِ کیمیائے آفتاب
خدمتِ او مقصدِ علم و ہنر | کار ہا را کس نمی سنجد بہ زر
کس ز دینار و درم آگاہ نیست | ایں بتاں را در حرم ہا راہ نیست
سخت کش دہقاں، چراغش روشن است | از نہابِ دہ خدایاں ایمن است
اندراں عالم نہ لشکر نے قشون | نے کسے روزی خورد از کشت و خون
نے قلم در مرغدیں گیرد فروغ | از فنِ تحریر و تشہیر و دروغ
نے ببازاراں ز بے کاراں خروش | نے صداہائے گدایاں دردِ گوش

کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

قرآن اس کا نام "جنت کی زندگی" قرار دیتا ہے۔ اس زندگی میں بھی جنت اور بعد کی زندگی میں بھی جنت۔ اور یہی انسانی سعی و کاوش کا منتہیٰ ہے۔ طُوبیٰ لَھُمْ وَحُسْنُ مَآب۔ وہ جنتِ ارضی کی زندگی جس کے متعلق فرمایا کہ دَعْوٰھُمْ فِیْھَا سُبْحٰنَکَ اللّٰھُمَّ (۱۰/۱۰) اس معاشرہ میں ان لوگوں کا دعویٰ (Claim) یہ ہوگا کہ خدا کے قانون سے یہ بہت بعید ہے کہ وہ تعمیری نتائج پیدا کرنے والے اعمال کو ضائع کر دے اس لئے وہ اس یقینِ محکم کے ساتھ اس معاشرہ کی تنظیم اور نظامِ ربوبیت کی تشکیل میں ہمہ تن مصروف رہیں گے اس نظام کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ اس میں ہر فردِ معاشرہ دوسرے افراد کی تکمیلِ ذات کا آرزومند ہوگا وَتَحِیَّتُھُمْ فِیْھَا سَلٰمٌ (۱۰/۱۰) اور اس طرح آخرالامر ان کا دعوٰے (claim) بالکل حقیقت بن کر سامنے آجائے گا اور دنیا دیکھ لے گی کہ فی الواقعہ ہر قسم کی تحسین و ستائش کا مستحق یہی نظام ہے جو تمام نوعِ انسانی کی ربوبیت کا ذمہ دار ہے۔ وَآخِرُ دَعْوٰھُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۱۰/۱۰)

لیکن مجھے اس کا احساس ہے کہ مسلمان اس آواز پر بہت کم توجہ دے گا۔ اس کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہوگا کہ یہ بالکل نئی آواز ہے۔ یہ ایک "نیا دین" ہے۔ صدیوں کی محکومی اور تقلید سے مسلمان کی حالت یہ ہو چکی

اعتراض۔ یہ نئی آواز ہے؟ ہے کہ اس کے توائے فکر و عمل مفلوج ہو چکے ہیں۔ اس کے نزدیک وہی پامال راہیں پُرامن ہیں جن پر یہ سینکڑوں برس سے چلا آرہا ہے۔ نیا تصور نیا نظریہ، نئی روش، یعنی نُدرتِ فکر و عمل اس کے "مذہب" میں حرام ہے۔ ہر جدّت اس کے نزدیک بدعت ہے۔ ہر بدعت گمراہی اور ہر گمراہی جہنم کا موجب (کل بدعۃ ضلالۃ و کل ضلالۃ فی النار) حالانکہ زندہ قوموں کی شان یہ ہے۔

کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں

وہ زمانے کے نئے نئے تقاضوں کے مطابق اپنے معاشرے میں نت نئے اضافے کرتی جاتی ہیں اور اس طرح ندرتِ فکر و عمل سے دن بدن آگے بڑھتی جاتی ہیں لیکن وہی مسلمان جس کی کبھی یہ حالت تھی کہ

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان

"نئی بات" سے اس طرح ڈرتا اور سہم جاتا ہے جس طرح قفس کا خوگر پرندہ کھلی فضا سے گھبراتا ہے۔

لیکن "نئی" اور "پرانی" کا تصور بھی ایک عجیب چیز ہے! جو چیز آج نئی نظر آتی ہے جب وہ معاشرہ میں رائج ہو جاتی ہے تو کچھ وقت کے بعد وہی پرانی ہو جاتی ہے اور جو ابھی رائج نہیں ہوتی وہ نئی اور غیر مانوس نظر آتی ہے۔ آج ہمیں قرآنی نظامِ ربوبیت بالکل نیا اور غیر مانوس نظر آئے گا۔ لیکن ذرا سوچئے کہ قرآن نے کتنے ایسے تصورات پیش کئے تھے جو اس وقت دنیا کی نگاہوں میں بالکل نئے اور غیر مانوس تھے۔ لیکن جو آج ساری دنیا کا معمول بن چکے ہیں۔ کیا یہ تصور کہ بادشاہ کی حکومت بالکل غیر انسانی نظام ہے، اس وقت کی دنیا کے لئے ایک بالکل نئی بات نہ تھی! کیا یہ تصور کہ پیدائش کے اعتبار سے تمام انسان مساوی ہیں اور قبائل اور ورنوں (ذاتوں) کی تقسیم غیر انسانی ہے، بالکل نیا نظریہ نہیں تھا؟ کیا یہ عقیدہ کہ خدا اور بندے کے درمیان کسی پیشوا (priest) کی ضرورت نہیں، یکسر نیا عقیدہ نہیں تھا؟ کیا یہ تصور کہ قبائل اور اقوام کی تقسیم غیر انسانی ہے اس کی جگہ تمام نوعِ انسانی کو ایک برادری قرار دے کر ساری دنیا میں ایک ہی آئین رائج ہونا چاہیئے، یکسر نیا تصور نہیں تھا؟ لیکن دیکھئے کہ ان تمام "نئے" تصورات کو دنیا نے ایک ایک کر کے قبول کر لیا اور آج ان میں سے کوئی تصور بھی نیا اور غیر مانوس نہیں رہا، نہ مسلمانوں کے نزدیک اور نہ غیر مسلموں کے نزدیک۔ لیکن قرآن کے جن تصورات

کو ابھی دنیا نے اپنایا نہیں، وہ بالکل نئے اور غیر مانوس نظر آتے ہیں۔ اور اس لئے ناقابلِ قبول۔ ان ہی میں یہ تصور بھی ہے کہ ذاتی املاک کی بنیادوں پر معاشرہ، فساد کا موجب ہوتا ہے۔ معاشرہ کا صحیح نقشہ یہ ہے کہ تمام نوعِ انسانی کی ربوبیتِ عامہ کو مقصودِ حیات سمجھا جائے۔ اسے آج بالکل نیا اور غیر مانوس تصور سمجھا جاتا ہے اور اسی بناء پر ہماری طبائع اسے قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتیں۔ لیکن جب دنیا اسے بھی اپنا لے گی تو یہ تصور بھی زندگی کا معمول بن جائے گا۔

لیکن اس باب میں مسلمان کی حالت بڑی تاسف انگیز ہے۔ اس کا فریضہ یہ تھا کہ یہ زمانے کے تقاضوں کا انتظار کئے بغیر صحیح نظامِ زندگی کو خود بھی اختیار کرتا اور اسے دنیا کے سامنے بھی پیش کرتا۔ لیکن اس کے برعکس اس کی کیفیت یہ ہے کہ جب دنیا، زمانے کے تقاضوں (فطرت کے اشاروں) کے مطابق کسی قرآنی تصور کو اپنانے کا قصد کرتی ہے تو یہ سب سے پہلے اس کی مخالفت کرتا ہے اور جب اس کی مخالفت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے، اقوامِ عالم اسے اختیار کر لیتی ہیں تو پھر یہ بھی آہستہ آہستہ اُن کی تقلید میں، اس تصور کو قبول کر لیتا ہے۔ یعنی اس نے بہرحال تقلید کرنی ہے، امامت نہیں کرنی؛ ذرا غور کیجئے۔ کتنا عرصہ ہوا کہ مغرب نے فطرت کے اشاروں کے ماتحت، ملوکیت کے خلاف انقلابی آواز اٹھائی اور اپنے ہاں سے رفتہ رفتہ بادشاہوں کو ختم کر دیا۔ لیکن مسلمانوں نے اپنے بادشاہوں کو بدستور سر چڑھائے رکھا اور بدستور محراب و منبر سے ان کی تائید و نصرت کی دعائیں مانگتے رہے تا آنکہ زمانے کے شدید تقاضوں نے خود ان کی بادشاہتوں کا الٹنا شروع کر دیا۔

کتنا عرصہ ہوا کہ مغرب نے مذہبی پیشوائیت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور رفتہ رفتہ اپنے ہاں کی عملی زندگی سے اس غیر انسانی ادارے کو الگ کر دیا۔ لیکن مسلمان بدستور مُلّائی و پیری کی مسندوں کو بچھاتا رہا۔ اور اب تک بچھائے چلا جا رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اب زمانے کی تیز آندھیاں ان کھلی مسندوں کو خود تہ و بالا کر رہی ہیں۔

کتنا عرصہ ہوا کہ اقوامِ مغرب نے غلامی (Slavery) کو اپنے ہاں ممنوع قرار دیدیا۔ لیکن مسلمانوں کے ہاں یہ لعنت ابھی تک چلی آرہی ہے۔ اگرچہ اب دنیا کی ندامت کے خیال سے انہیں بھی اپنی اس روش پر کچھ جھینپ سی ضرور محسوس ہو رہی ہے۔

یہ حالت ہے اس قوم کی جسے خدا نے اقوامِ عالم کی امامت کے لئے آگے بڑھایا تھا لیکن اب کیفیت یہ ہے کہ

(جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) امامت تو ایک طرف، جب کوئی دوسری قوم قرآنی تصور کو اپنانے کا ارادہ کرتی ہے تو اس کی مخالفت سب سے پہلے مسلمان کی طرف سے ہوتی ہے۔ یہی حالت نزولِ قرآن کے وقت "اہلِ کتاب" کی تھی کیفیت یہ تھی کہ عرب کے کفار اور مشرکین تو قرآنی تصورات کو سننے کے لئے آمادہ ہو جاتے تھے لیکن یہ لوگ جو آسمانی کتاب کے حامل ہونے کے مدعی تھے، ان تصورات کی مخالفت میں پیش پیش رہتے تھے۔ اسی لئے قرآن کو ان سے کہنا پڑا کہ وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ (۲/۴۱) یہ تو کسی طرح بھی زیبا نہیں کہ اس کی مخالفت سب سے پہلے تمہاری طرف سے شروع ہو۔ اُن سے کہا گیا کہ تم یہ کہتے ہو کہ یہ بالکل نئے تصورات ہیں جنہیں قرآن پیش کرتا ہے۔ یہ نئے نہیں ہیں۔ إِنَّ هَٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ ۝ صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ (۸۷/۱۸-۱۹ نیز ۵۳/۳۶) جو صحائف قانون ان انبیاء کو دیئے گئے تھے (ابراہیم و موسیٰ) جن کے تم اپنے آپ کو متبع بتلاتے ہو یہ تصورات ان کے اندر بھی موجود تھے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ تم نے ان صحائف کو پسِ پشت ڈال دیا، اور مذہب اختیار کر لیا انسانوں کا خود ساختہ اس لئے اب تمہیں وہی تصورات بالکل نئے اور غیر مانوس نظر آتے ہیں۔

بعینہٖ آج یہی حالت مسلمانوں کی ہے۔ یہ تمام تصورات قرآن کے اندر موجود ہیں۔ لیکن چونکہ انہوں نے قرآن کو پسِ پشت ڈال دیا اور مذہب اختیار کر لیا انسانوں کا خود ساختہ۔ اس لئے اب انہیں یہ تمام تصورات نئے نئے دکھائی دے رہے ہیں اور اس لئے ان کی مخالفت سب سے پہلے ان ہی کی طرف سے شروع ہو جاتی ہے۔

یہ بھی کہا جائے گا کہ قرآن کی یہ تعبیر، روس کی اشتراکیت سے متاثر ہو کر کی گئی ہے۔ جہاں تک "متاثر ہونے" کا تعلق ہے، قرآن کے ایک بنیادی اصول کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ قرآن وہ ضابطۂ حیات ہے جو خدا کی طرف سے تمام نوعِ انسانی کے لئے، قیامت تک کے لئے، مکمل اور غیر متبدل شکل میں دے دیا گیا ہے انسانی معاشرہ کی کوئی ضرورت اور زندگی کا کوئی تقاضا ایسا نہیں جس کے لئے اس میں راہنمائی موجود نہ ہو۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ معاشرہ کی تمام ضرورتیں اور زندگی کے تمام تقاضے سب کے سب، ایک ہی دور میں اُبھر کر سامنے نہیں آ جاتے۔ جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا جاتا ہے، زندگی کے مختلف تقاضے نکھر کر سامنے آتے جاتے ہیں۔ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ جس تقاضے کو کسی پچھلے دور میں کوئی خاص اہمیت حاصل نہ تھی، وہی تقاضا

بعد کے دور میں زندگی کا سب سے بڑا اور عالمگیر تقاضا بن گیا۔ لہٰذا قرآنی راہ نمائی کی صورت یہ ہے کہ زندگی کا جو تقاضا اہمیت اختیار کرتا ہے، اس کے متعلق قرآنی راہ نمائی، اربابِ فکر و نظر کے سامنے نمایاں ہو کر آجاتی ہے۔ قرآن میں ہے (سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۵۳/۴۱)۔ "ہم (اربابِ علم و بصیرت کو) خود ان کی اپنی قوم میں اور بین الاقوامی (آفاق[۱])، زندگی کے تغیرات میں اپنی نشانیاں دکھاتے چلے جائیں گے، تا آنکہ (رفتہ رفتہ) یہ چیز ان پر آشکار ہو جائے کہ قرآن کا قانون فی الواقعہ ایک ٹھوس تعمیری نتیجہ برآمد کرنے کا پروگرام دیتا ہے"۔ یہ "نشانیاں" جن سے قرآن کا ایک ایک قانون، حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آجاتا ہے، قوموں کی الگ الگ اور بین الاقوامی زندگی کے تمدنی، عمرانی اور نفسیاتی تغیرات ہیں جنہیں زمانے کے تقاضے یا فطرت کے اشارے کہا جاتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست		عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست
بندۂ مومن ز آیاتِ خداست		ہر جہاں اندر برِ او چوں قباست
چوں کہن گردد جہانے در برش		می دہد قرآں جہانے دیگرش

بنا بریں، اگر اپنے زمانے کے تقاضوں کی حل طلبی کے لئے قرآن میں غور و فکر کرنا جرم ہے تو پھر قرآن میں چھپی ہوئی حقیقتیں ابھر کر کبھی سامنے نہیں آسکتیں! ہمارا زمانہ عصرِ معیشت (Age of Economics) کہلاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کے مذکورہ صدر اصول کے مطابق، اس زمانے کے رجحانات خود اس کے متقاضی تھے کہ قرآن میں غور کرنے سے اس کا نظامِ ربوبیت ابھر کر سامنے آجاتا اور اس طرح اس کی مستور حقیقت مشہود بن جاتی ہے۔

باقی رہا یہ کہنا کہ قرآن کی یہ تعبیر، روس کی اشتراکیت سے متاثر ہو کر کی گئی ہے۔ سو اس قسم کی سطحی بات وہی کہہ سکتا ہے جس نے نہ روس کی اشتراکیت کا غائر نظر سے مطالعہ کیا ہو اور نہ ہی قرآن کے نظامِ ربوبیت کا۔

---

[۱] "آفاق" سے خارجی کائنات اور "انفس" انسان کی داخلی دنیا بھی مراد لیجا سکتی ہے لیکن انسان کے سامنے جو تغیرات زیادہ محسوس مرئی شکل میں آتے ہیں وہ قومی اور بین الاقوامی تمدن کی زندگی کے تغیرات ہوتے ہیں، اس لئے میں نے اس مفہوم کو ترجیح دی ہے۔ بات دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے۔

جس نے ان دونوں نظاموں زندگی کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے، وہ جانتا ہے کہ یہ دونوں نظام، اپنی اصل وبنیاد کے اعتبار سے کس قدر باہمدگر مختلف اور متغائر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں شروع سے، قرآنی نظام ربوبیت کو پیش کرنے کے ساتھ کمیونزم کا تجزیہ بھی کرتا چلا آرہا ہوں تاکہ سطح بیں نگاہوں کو یہ دھوکا نہ ہو جائے کہ اصل کے اعتبار سے یہ دونوں ایک ہیں۔ (اس کی تفصیل کے لئے میری کتاب "سلیم کے نام خطوط" دیکھئے جن میں کمیونزم پر تفصیلی بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ قرآنی تصورِ حیات کے کس قدر خلاف ہے)۔ جیسا کہ میں اس کتاب سلیم کے نام خطوط میں وضاحت سے لکھ چکا ہوں اور جسے میں نے گذشتہ اوراق میں مختصر الفاظ میں دہرایا ہے، کمیونزم اس مسئلہ کے حل کی تلاش میں ضرور نکلی لیکن اس تلاش میں اس کی کیفیت یہ ہو گئی کہ

خواستم پیکاں برآرم، در جگر نشتر شکست

وہ چلی تھی جنت کی تلاش میں لیکن انسانیت کو لے گئی جہنم کی طرف۔ اس کی بنیادی غلطی یہ تھی (اور یہ لازمی نتیجہ تھا، میکانکی تصورِ حیات کا جو مارکس کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا) کہ اس نے انسان کا سارا مسئلہ "روٹی" میں محدود کر کے رکھدیا۔ اس نظریہ کے ماتحت انسان، "ریل کا انجن" بن کر رہ گیا کہ اس کے پیٹ میں ایندھن اور حلق میں پانی ڈال دیجئے تو اس کے سارے تقاضے پورے ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد ریلوے کا آفیسر اسے جس پٹڑی پر جی چاہے ڈال دے وہ ڈرائیور کے اشاروں پر اندھوں کی طرح دوڑتا چلا جائے گا۔ نہ اسے یہ معلوم ہوگا کہ میں کیوں دوڑ رہا ہوں نہ اس کی زندگی کا کوئی اپنا مقصد ہوگا نہ منزل۔ نہ کوئی اختیار ہوگا نہ ارادہ۔ عمر بھر دوسروں کی بچھائی ہوئی پٹڑیوں پر، دوسروں کے اشاروں کے مطابق دوڑتے رہے اور جب دوڑتے دوڑتے دم توڑ دیا تو اس انجن کی جگہ ایک اور انجن آگیا اور اس ساری تگ و تاز کی قیمت وہ ایندھن جو اس کے پیٹ میں ڈالا گیا اور وہ پانی جو اس کے حلق میں ٹپکایا گیا۔ اس نظریۂ حیات کے ماتحت، انسان، انسان رہتا ہی نہیں، مشین کے پُرزے بن جاتا ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ایک جیتے جاگتے صاحب اختیار و ارادہ انسان کو مشین کا پرزہ یا ریل کا انجن بنانے کے لئے کس قدر استبداد کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہذا کمیونزم استبداد کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل سکتی۔ اس مقصد کے لئے کمیونزم کے پاس دو حربے ہیں۔ پہلا یہ کہ موجودہ نسل کے انسانوں کو آہنی شکنجوں میں اس طرح جکڑے رکھا جائے کہ وہ اپنی مرضی سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر نہ ہل سکیں۔ اور دوسرا حربہ یہ کہ آنے والی نسل کو تعلیم اس انداز کی دی جائے کہ وہ اُبھریں ہی (انسانوں کی بجائے) مشین کے پُرزے بن کر

ان میں اپنی انفرادیت اور اختیار وارادے کا احساس ہی باقی نہ رہے۔

یہ ہے وہ قیمت جو کمیونزم، انسان سے روٹی کے بدلے میں وصول کرتی ہے۔ یعنی

این خدا نانے دہد، جانے بُرد

روٹی دیتی ہے اور جان لے لیتی ہے!!

اس کی وجہ یہ نہیں کہ مارکس یا اس کے دیگر رفقائے کار یہ چاہتے تھے کہ غریبوں اور مزدوروں کو روٹی کا لالچ بکر ان کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بات تنہا عقل کے بس کی ہے ہی نہیں کہ وہ کوئی ایسا نظام زندگی سوچ سکے جو انسانی زندگی کے تمام تقاضوں کو (جو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح گتھے ہوئے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے الگ کیا ہی نہیں جا سکتا) حسن کارانہ توازن کے ساتھ پورا کرتا جائے۔ تنہا عقل' انسان کے مختلف گوشوں کو دیکھ سکتی ہے۔ وہ انسان کو تماماً (As a whole) دیکھ ہی نہیں سکتی۔ اس لئے جب وہ اس کا ایک تقاضا پورا کرنے کی کوشش کرے گی تو سو تقاضوں کا گلا گھٹ جائے گا۔ اس کے برعکس وحی انسان کو تماماً دیکھتی ہے۔ اس لئے اس کی رُو سے دیا ہوا نظام انسانی زندگی کے تمام تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے۔ انسان کی شکل یہ نہیں رہی کہ وہ زندگی کے تقاضوں سے واقف نہیں تھا۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں اس کی زندگی کے مختلف تقاضے اُبھر کر سامنے آتے رہے اس لئے اگر ان پنکھڑیوں کو جو شاہراہِ تاریخ پر بکھری پڑی ہیں، اکٹھا کر لیا جائے تو انسانی زندگی کے تقاضوں کا اچھا خاصا مجموعہ ہاتھ آ سکتا ہے۔ لیکن اس کی شکل یہ رہی ہے کہ وہ تنہا عقل کی رو سے کسی ایسے نظام کا سراغ نہیں پا سکا جس میں ان تمام تقاضوں کی تسکین کا سامان فراہم ہو جائے۔ قرآن نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں ایک ایسی حقیقت کا پتہ دیتا ہوں جو اس سے پہلے تم میں سے کسی کو معلوم نہیں۔ اس نے یہ کہا ہے کہ میں ایک ایسا نظام بتاتا ہوں جو ان تمام حقیقتوں کو سچا کر کے دکھائے گا جو تمہارے پاس موجود ہیں (مصدق لما معکم) انسان کو ایک ایسے ہی نظام کی تلاش تھی اور اس تلاش میں وہ بری طرح ناکام رہا تھا۔ یہ نظام قرآن نے دیا اور اس دعوے کے ساتھ دیا کہ اس کی مثیل و نظیر پیدا کرنا انسانی عقل کے بس کی بات ہی نہیں۔ یہی وہ نظام ہے جس میں ہر فرد معاشرہ کی انفرادیت کی تربیت اور اس کی ذات کی تکمیل ہوتی ہے اور یہی مقصودِ انسانیت ہے۔ یہ نظام قرآن کے علاوہ کہیں نہیں ملیگا۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی فکر' زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر' صحیح راستہ کی تلاش میں ہاتھ پاؤں ضرور مارتی ہو

لیکن وہ فوراً اس راستہ تک نہیں جا پہنچتی۔ اس کے سامنے صرف پگڈنڈیاں آتی ہیں جو بڑے پیچ وخم کھاتیں، کوہ و دریا کو عبور کرتیں، بڑے بڑے دشوار گزار مراحل طے کرتیں، مختلف تجارب کے بعد، زندگی کی متوازن شاہراہ (صراطِ مستقیم) میں جا کر ملتی ہیں۔ اور یہ کچھ بھی زندگی کے کسی ایک تقاضے کے متعلق ہوتا ہے تمام تر (As a Whole) نہیں ہوتا۔ برعکس اس کے وحی کی راہ نمائی زندگی کے تمام تقاضوں کو سامنے رکھتی ہے اور انسان کو براہ راست صراطِ مستقیم پر لے جاتی ہے جس سے وہ راستے کی پرپیچ فضاؤں سے (جن میں کھو جانے کا ہمیشہ خطرہ ہوتا ہے) محفوظ و مصئون نکل جاتا ہے (لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ) یہی وجہ ہے کہ فکرِ انسانی نے زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر جو راستے اختیار کئے ان میں حق و باطل ملے جلے رہے۔ حق متمیز ہو کر سامنے نہیں آیا۔ مثلاً روسو اور اس کے رفقاء کی فکر نے ملوکیت سے ابار کر کے جمہوریت کا تصور تلاش کیا تو ان کی یہ کوشش غلط راستے سے صحیح راستے کی طرف ایک قدم ضرور تھی۔ لیکن ان کی جمہوریت انہیں اس مقام تک نہ پہنچا سکی جو وحی کی راہ نمائی سے مل سکتا تھا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ مغرب، باہمہ ادعائے جمہوریت، ابھی تک انسانیت کی صحیح جمہوریت سے دور ہے اور مختلف تجربہ گاہوں سے گزر رہا ہے۔ اگر اس وقت زمانے کے تقاضوں کے پیشِ نظر روسو کی بجائے کوئی ایسا صاحبِ فکر آگے بڑھتا جو قرآن کی روشنی میں نشانِ منزل متعین کرتا، تو دنیا ایک ہی قدم میں صحیح راستہ پر بھی جا پہنچتی اور زندگی کے دوسرے تقاضے جو اس وقت جمہوریت کے غلط تصور کی بھینٹ چڑھ رہے ہیں، ساتھ کے ساتھ پورے ہو جاتے۔

اسی طرح عصرِ حاضر کے تقاضوں سے مجبور ہو کر، مارکس اور اس کے رفقاء نے بھی صحیح راستے کی تلاش کی کوشش کی اور ان کی فکر انہیں راستے کا دھندلا سا تصور دے سکی۔ لیکن صراطِ مستقیم (زندگی کی متوازن راہ) نکھر کر اُن کے سامنے نہ آسکی۔ ان کی نگاہیں "مساواتِ شکم" میں الجھ کر رہ گئیں، انسانی ذات کے غیر متناہی تقاضوں کو بے نقاب نہ دیکھ سکیں۔ اگر اُس وقت ان کی جگہ کوئی ایسی فکر آگے بڑھتی جو قرآن کی روشنی میں اس مسئلہ کا حل طلب کرتی تو دنیا اس وقت تک کبھی کی، نظامِ ربوبیت کو اختیار کر چکی ہوتی۔ یہ کام مسلمانوں کے کرنے کا تھا جو اپنی بغل میں خدا کی

ؔ اس لئے قرآن میں ہے کہ وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (۲۹/۶۹) جو لوگ ہمارے قانون کی تلاش میں جدوجہد کرتے ہیں ہم انہیں اپنے رستوں کی طرف راہ نمائی دے دیتے ہیں۔

زندہ کتاب رکھتے ہیں۔ لیکن اگر مسلمان وحی کی روشنی میں دنیا کی راہ نمائی نہ کریں تو نوعِ انسانی کے لئے اس کے سوا چارہ کیا ہے کہ وہ اپنی کوششوں سے راستے کا سراغ لگاتی رہے۔ اس کی یہ کوشش بہرحال، اس قوم کی روش سے تو بہتر ہے جو نہ خدا کی وحی سے کام لے اور نہ ہی عقل کی روشنی سے۔

لیکن جب خدا کی وحی سامنے آجائے تو پھر عقلِ سلیم کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اپنی حدود (Limitations) کا اعتراف کرکے، وحی کی راہ نمائی میں صراطِ مستقیم پر چل نکلے۔ اس کی یہ روش، انسانیت کو اس جنت کی طرف لیجائیگی جس کی بہاروں پر کبھی خزاں نہیں آسکتی (تجری من تحتہا الانھرُ) اور جس میں پہنچکر انسان کو کسی قسم کا خوف وحزن باقی نہیں رہ سکتا۔

ہیں نے یہ کوشش کی ہے کہ قرآن جس نظام کو انسانی زندگی کے تقاضوں کے لئے بطور ایک مکمل حل کے تجویز کرتا ہے، اسے عصرِ حاضر کے انسان کے سامنے پیش کردوں، اس امید کے ساتھ کہ وہ اپنے ذاتی امیال وعواطف سے الگ ہٹ کر، علمی بصیرت اور تاریخی شواہد کی روشنی میں اس پر غور کرے۔ اور اس طرح اگر وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس میں واقعی انسانیت کے مصائب کا حل پوشیدہ ہے تو اس پر عملاً تجربہ کرے۔ اس لئے کہ کسی نظام کے نتائج مشہود شکل میں کبھی سامنے نہیں آسکتے جب تک اس پر عملاً تجربہ نہ کیا جائے۔ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ میرے پیش کردہ نظام کو عملاً آزما کر دیکھو۔ اس کے نتائج میرے دعوے کی صداقت کی دلیل بن جائیں گے۔

قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ میری دعوت کے مخاطب صرف وہی لوگ ہوسکتے ہیں جن میں زندگی کی رمق موجود ہے (لتنذر من کان حیًا) جن میں زندگی کی حرارت باقی نہیں وہ اس کے نزدیک درخورِ تخاطب ہی نہیں ہیں۔ اس لئے جس نظامِ ربوبیت کا خاکہ اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے اس کے حیات آفریں ممکنات کا اندازہ وہی لوگ کرسکیں گے جن کے قلوب میں زندہ رہنے کا ولولہ، جن کے بازوؤں میں زندگی بخش خون، اور جن کی نگاہوں میں زندگی کو مشہود دیکھنے کی آرزو ہوگی۔ جو چلتی پھرتی لاشیں، زندگی اور اس کی توانائیوں سے محروم ہوکر راکھ کا ڈھیر بن چکی ہیں، اُن سے نہ تو قرآن کا تخاطب ہے اور نہ ہی مجھے کوئی توقع۔ قرآن کا تو پیغام یہ ہے کہ

اگر یک قطرہ خوں داری، اگر مشتِ پرے داری
بیا من با تو آموزم طریقِ شاہبازی را

جیساکہ پہلے لکھا جا چکا ہے، قرآن نہایت شد و مد سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ آخر کار نوعِ انسانی کے معاشرے کو اِن ہی خطوط پر متشکل ہو کر رہنا ہے جو اس نے تجویز کی ہیں۔ یہ فطرت کا اٹل فیصلہ ہے جسے واقعہ ہو کر رہنا ہے۔ جو بڑی بڑی طاقتیں اس نظام ربوبیت کی راہ میں حائل ہوں گی انہیں اس طرح راستے سے ہٹا دیا جائے گا جس طرح تیز و تند ہوا بڑے بڑے تناور درختوں کو جڑ سے اکھیڑ کر پر کاہ کی طرح اڑا دیتی ہے (وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا (20/105)) اور اس کے بعد میدان بالکل صاف ہو جاتا ہے (فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا (20/106)) جس میں نہ کسی قسم کا ٹیڑھا پن باقی رہتا ہے نہ اونچ نیچ (لَا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا (20/107)) ان سے اس طرح میدان صاف کر دینے کے بعد انسانیت کا وہ گروہ عظیم جو آج تک اس بُری طرح سے کچلا جا رہا ہے اُبھر کر اوپر آجائے گا۔ (وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً (18/47)) اس لئے کہ اس ربوبیتِ عامہ کی رو سے اس کی دبی ہوئی صلاحیتیں اور چھپے ہوئے جوہر پوری پوری نشو و نما پا کر مشہود ہو جائیں گے اور یوں نوعِ انسانی اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جائے گی۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ انقلابِ عظیم واقعہ ہو کر رہے گا۔

مندرجہ بالا الفاظ کو پھر دُہرائیے کہ یہ انقلاب عظیم واقعہ ہو کر رہے گا۔ ان الفاظ کو آپ اس سے پہلے بھی کئی ایک مقامات پر دیکھ چکے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسی قوت ہے جس کی بنا پر یہ انقلاب واقعہ ہو کر رہے گا؟

قوت کونسی ہے؟ اس کا جواب عام طور پر تو یہی دیا جائے گا کہ یہ سب کچھ اللہ کی قدرت سے ہو گا۔ وہ بڑا قادر و توانا ہے۔ ہر شے اس کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ اس کے حضور کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں۔ اس لئے جب اُس خدا نے کہدیا ہے کہ ایسا ہو کر رہے گا تو ضرور ایسا ہو کر رہے گا۔

یہ درست ہے کہ خدا بڑی قدرتوں کا مالک ہے اور کسی کی مجال نہیں کہ اس کے ارادے اور فیصلے کے سامنے رکاوٹ بن کر کھڑا ہو جائے۔ لیکن اللہ نے خود ہی بتا دیا ہے کہ ہماری اس قدرت اور قوت کا ظہور یونہی ہنگامی طور پر نہیں ہوتا بلکہ ایک قاعدے اور ضابطے کے مطابق ہوتا ہے۔ اسی کو ہم نے (گذشتہ صفحات میں) قانونِ خداوندی سے تعبیر کیا ہے۔ لہٰذا یہ انقلاب قانونِ خدا کی قوت سے ظہور میں آئے گا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم لوگ بہت کم سمجھتے ہیں کہ قانون میں کتنی بڑی قوت ہوتی ہے۔ اوّل تو جب ہم قانون کا لفظ بولتے ہیں

تو ہماری نگاہ عدالتوں کی طرف اٹھ جاتی ہے کیونکہ ہم نے قانون کا لفظ عدالتوں ہی کے ضمن میں سُنا ہے لیکن قانون

قانون کی قوت

(Law) عدالتوں تک محدود نہیں۔ یہ ساری کائنات کو محیط ہے۔ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے قانون کے تابع ہو رہا ہے۔ یہ بڑے بڑے اجرام فلکی اس فضائے بیکراں کی پہنائیوں میں جس نظم و ضبط کے ساتھ تیرتے پھر رہے ہیں، یہ سب قانون کی قوت سے ہے۔ سورج اسی کے زور پر ٹھیک اپنے وقت پر نکلتا اور ایک خاص راستہ طے کرتا ہوا اپنے وقت پر غروب ہو جاتا ہے۔ چاند، اسی کی قوت سے بڑھنے اور سمٹنے کی منزلیں طے کرتا رہتا ہے۔ سمندر میں مدوجزر اسی کی قوت سے واقع ہوتا ہے۔ عظیم الجثہ جہاز اتنا اتنا بوجھ لیکر سینۂ بحر پر بطہ کی طرح اسی کے بل بوتے پر تیرتے پھرتے ہیں۔ ہوائیں اسی کے زور سے چلتی ہیں۔ بارش اسی کی قوت سے برستی ہے ننھے ننھے بیجوں سے شاہ بلوط جیسے تناور درخت قانون ہی کے زور سے اُبھرتے ہیں۔ کھیتیاں اسی کی قوت سے پروان چڑھتی اور وجۂ زیست بنتی ہیں۔ دھوئیں کا انجن جو اتنی اتنی لمبی گاڑیوں کو پرِکاہ کی طرح اُڑائے پھرتا ہے، تو یہ بھی قانون ہی کے زور سے ہوتا ہے۔ بجلی جس نے آج روئے زمین کا نقشہ بدل دیا ہے، قانون ہی کی قوت سے حرکت اور روشنی پیدا کرتی ہے۔ خود انسان کی طبعی زندگی، جو حسن کائنات میں اس قدر رنگ و بو پیدا کرتی رہتی ہے، قانون ہی کے زور پر قائم ہے۔ بغرضیکہ اس پوری کائنات میں قانونِ خداوندی ہی کی کارفرمائی اور اسی کی کبریائی ہے۔ قانون کے معنی ہیں (What Follows What) یعنی فلاں کام کا نتیجہ کیا ہوگا؟ جو شخص کائناتی قانون کو سمجھتا ہے وہ پورے حتم و یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ فلاں بات کا نتیجہ یہ ہوگا۔ جو ڈاکٹر مرض کی صحیح تشخیص کر لیتا ہے اور اسے اپنی دوائی کی صحت پر بھی اعتماد ہوتا ہے، وہ پورے زور سے کہہ دیتا ہے کہ یہ دوائی دو۔ گھنٹہ بھر کے بعد بخار اُتر جائے گا۔ یعنی وہ کہہ سکتا ہے کہ "ایسا ہو کر رہے گا"۔ اس لئے کہ اُسے

ایسا ہو کر رہے گا

خُدا کے قانون طبعی پر یقین ہے۔ ایک ماہر فلکیات پورے یقین کے ساتھ کہہ دیتا ہے کہ آج سے سو سال کے بعد فلاں دن فلاں وقت سورج گہن میں آجائے گا۔ اسے قانون فلکیات پر ایسا یقین ہے کہ وہ ساری دنیا کو چیلنج دے کر کہہ دیتا ہے کہ "ایسا ہو کر رہے گا"، دُور کیوں جایئے! جب ہم انگیٹھی میں کوئلہ سلگا کر اس پر پانی کی دیگچی رکھ دیتے ہیں تو پھر کس یقین کے ساتھ کہہ دیتے ہیں کہ دس منٹ میں چائے تیار ہو جائے گی اور چائے تیار ہو کر رہتی ہے۔ یہ ہے قانون کی قوت!!

قرآن یہ کہتا ہے کہ جس طرح خدا کا قانون، خارجی کائنات میں جاری و ساری ہے اسی طرح اس کا قانون خود انسانوں کی تمدنی اور معاشرتی دنیا میں بھی کارفرما ہے۔ یہ ہے وہ مقام جہاں سے ایک "مومن" اور "کافر" کا فرق شروع ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عام لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ اسے تو مانتے ہیں کہ کائنات میں ایک خارجی قانون جاری و ساری ہے لیکن جب وہ انسانوں کی دنیا میں آتے ہیں تو یہاں کسی خارجی قانون

کائناتی قانون

کو تسلیم نہیں کرتے۔ خارجی قانون کا مطلب یہ ہے کہ وہ قانون خود ان چیزوں کا پیدا کردہ نہیں ہوتا۔ ان پر خارج سے وارد ہوتا ہے۔ مثلاً یہ قانون کہ پانی اتنی حرارت کے بعد بھاپ بن جائے گا خود پانی کا اپنا تجویز کردہ نہیں کوئی خارجی قوت ہے جس نے یہ قانون پانی کے لئے تجویز کر رکھا ہے یہ لوگ اشیائے کائنات کے لئے تو اس قسم کا قانون تسلیم کرتے ہیں لیکن انسانوں کی دنیا میں اس قسم کا قانون نہیں مانتے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ انسانوں کو خود حق حاصل ہے کہ وہ اپنے لئے آپ قانون تجویز کریں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ ان لوگوں کی بھول ہے وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ۔

انسانوں کی دنیا میں قانون

اگر تو اُن سے پوچھے کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو کس نے پیدا کیا اور کس کا قانون ہے جو سورج اور چاند کو اس طرح مسخر کئے ہوئے ہے۔ تو یہ بلا تامل کہدیں گے کہ یہ سب خدا کے قانون سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ ان سے کہو کہ جب تم خارجی کائنات میں ایسے قانون کو تسلیم کرتے ہو تو انسان کی معاشرتی اور معاشی دنیا میں قانون کے لئے کسی اور طرف کیوں دیکھنے لگ جاتے ہو؟ (فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۲۹/۶۱) اور اسے کیوں نہیں مانتے کہ (اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ۲۹/۶۲) سامانِ زیست کی فراوانی اور تنگی بھی، انسانوں کے خودساختہ قانون کی رُو سے نہیں، بلکہ اُسی خدا کے قانون کی رُو سے واقع ہوتی ہے جس کا قانون کائنات میں، بایں ہمہ جلال و جبروت کارفرما ہے؟ ان لوگوں کو، جو خارجی کائنات میں خدا کے قانون کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن انسان کی معاشی اور تمدنی دنیا میں کسی قانون کو نہیں مانتے، قرآن کافر کہہ کر پکارتا ہے۔ اور جو لوگ انسان کی معاشی اور تمدنی دنیا میں انسانوں کے خودساختہ قانون کو مانتے ہیں وہ انہیں مشرک قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اشیائے کائنات مجبور و مقہور ہیں۔ انہیں کسی قسم کا اختیار و ارادہ حاصل نہیں اس لئے

وہ تو خارجی قانون کے تابع فرمان رکھی جاسکتی ہیں لیکن انسان خود بڑی قوتوں کا مالک ہے اس لئے اس پر کس کا قانون چل سکتا ہے؟ لیکن یہ ان کی غلط فہمی ہے۔ لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ (۴۰/۵۷) حقیقت یہ ہے کہ کائناتی نظام کو پیدا کرنا اور اس میں ترتیب و تنظیم رکھنا، انسانی گروہ کی پیدائش کے مقابلہ میں بہت بڑی بات ہے۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۴۰/۵۷) لیکن اکثر انسان اس حقیقت کا علم نہیں رکھتے۔ انہی کے متعلق وہ کہتا ہے کہ (اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ۲۱/۲۱) کیا ان لوگوں نے اپنی تمدنی اور معاشی زندگی کا الٰہ (حاکم۔ قانون دینے والا) کوئی اور بنا رکھا ہے جس کے سہارے وہ زندگی کو نشوونما دے کر آگے بڑھانا چاہتے ہیں؟ ان سے کہدو کہ (لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا۔ ۲۱/۲۲) اگر خارجی کائنات میں کسی اور کا قانون ہوتا اور انسان کی تمدنی اور معاشی زندگی میں کسی اور کا قانون تو اس سے ایسا تضاد واقع ہو جاتا کہ ہر جگہ تخریب ہی تخریب پیدا ہو جاتی۔ حقیقت یہ ہے کہ جس خدا کے ہاتھ میں ساری کائنات کا مرکزی کنٹرول ہے اس کے متعلق یہ تصور رکھنا کہ وہ صرف خارجی کائنات کا الٰہ ہے، انسانوں کی دنیا کا الٰہ نہیں، بڑا باطل تصور ہے۔ خدا اس تصور سے بہت دور ہے (فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۲۱/۲۲) واقعہ یہ ہے کہ هُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ (۴۳/۸۴) وہی خدا خارجی کائنات کا الٰہ ہے اور وہی انسان کی تمدنی اور معاشی زندگی کا بھی الٰہ۔

الٰہ اسماء اور الٰہ الارض

جس کا قانون خارجی کائنات میں کارفرما ہے اسی کا قانون انسان کی تمدنی زندگی میں بھی نافذ العمل ہے۔ جو قوم اس کے اس قانون سے روگردانی کرتی ہے اس کی معیشت تنگ ہو جاتی ہے۔ (وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا ۲۰/۱۲۴) کائناتی قانون اور انسانی زندگی سے متعلق قانون میں فرق صرف اتنا ہے کہ

(ا) کائناتی قانون ہر شے کے رگ و پے میں از خود جاری و ساری ہے اور

(اا) کسی شے کو اس کا اختیار نہیں کہ وہ اس قانون کی خلاف ورزی کر سکے۔

اس کے برعکس انسانی زندگی سے متعلق قانون

(ا) وحی کے ذریعے ملتا ہے اور

(ب) انسانوں کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو اس قانون کو اختیار کرے اور چاہے تو اپنے لئے دوسرا قانون وضع کرلے۔

لیکن جس طرح کائناتی قانون کی قوت ایسی ہے کہ اسے کوئی شکست نہیں دے سکتا اسی طرح انسانی زندگی سے متعلق قانون کی قوت بھی اس قدر بے پناہ ہے کہ ساری دنیا کے انسان مل کر بھی چاہیں کہ اس کے خلاف نتیجہ پیدا کرسکیں تو یہ ناممکن ہے وَمَآ أَنتُم بِمُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ (۲۹/۲۲) جس طرح تمہارے لئے یہ ناممکن ہے کہ ہمارے کائناتی قانون کو شکست دے سکو اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ تم اپنی

خدا کے قانون کو شکست نہیں دے سکتے

تمدنی اور معاشی دنیا میں بھی ہمارے قانون کو ناکام بنادو بلکہ تمہیں اس کا تصور بھی نہیں کرنا چاہیئے کہ تم ایسا کرسکتے ہو (۴۵/۲۱) سورۂ جاثیہ میں ہے أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ کیا وہ لوگ جو انسانی معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرتے رہتے ہیں یہ خیال کئے بیٹھے ہیں أَن نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ کہ ہم انہیں ان لوگوں جیسا بنادیں گے جو ہمارے قانون کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے کر اس کے بتائے ہوئے صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوتے ہیں؟ کیا یہ لوگ اس زعم میں ہیں کہ سَوَاءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ان کی زندگی اور ان کی موت ایک جیسی ہوگی؟ کبھی ایسا نہیں ہوسکتا۔ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ (۴۵/۲۱) ان کا یہ اندازہ بڑا غلط ہے ان کا یہ فیصلہ بہت بُرا ہے جو اُن کے حق میں تباہی لے آئے گا۔ اس کے بعد اس کی دلیل بھی دی ہے۔ اور دلیل یہ ہے، کہ کیا ان لوگوں نے کائناتی نظام پر غور نہیں کیا کہ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ خدا نے اس تمام سلسلۂ کائنات کو اس طرح پیدا کر رکھا ہے کہ وہ ٹھوس تعمیری نتائج مرتب کرے۔ لہذا جو قوم ہمارے قانون کے مطابق عمل پیرا ہوگی (جو وحی کے ذریعے دیا گیا ہے) اس کی جد و جہد ٹھوس تعمیری نتائج پیدا کرے گی اور جو اس کے برعکس چلے گی اس کی کوششیں تخریبی نتائج مرتب کریں گی۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ تم اس قانون کی خلاف ورزی کرکے اپنے لئے خوشگوار نتائج مرتب کرلوگے تو اس خیالِ خام کو جتنی جلدی اپنے دل سے نکال سکو نکال دو۔ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ یہ سارا سلسلۂ کائنات اسی لئے سرگرمِ عمل ہے لِتُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (۴۵/۲۲) تاکہ ہر ایک کو اس کے اعمال کے نتائج ملیں اور اس میں کسی قسم کی کمی بیشی نہ ہونے پائے۔ وہ کہتا ہے کہ جاؤ تاریخ کے اوراق کو

اُلٹ کر دیکھو کہ كَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً - ہم نے کتنی ایسی قوموں کو تباہ کر دیا جو حقوقِ انسانیت میں کمی کیا کرتی تھیں وَ اَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ (۲۱/۱۱) اور ان کے بعد ہم نے دوسری قوموں کو اٹھا کھڑا کیا۔ ان تباہ ہونے والی قوموں کی حالت یہ تھی کہ فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِنْهَا يَرْكُضُوْنَ (۲۱/۱۲) جب انہوں نے اس تباہی کو اپنے سامنے محسوس شکل میں دیکھا تو اس سے بھاگنے لگے۔ لیکن ہمارے قانون نے انہیں للکار کر پکارا اور کہا کہ لَا تَرْكُضُوْا - یہیں کھڑے رہو۔ اب تم بھاگ کر کہاں جا سکتے ہو؟ وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ تم نے دوسروں کی کمائی سے اپنے لئے جو سامانِ عیش فراہم کر رکھا تھا اور ایسے ایسے سربفلک محلات تعمیر کر رکھے تھے اُن کی طرف لوٹ کر چلو۔ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ (۲۱/۱۳) تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ تم نے یہ کچھ کہاں سے لیا تھا اور تمہیں کیسے حق پہنچتا تھا کہ تم دوسروں کی کمائی پر عیش اُڑاؤ؟

تاریخی شواہد

آپ اس آخری ٹکڑے (لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ) پر غور کیجئے۔ جب کوئی گروہ اتنی طاقت فراہم کر لیتا ہے کہ اس کا کوئی مقابلہ نہ کر سکے تو وہ جو جی میں آئے کرتے ہیں اس لئے کہ انہیں اطمینان ہوتا ہے کہ ہم سے کون پوچھنے والا ہے؟ ان کی قوت، ازمنہ مظلمہ کے کسی ہلاکو خان کی وحشت و بربریت کی شکل اختیار کرے یا ہمارے دورِ تہذیب و تمدن کی جمہوریت میں "اکیاون (۵۱) ووٹ" کی میجارٹی (Majority) کے لباس میں سامنے آئے، خیال ہر جگہ یہی غالب ہوتا ہے کہ اب ہمیں کون پوچھنے والا ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ ان کا یہ زعم باطل ہے کہ ان کا فیصلہ، قانون بن جاتا ہے جس کے بعد انہیں پوچھنے والا کوئی نہیں رہتا۔ ان کا جو فیصلہ بھی ہو، اس کے نتائج ہمارے قانون کے مطابق مرتب ہوں گے۔ جس طرح اگر اکثریت (۵۱ نہیں بلکہ ۹۹ کی اکثریت) یہ فیصلہ کر دے کہ آج سے سنکھیا، مدِ حیات سمجھا جائے گا تو اس سے ہمارا یہ قانون کہ سنکھیا زہر قاتل ہے، بدل نہیں جائے گا۔ سنکھیا اپنا اثر ان کے فیصلے کے مطابق نہیں کرے گا بلکہ ہمارے قانون کے مطابق کرے گا۔ اسی طرح اگر ان کا گروہِ غالب یہ فیصلہ کر دے کہ ان کا حق ہے کہ دوسرے محنت کریں اور یہ عیش اُڑائیں، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے اس فیصلے کے نتائج ان کی مرضی کے مطابق مرتب ہونے لگ جائیں گے۔ یہ جو جی میں آئے فیصلہ کرتے رہیں، نتائج تو خدا کے قانون کے مطابق ہی مرتب ہوں گے۔ اسی کا نام "بازپرس"

بازپرس ہوگی

ہے۔ چنانچہ اسی گروہ کے متعلق کہا گیا ہے اِنَّهُمْ مَسْئُوْلُوْنَ (۳۷/۲۴)۔ یہ سمجھتے ہیں کہ ان سے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ یہ غلط ہے۔ ہمارا قانونِ مکافات ان سے پوچھے گا۔ یہ اس کے احاطے سے باہر جا ہی نہیں سکتے۔ وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ بِالْكَافِرِيْنَ (۹/۴۹)۔ ان کے اعمال کے انسانیت سوز نتائج انہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوتے ہیں۔ یہ اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہیں (وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِيْنَ - ۸۲/۱۶) یہ لوگ اپنے فیصلے کرنے کے بعد بڑے فخر سے اتراتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھو! ہمارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ لیکن انہیں اس کا علم نہیں کہ خدا کا قانونِ مکافات انہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔

قانونِ مکافات

بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَائِهِمْ مُّحِيْطٌ (۸۵/۱۹-۲۰)

یہ لوگ جو ہمارے قانون سے انکار کرتے ہیں خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے اس قانون کو غلط ثابت کر دیا لیکن ہمارا قانون انہیں اس کے باوجود چاروں طرف سے گھیرے ہوتا ہے۔

یعنی نتائج آخر الامر اس قانون کے مطابق مرتب ہوتے ہیں۔

یہ ہے قانون کی وہ قوت جس کی بنا پر پورے حتم و یقین سے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ انقلاب آکر رہے گا۔ بلاشک و شبہ آکر رہے گا۔ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا (۴۰/۵۹) جس مقام پر آکر انسان فریب کھا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ قانونِ طبعی کی خلاف ورزی کرنے کے نتائج فوراً محسوس ہو جاتے ہیں (آگ میں انگلی ڈالنے سے اس کا نتیجہ فوراً محسوس شکل میں سامنے آجاتا ہے) لیکن خدا کے مقرر کردہ معاشرتی قوانین کی خلاف ورزی کے نتائج کو انسان فوری طور پر محسوس نہیں کرتا اس لئے اس پر یقین نہیں رکھتا۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۴۰/۵۹) یہ ہے وہ مقام جہاں ایمان کی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی اس حقیقت پر یقین رکھنے کی ضرورت کہ کائنات میں کوئی اندھی قوت کام نہیں کر رہی بلکہ یہاں ایک ایسی ذات کا قانون کارفرما ہے جو حکیم ہے۔ خبیر ہے۔ علیم ہے۔ سمیع ہے۔ بصیر ہے۔ یہ قانون جس طرح خارجی کائنات میں جاری و ساری ہے اسی طرح انسانوں کی تمدنی اور معاشی دنیا میں بھی اسی کی کبریائی ہے۔ لہٰذا جو نظام، قانونِ خداوندی کے مطابق قائم ہوتا ہے وہ زندگی کی خوشگواریوں کا حامل ہوتا ہے۔ جو اس کے خلاف جاتا ہے اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوتا ہے۔ ہو نہیں سکتا کہ کوئی قوت

ایمان کی ضرورت

اس اٹل قانون کو شکست دے سکے۔ یعنی نظام تو خلافِ قانونِ خداوندی قائم کرے اور اس کا نتیجہ زندگی کی خوشگواریاں اور شادابیاں ہوں۔

حق کی طرف قدم اُٹھ رہا ہے

اس کے ساتھ ہی ایک اور بات کے بھی سمجھ لینے کی ضرورت ہے۔ ذہنِ انسانی کا تراشیدہ فلسفہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ ایک تصور[1] (یا ایک نظام[2]) قائم ہوتا ہے۔ پھر اس کے بعد اس میں سے اس کا متضاد تصور (یا نظام) ابھرتا ہے جو پہلے تصور (یا نظام) کو شکست دے کر خود اس کی جگہ لے لیتا ہے اور اسی طرح یہ سلسلۂ محو و ثبات آگے بڑھتا آ رہا ہے یہ تصور باطل ہے اس کے برعکس صورت یہ ہے کہ جس طرح کائنات نکھرتی، سنورتی، اور ان پیمانوں کے مطابق جو اس کے لئے مقرر کئے گئے ہیں، ارتقائی منازل طے کرتی، آگے بڑھتی جا رہی ہے (اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی۔ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَھَدٰی ۸۷/۲-۳) اسی طرح انسانی معاشرہ بھی، مختلف تجارب کے بعد، بتدریج اس نظام کی طرف بڑھتا آ رہا ہے جو قانونِ خداوندی کی رو سے اس کے لئے تجویز کیا گیا ہے۔ (وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔ ۵/۳) اور آخر الامر خدا کے نظامِ ربوبیت تک پہنچ کر رہے گا (یٰۤاَیُّھَا الْاِنْسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحًا فَمُلٰقِیْهِ۔ ۸۴/۶) اے انسان! تو سخت دشوار گذار منازل طے کرتا ہوا خدا کے نظامِ ربوبیت کے سامنے جا کھڑا ہو گا۔ اگر انسان وحی کا تجویز کردہ راستہ اختیار کر لے تو آسانی اور جلدی سے وہاں پہنچ جائے گا۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو ٹھوکریں کھاتا، خون کے دریا پیرتا اور آگ کی خندقیں پھاندتا، بڑی سست رفتاری سے وہاں تک پہنچے گا۔ لیکن پہنچے گا ضرور یہ خدا کا قانون ہے جسے دنیا کی کوئی قوت شکست نہیں دے سکتی۔ اس نظام نے انسانوں کے تمام خود ساختہ نظاموں پر غالب آ کر رہنا ہے (۹/۳۳) لہٰذا، اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ انقلابِ عظیم آ کر رہے گا۔ وہ انقلاب جس میں معاشی نظامِ انسانیت بھی اس خدا کے ہاتھ میں (یعنی اس کے قانون کے مطابق قائم) ہو گا جس کے ہاتھ میں کائناتی نظام ہے (وَالْاَرْضُ جَمِیْعًا قَبْضَتُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌۢ بِیَمِیْنِهٖ اسی کے معنی توحید ہیں سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ۳۹/۶۷)

انقلاب کے معنی یہ ہیں کہ انسانوں کے خود ساختہ نظام نے جو بساط بچھا رکھی ہے اس کی جگہ صحیح نظام رائج ہو جائے۔

---

[1] ہیگل کے الفاظ میں تصور اور [2] مارکس کے نظریہ کے مطابق نظام۔

ان دونوں نظاموں کے تفصیلی تقابل کے لئے ایک جداگانہ تصنیف کی ضرورت ہے لیکن اگر آپ غور سے دیکھیں گے تو ان کے نمایاں خط و خال حسب ذیل نظر آئیں گے۔

دونوں نظاموں کا تقابل

(۱) انسانوں کے خودساختہ نظام میں ہمیشہ ایک طبقہ ایسا رہتا ہے جو خود کچھ نہیں کرتا اور دوسرے انسان ان کا تمام بوجھ اُٹھاتے ہیں۔ پھر لطف یہ کہ بجائے اس کے کہ بھکاریوں کا یہ طبقہ اپنے آپ کو حقیر و ذلیل سمجھے، یہ معاشرہ میں سب سے اونچے مقام پر متمکن رہتا ہے۔ ان میں سے کچھ لوگ اقتدار کی کرسیاں سنبھال لیتے ہیں اور دوسرے لوگ مذہبی پیشوائیت کی مسندوں پر براجمان ہو جاتے ہیں۔ لِيَأْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ (۹/۳۴) تاکہ عوام کی محنت کی کمائی کھاتے رہیں اور تخریبی نتائج پیدا کرتے رہیں۔

صحیح نظامِ ربوبیت میں اس قسم کا کوئی طبقہ نہیں رہے گا۔ اس میں کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (۵۳/۳۸) ہر ایک کو اپنا بوجھ آپ اُٹھانا ہوگا۔

(۲) غلط نظام میں ایک طبقہ ایسا ہوتا ہے جو صرف روپیہ لگاتا ہے (INVEST کرتا ہے۔) اور خود کوئی کام نہیں کرتا۔ دوسرے لوگ کام کرتے ہیں اور ان کی محنت کا بہترین حصہ اس کے گھر آجاتا ہے۔

صحیح نظامِ ربوبیت میں (بجز ان لوگوں کے جو کسی وجہ سے کام کرنے سے معذور ہو چکے ہوں) ہر شخص کو کام کرنا ہوگا۔ جو شخص (بلا عذر) کام نہیں کرے گا اس کا معاشرہ کے ثمرہ میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (۵۳/۳۹) وہاں کا اصل الاصول ہوگا یعنی بلا سعی و عمل کسی کو کچھ نہیں ملیگا۔

(۳) غلط نظام میں اصول یہ ہوتا ہے کہ جو شخص اپنی ہنرمندیوں سے جتنا کچھ سمیٹ لے، سب اس کی ملکیت ہو جاتا ہے۔ کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ اس کی ملکیت میں دخل انداز ہو سکے۔ اس طرح ایک شخص کے گھر میں چاندی اور سونے کے ڈھیر جمع ہو جاتے ہیں اور ہزاروں انسان نانِ شبینہ تک کے لئے محتاج رہ جاتے ہیں۔

نظامِ ربوبیت میں ہر شخص پوری پوری محنت کرتا ہے لیکن اس کے ماحصل میں سے صرف اتنا لیتا ہے جتنا اس کی ضروریات کے لئے کافی ہو۔ باقی سب، نوعِ انسانی کی ربوبیت کے لئے کھلا رہتا ہے۔ يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ۔ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹) تجھ سے پوچھتے ہیں کہ (اپنی محنت کی کمائی میں سے) کس حد تک نوعِ انسانی کی ربوبیت کے لئے کھلا رکھا جائیگا۔ ان سے کہدو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زیادہ ہوگا سب کا سب، اس نظام میں دولت جمع کرنا ایک سنگین جرم ہوگا

جس کی سزا بڑی عقوبت انگیز ہوگی۔ (۹/۳۵)

(۴) غلط نظام میں بعض لوگ رزق کے بنیادی سرچشمہ (زمین) پر لکیریں کھینچ کر اسے اپنی ذاتی ملکیت میں لے لیتے ہیں اور اس طرح عوام کے ذریعہ پرورش پر سانپ بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔

نظام ربوبیت میں رزق کے سرچشمے کسی کی انفرادی ملکیت میں نہیں رہتے۔ یہ سب ضرورتمندوں کے لئے یکساں طور پر کھلے رہتے ہیں۔ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ (۴۱/۱۰)

(۵) غلط نظام میں "ہیئتِ حاکمہ" کا فریضہ صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ لوگوں سے اپنے واجبات (Dues) وصول کرے۔ یہ کسی کا ذمہ نہیں ہوتا کہ دیکھے کہ افرادِ معاشرہ کو ان کی زندگی کی ضروریات بہم پہنچ رہی ہیں یا نہیں۔

نظام ربوبیت میں، معاشرہ میں ہر "چلنے والے" کے لئے سامان پرورش بہم پہنچانے کی ذمہ داری خود نظام پر ہوتی ہے۔ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (۱۱/۶) صرف انہی کی نہیں، بلکہ ان کی اولاد کی بھی نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ (۱۷/۳۱)

صرف روٹی کی ذمہ داری ہی نہیں بلکہ تمام بنیادی ضروریاتِ زندگی کی۔ (اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى۔ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى (۲۰/۱۱۸-۱۱۹) اس میں نہ کوئی بھوکا ہوگا نہ ننگا۔ نہ پیاسا نہ بغیر مکان کے۔

غلط نظام میں اگر کوئی ذمہ داری لیتا بھی ہے (جیسے کمیونزم کا دعویٰ ہے) تو صرف طبعی ضروریات زندگی کی۔ کیونکہ ان کے ہاں زندگی صرف جسمانی زندگی ہے۔

نظامِ ربوبیت میں، انسان کی طبعی ضروریات کے پورا کرنے کے ساتھ ساتھ تمام افرادِ معاشرہ کی مضمر صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما کا بھی انتظام کیا جاتا ہے۔ اس نظام کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام انسانی صلاحیتوں کی بالیدگی کا سامان بہم پہنچائے اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ (۲۲/۴۱) جب اس نظام کے حاملین کو تمکن حاصل ہوگا تو یہ "نظام صلوٰۃ" قائم کریں گے اور نوعِ انسانی کو نشوونما بالیدگی عطا کریں گے۔

یہ نشوونما اور ارتقاء و بالیدگی انسانی ذات (Human personality) کی ہوگی، اس لئے کہ صحیح نظام میں کامیاب اور شادکام (prosperous) اس کو کہا جاتا ہے جس کی ذات (personality) کی نشوونما (Development) ہو جائے۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا (۹۱/۹)

اس نظام میں معاشرہ، فرد کی ذات کی تکمیل کے لئے ہوتا ہے۔ فرد، معاشرہ کی قربان گاہ پر ذبح ہونے کے لئے نہیں ہوتا۔

چونکہ انسانی ذات، نشوونما پاکر طبعی موت کے بعد زندگی کے مزید مراحل طے کرتی ہے اس لئے نظامِ ربوبیت میں اس دنیاوی زندگی کی خوشگواریوں کے ساتھ مستقبل کی زندگی کی شادابیاں بھی حاصل ہوتی جاتی ہیں۔ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً (۲/۲۰۱)

(۶) انسانوں کے خودساختہ نظام میں، نوعِ انسانی کو مختلف گروہوں (قوموں) میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اور ہر قوم اپنی منفعت اور دیگر اقوام کی تخریب کے درپے رہتی ہیں۔

نظامِ ربوبیت میں انسانوں کی خودساختہ تمام حدود و قیود مٹ جاتی ہیں اور پوری نوعِ انسانی ایک عالمگیر برادری بن جاتی ہے۔ اس نظام کے پیشِ نظر پوری انسانیت کی منفعت ہوتی ہے کیونکہ اس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (۱۳/۱۷)۔ وہی تصورِ حیات اور وہی نظامِ زندگی باقی رہ سکتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے منفعت بخش ہو۔

(۷) غلط نظام میں عزت و تکریم کے معیار اضافی ہوتے ہیں۔ جو بڑے گھرانے میں پیدا ہو۔ جس کے پاس بہت سامال و دولت ہو۔ جو کسی نہ کسی طرح قوت فراہم کرلے۔ وہی واجب التکریم سمجھا جاتا ہے۔ باقی انسان ان کی نگاہوں میں ذلیل و حقیر ہوتے ہیں۔

نظامِ ربوبیت میں ہر انسان صرف انسان ہونے کی جہت سے قابلِ عزت و تکریم ہوتا ہے۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) ہم نے ہر فرزندِ آدم کو واجب الاحترام بنایا ہے۔ عزت و تکریم کے مدارج کا فرق بھی اس معیار کے مطابق ہے کہ جو شخص اپنی ذمہ داریوں کو سب سے زیادہ پورا کرتا ہے وہ سب سے زیادہ عزت کا مستحق قرار پاتا ہے۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (۴۹/۱۳)

(۸) اور سب سے آخر یہ کہ انسانی ذہن نے جو نظام بھی قائم کیا اس میں ہمیشہ یہ حالت رہی کہ ایک گروہ نے قانون بنانے کا کام اپنے ہاتھ میں رکھا اور دوسرا گروہ ان کے بنائے ہوئے قوانین کی اطاعت پر مجبور قرار دیا گیا۔ ہیئتِ حاکمیہ (قانون بنانے والی قوت) خواہ عصرِ قدیم کی شاہنشاہیت ہو یا عہدِ حاضر کی جمہوریت، ہر جگہ یہی اصول کارفرما نظر آئے گا کہ ایک گروہ پر دوسرے گروہ کے احکام و قوانین کی اطاعت لازم آتی ہے۔ حکومت کسی انداز

کی ہو، اس میں حاکم اور محکوم کی تمیز ضروری ہوتی ہے

نظامِ ربوبیت میں انسانوں کی حکومت کا تصور ہی باقی نہیں رہتا اس لئے کہ اس میں وہ اصولی قوانین جن کے تابع زندگی بسر کرنا تمام انسانوں کے لئے ضروری ہے، خود خدا کے متعین کردہ ہوتے ہیں اور کسی انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۳/۷۹) کسی انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ خدا اسے ضابطۂ قوانین۔ قوتِ فیصلہ اور نبوت عطا کر دے۔ اور وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے قوانین کے نہیں بلکہ میرے غلام بن جاؤ۔ اس نظام میں جو گروہ ان اصولی قوانین کی جزئیات (قوم کے مشورہ سے) مرتب کریگا اور انہیں نافذ کرے گا، وہ سب سے پہلے خود ان احکام کی اطاعت کرے گا اور کہے گا کہ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (۶/۱۶۴) سب سے پہلے میں خود ان کی اطاعت کرتا ہوں۔

یہ ہے وہ نظامِ ربوبیت جس میں کسی انسان پر کسی قسم کا جبر و استبداد نہ ہوگا۔ (لَاۤ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ (۲/۲۵۶)) اور جس میں ہر فرد اپنے ذاتی تجربہ کے بعد کہہ سکے گا کہ

کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

یہ ہے وہ نظام جو اس ارض پر انسانی معاشرہ کا منتہیٰ ہے اور جس کے متعلق پورے حتم و یقین کے ساتھ کہا گیا ہے کہ یہ قائم ہو کر رہے گا۔

جس طرح یہ نظام دنیا کے ہر نظام سے نرالا ہے، اسی طرح اس نظام کو قائم کرنے کے لئے جو انقلاب پیدا کیا جاتا ہے، اس کا طریق بھی باقی انقلابات سے بالکل انوکھا ہے۔ یہ نظامِ ربوبیت عامہ کی بنیادوں پر قائم ہوتا ہے جس کے معنی مختصر الفاظ میں یہ ہیں کہ دنیا میں

انقلاب کا طریقہ

کسی ضرورتمند کی کوئی ضرورت رکی نہ رہے۔ ظاہر ہے کہ دنیا میں (اگر ۹۹ فی صدی نہیں تو کم از کم) نوّے فی صدی لوگ ایسے ہیں جن کی کوئی نہ کوئی ضرورت رکی رہتی ہے انہیں عرفِ عام میں (Have-nots) کہا جاتا ہے اور (ایک فی صدی نہیں تو زیادہ سے زیادہ) دس فی صدی لوگ شاید ایسے ہوں جن کے پاس سب کچھ فراوانی

سے موجود ہو۔ اندریں حالات، جو انقلاب اس آواز کو لیکر اُٹھے کہ اس میں ہر ضرورتمند کی ضروریات پوری ہوجائینگی دُنیا کی نوّے فی صدی آبادی خود بخود اس کے ساتھ ہوگی۔ اس کے لئے اس سے زیادہ کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں کہ اُن سے کہدیا جائے کہ اُٹھو اور آگے بڑھ کر ان لوگوں سے جن کے پاس اس کثرت سے دولت موجود ہے سب کچھ چھین لو۔ تمہارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اس کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں کہ موقعہ ملے تو دولتمندوں کا سب کچھ چھین لیا جائے۔ یہ تو قانون کی زنجیریں ہیں جو انہیں اس چھینا جھپٹی سے روکے رکھتی ہیں۔ اگر ان سے کوئی کہدے کہ ان زنجیروں کو توڑ کر باہر نکل آؤ، اس کے نتائج کے ہم ذمہ دار ہیں تو یہ ایک رات میں انقلاب برپا کردیں گے۔ یہی آواز تھی جو مارکس نے بلند کی۔ اس کا نعرہ یہ تھا کہ

مارکسی انقلاب

دُنیا کے مزدورو! اکٹھے ہوجاؤ۔ اس انقلاب میں اگر تم سے کچھ چھنے گا تو صرف وہ زنجیریں چھنیں گی جن میں تم اس وقت جکڑے ہوئے ہو۔ اس سے زیادہ تمہارے ہاتھ سے کچھ نہیں جائے گا۔

لیکن سوچئے کہ اس قسم کے انقلاب کے بعد ہوگا کیا؟ آپ نے ان ضرورتمندوں کو آواز دی۔ وہ آپ کی آواز پر اُٹھ کھڑے ہوئے انہوں نے دولتمندوں کی دولت چھین لی اور اس طرح دیکھ لیا کہ اس انقلاب میں انہیں کچھ ملا ہی ہے ان کے ہاتھ سے گیا کچھ نہیں۔ وہ ہنوز اس لوٹ سے فارغ بھی نہ ہونے پائے تھے کہ آپ نے اُن سے کہا کہ اُٹھو۔ کام کرو۔ پہلے تو انہیں یہی چیز ناگوار گذرے گی۔ وہ کہیں گے کہ اگر ہم نے وہی محنت مزدوری کرنی تھی تو اس انقلاب کا فائدہ کیا تھا؟ لیکن جب وہ طوعاً و کرہاً کچھ کام کریں گے تو آپ اُن سے کہیں گے کہ تم نے جس قدر اپنی ضروریات سے زیادہ کمایا ہے وہ ہمارے حوالے کردو تاکہ اُسے ان لوگوں پر صرف کیا جائے جو زیادہ کمانے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ سوچئے کہ وہ اس پر کس طرح آمادہ ہوسکیں گے؟ وہ کہیں گے کہ آپنے یہ کہہ کر ہمیں دعوتِ انقلاب دی تھی کہ اس سے تمہیں ملے ہی ملے گا۔ تمہارے ہاتھ سے جائے گا کچھ نہیں۔ لیکن اب آپ کہتے ہیں کہ ہمیں کام بھی کرنا ہوگا۔ اور اپنی محنت کی کمائی سے بشیتر حصّہ دینا بھی ہوگا۔ ہم آپ کے ساتھ کچھ لینے کے لئے ہوئے تھے۔ دینے کے لئے نہیں۔ غور کیجئے کہ اس طرح آپ نے پھر وہی طبقہ پیدا کردیا جو دوسروں کو کچھ "دینے" کے لئے تیار نہ تھا۔ ان کا مقصدِ زندگی لیناہی لینا تھا۔ اب اس طبقہ کے خلاف بھی آپ کو وہی کچھ کرنا ہوگا جو آپ پہلے سرمایہ دار طبقہ کے خلاف

کر چکے ہیں۔ یعنی استبداد۔ آپ استبداد کے بغیر نہ تو ان لوگوں سے پورا پورا کام لے سکتے ہیں اور نہ ہی ان کی محنت کی کمائی کا کچھ حصہ جس شخص کو معلوم ہے کہ میں اگر بیس من غلہ بھی پیدا کر لوں تو بھی مجھے اس میں سے دو ہی من ملے گا۔ وہ بیس من غلہ پیدا کرنے کے لئے اپنی جان کیوں مارے گا؟ آپ کو اس سے مار مار کر کام لینا ہوگا تاکہ وہ بیس من غلہ پیدا کرے۔ اور پھر مار مار کر اسے مجبور کرنا ہوگا کہ وہ اٹھارہ من غلہ آپ کے حوالے کر دے۔ اس کا لازمی نتیجہ وہ "آہنی پردہ" (Iron Curtain) ہوگا جو روس کو، اپنے انقلاب آفریں مزدوروں کی پہلی ہی نسل کے بعد وہاں آویزاں کرنا پڑا تاکہ دنیا کو معلوم نہ ہو سکے کہ وہاں کا نظام کس استبداد کے زور سے چلایا جا رہا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ جہاں لوگ بطیب خاطر سب کچھ کرنے اور سب کچھ دوسروں کو دیدینے کے لئے آمادہ ہوں، وہاں آہنی تو ایک طرف ریشمی پردوں کی بھی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔ وہاں ہر چیز کھلے بندوں ہوتی ہے۔ بلکہ اسے لوگوں کو بلا بلا کر دکھایا جاتا ہے تاکہ وہ اس نظام کے خوشگوار نتائج کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اس کے اندر داخل ہوتے چلے جائیں۔ یدخلون فِی دِینِ اللہِ اَفْوَاجًا۔

نظام ربوبیت کا انقلاب

نظام ربوبیت کا انقلاب اس طرح برپا نہیں کیا جاتا۔ اس طرح برپا کردہ انقلاب، درحقیقت انقلاب نہیں محض ہنگامہ یا شورش ہوتی ہے۔ نظام ربوبیت کا داعی ضرورت مندوں (Have nots) کو آواز نہیں دیتا کہ آؤ! تمہیں یہاں کچھ ملیگا۔ وہ ان لوگوں کو آواز دیتا ہے جن کے پاس دینے کے لئے فالتو ہوتا ہے کہ آؤ اور ایک ایسا نظام قائم کرو جس میں تمہارا فالتو رزق دوسروں کے نشو و نما کے کام آئے۔ آپ قرآن میں دیکھئے۔ ہر مقام پر اسی طبقہ کو دعوتِ انقلاب دی گئی ہے۔ انہی سے کہا گیا ہے کہ تم نے ایسا نظام قائم کرنا ہے جس میں تم نے پوری پوری محنت کرنی ہے۔ اور پھر اس محنت کی کمائی میں سے جس قدر فالتو ہوگا وہ سب کا سب دوسروں کو دیدینا ہے۔ وہ "دینے والوں" کو آواز دیتا ہے اور انہی کے ہاتھوں اس نظام کی بنیاد رکھتا ہے۔ وہ "لینے والوں" کو آواز نہیں دیتا۔ آپ قرآن کے پہلے ورق پر دیکھئے۔ اس نظام کا آغاز ان لوگوں سے ہوتا ہے جن کا وصف یہ ہے کہ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۲/۳) وہ ان پر کوئی استبداد نہیں کرتا۔ انہیں کسی قسم کے جبر و اکراہ سے اس نظام کے قیام پر مجبور نہیں کرتا۔ وہ ان کے سامنے زندگی کا وہ حقیقی تصور پیش کر دیتا ہے۔ جس کے سمجھ لینے کے بعد، وہ از خود اپنا سب کچھ لے کر اس نظام کے قیام

کے لئے آجاتے ہیں۔ وہ اپنی چشم بصیرت سے دیکھ لیتے ہیں کہ زندگی کا راز دینے میں ہے لینے میں نہیں۔ وہ اس حقیقت کو سمجھ کر اس نظام کے اندر قدم رکھتے ہیں اور پھر زیادہ سے زیادہ محنت کرتے ہیں تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ دے سکنے کے قابل ہو جائیں اور اس طرح حقیقی زندگی کی خوشگواریوں سے زیادہ سے زیادہ بہرہ یاب ہوسکیں۔ اس نظام میں جو حاجتمند بھی داخل ہوتے ہیں وہ بھی اس نیت سے نہیں آتے کہ انہیں یہاں سے کچھ مل جائے گا۔ وہ اس لئے آتے ہیں کہ اگر کچھ لوگ ایسے ہوں جو اُن سے بھی زیادہ حاجتمند ہوں تو یہ انہیں کچھ دینے کے قابل ہوسکیں۔ اس نظام میں ہر شخص اس مقصد کو لیکر آتا ہے۔ اور اسی مقصد کو پورا کرنے میں اپنی زندگی کا راز سمجھتا ہے۔ یہ ہے وہ طریقہ جس سے نظام ربوبیت کا "انقلاب" پیدا کیا جاتا ہے۔ یہ انقلاب درحقیقت دلوں کی دنیا میں پیدا کیا جاتا ہے۔ باہر کا انقلاب اس اندرونی انقلاب کا فطری نتیجہ ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس انقلاب کے پیدا کرنے میں اس قدر محنت اور مشقت درکار ہوتی ہے۔

برنارڈشا نے کہا ہے (اور کس قدر صحیح کہا ہے) کہ

> دنیا میں تمام خرابیوں کی جڑ فالتو دولت (Spare Money) **فالتو روپیہ** ہے۔ یعنی وہ روپیہ جو تمہاری بنیادی ضروریات زندگی سے زائد ہو۔ اسی کو سرمایہ (Capital) کہتے ہیں
>
> (The Intelligent woman's Guide- P.128)

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی معاشی دنیا کا سارا مسئلہ ہی "فالتو روپیہ" ہے۔ جس کے پاس "فالتو روپیہ" ہے وہ اسے چھپائے چھپائے پھرتا ہے کہ اسے کوئی چھین نہ لے۔ اور چھیننے والے اس کی گھات میں رہتے ہیں۔ وہ اسے جیب میں رکھتا ہے تو وہاں سے جیب کترا نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ کیش بکس میں رکھتا ہے تو چور نقب لگا لیتا ہے۔ آئرن سیف میں رکھتا ہے تو ڈاکو آپڑتے ہیں۔ بینک میں رکھتا ہے تو مختلف ٹیکسوں والے گھیر لیتے ہیں۔ وہاں سے کچھ بچ جاتا ہے تو "جنت بیچنے والے" اپنے نذرانے وصول کرنے کو آموجود ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس کا "فالتو روپیہ" اس کی جیب سے نکال لیا جائے۔ لیکن قرآن کسی کی جیب سے روپیہ نکالتا نہیں۔ وہ اس کے اندر ایسی تبدیلی پیدا کر دیتا ہے (اور یہ تبدیلی علیٰ وجہ البصیرت پیدا

کرتا ہے) کہ وہ زیادہ سے زیادہ محنت کرتا ہے اور اس کے بعد "فالتو روپیہ" از خود لئے لئے پھرتا ہے کہ خدا کے لئے اسے لیلو۔

یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ــــــــ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹)

یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم اپنی محنت کی کمائی میں سے کس حد تک دوسروں کے لئے دیدیں } اُن سے کہہ دے کہ جس قدر تمہاری بنیادی ضروریات سے زائد ہے، سب کا سب۔

اور یہ سب کچھ قانونِ خداوندی کے تابع ہوتا ہے تاکہ اس سے تمام افرادِ انسانیہ کی تکمیلِ ذات ہو سکے جس سے وہ یہ زندگی کو بھی انسانیت کی سطح پر بسر کر سکیں اور اس کے بعد کی زندگی کی خوشگواریوں کے بھی اہل ہو سکیں۔ یہ ہے وہ انقلاب جو قرآن پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اسی انقلاب کا نام اسلام ہے اور اس کے برپا کرنے والوں کا نام مُسلم۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوگا کہ وہ کونسا طریق کار ہوگا جس سے لوگ اتنی بڑی تبدیلی کے لئے از خود آمادہ ہو جائیں گے؟

اس کا طریق کیا ہوگا؟ یہ طریق کار وہ ہوگا جسے "انقلاب اندر شعور" کہا جاتا ہے۔ یعنی فکر و نظر کی تبدیلی۔ قلب و نگاہ کی تبدیلی۔ دل اور دماغ کی تبدیلی۔ اُس زاویۂ نگاہ کی تبدیلی جس سے اشیائے کائنات کی اقدار بدل جاتی ہیں۔ یہ تبدیلی پیدا ہوتی ہے تعلیم سے۔ قرآن نے اس انقلاب کے داعیِ اوّل نبی اکرمؐ کے متعلق فرمایا کہ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ (۶۲/۲) وہ ان کی نشو و نما کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ ان کی تطہیرِ فکر و نظر کرتا ہے۔ انہیں قانونِ خداوندی کی تعلیم دیتا ہے۔ اور انہیں بتاتا ہے کہ اس قانون کی غایت کیا ہے۔ یہ کن محکم بنیادوں پر استوار ہے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے نتائج کیا ہوں گے۔ اس جماعت کے ارکان یہی تعلیم ایک دوسرے کو دیتے ہیں اور اس طرح تعلیم دیتے ہیں کہ اس کے گہرے نقوش اُن کے دل پر ثبت ہو جاتے ہیں۔ اس سے وہ ربّانی بن جاتے ہیں۔ وَلٰکِنْ کُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ بِمَا کُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْکِتٰبَ وَبِمَا کُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (۳/۷۸) وہ ایک دوسرے کو اس کی تلقین کرتے رہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ قانونِ خداوندی کے مطابق تعمیری کاموں میں حصہ لیں اور اس پروگرام پر نہایت استقامت اور استقلال سے عمل پیرا رہیں۔ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (۱۰۳/۳) اس لئے اس معاشرہ میں ایسی فضا پیدا ہو جاتی ہے جس سے اُٹھتے بیٹھتے

چلتے پھرتے، ان کے سامنے یہی نصب العین رہتا ہے اور اس طرح یہ حقیقت ان کے اعماقِ قلب میں یوں غیر محسوس طور پر جاگزیں ہو جاتی ہے جس طرح سانس لینے سے آکسیجن خون میں حلول کر جاتی ہے۔ ان کے بچے اس فضا میں پیدا ہوتے، بڑھتے اور پھولتے پھلتے ہیں اس لئے زندگی کے یہ حقائق ان کی گھٹی میں پڑ جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ان کی تعلیم و تربیت اس انداز سے ہوتی ہے کہ جو اثرات وہ اس طرح غیر شعوری طور پر لیتے ہیں وہ علمی تحقیقات کی رُو سے مسلّمہ حقائق بن کر سامنے آجاتے ہیں اور اس طرح وہ انہیں شعوری طور پر، علیٰ وجہ البصیرت قبول کر کے آگے بڑھتے ہیں۔ یہ ہے وہ طریق جس سے قرآن قلب و نگاہ میں وہ تبدیلی پیدا کر دیتا ہے، جس سے یہ حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ نوعِ انسانی کی پرورش میں انسان کی اپنی ذات کی نشو و نما کا راز پوشیدہ ہے اور انسانی ذات کی نشو و نما مقصودِ حیات ہے۔ جو لوگ اس طرح اس حقیقت کو بے نقاب دیکھ لیتے ہیں انہی کے ہاتھوں اس نظام کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، اس میں نہ کسی کو زبردستی شامل کیا جاتا ہے اور نہ ہی شامل ہو جانے کے بعد اس کا دروازہ بند کیا جاتا ہے کہ کوئی اس میں سے نکلنے نہ پائے۔ جس نظام کی بنیاد ہی انسانی ذات کی حریت اور بالیدگی پر ہو اس میں زبردستی کی کہیں گنجائش نہیں ہوتی۔ البتہ اگر کوئی قوت ان کے راستہ میں مزاحم ہو اور ان کے نظام کے قائم رہنے اور آگے بڑھنے کو زبردستی روکے اور ان خیالات کی نشر و اشاعت کی اجازت نہ دے تو ان کے لئے ضروری ہو گا کہ اس استبدادی مزاحمت اور قہرمانی مخاصمت کا مقابلہ قوت سے کریں۔ حَتّٰی لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ (۲/۱۹۳) لیکن اس میں بھی کسی خلافِ انسانیت حرکت کا کوئی دخل نہیں ہو گا۔ نہ کسی سے دھوکا کیا جائے گا نہ فریب۔ نہ کسی قسم کی سازش ہو گی نہ خیانت۔ نہ ظلم ہو گا نہ زیادتی۔ اللہ کے انسانیت ساز قانون کی اطاعت ان کا مقصد اور نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود ان کی دلیل راہ ہو گی۔

شاید آپ خیال کریں کہ اتنی بڑی وسیع و عریض دنیا میں اس طریقِ عمل سے اتنا بڑا انقلاب برپا کر دینا کس طرح ممکن ہو گا؟ لیکن آپ بھول گئے ہیں کہ وسائلِ رسل و مواصلات کی کثرت سے یہ دنیا اب سمٹ سمٹا کر ایک بستی اور اس کے رہنے والے ایک برادری بن چکے ہیں۔ اب کسی نظریہ کو ساری دنیا میں پھیلانا اور کسی تصور کو عام کرنا کچھ بھی مشکل نہیں بشرطیکہ کسی کے پاس سامانِ نشر و اشاعت موجود ہو۔ آج اگر کوئی خطۂ زمین بھی

اس قرآنی تصور کو عملاً قبول کر لے تو اس کے حسین و خوشگوار نتائج سے ساری دنیا کا متاثر ہو جانا نہ بعید ہے نہ دشوار۔ اس لئے ہمارا زمانہ اس انقلاب کے لئے بڑا ساز گار اور موجودہ فضا اس کے لئے بڑی مساعد ہے۔

کتنے مسائل حل ہو جاتے ہیں

آپ سوچئے کہ اگر یہ نظام کہیں قائم ہو جائے تو اس کے ساتھ ہی کتنے اہم مسائل (Problems) کا حل خود بخود ہو جاتا ہے جو اس وقت اس طرح لاینحل دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے قیام کے ساتھ ہی معاشی غلامی (Economic slavery) کا خاتمہ ہو جائے گا۔ زمیندار اور کاشتکار کی نزاع جو آج اس درجہ وجہ مصائب بن رہی ہے، ختم ہو جائے گی۔ کارخانہ دار اور مزدور کی کشمکش جو آج ہمارے وقت اور توانائی کا اتنا بڑا حصہ ضائع کر دیتی ہے، مٹ جائے گی۔ مالک مکان اور کرایہ دار کے سب جھگڑے نپٹ جائیں گے۔ قرض خواہ اور مقروض کی جانکاہ چپقلش کا خاتمہ ہو جائے گا۔ دوکاندار اور گاہک کی کھینچا تانی معدوم ہو جائے گی۔ جائیدادوں اور ان کے "اصلی اور نقلی" وارثوں کے قضیئے مفقود ہو جائیں گے۔ ربو اور منافع کی اکاس بیل شجر انسانیت سے اتر جائے گی۔ وہ تمام اخلاقی جرائم جو افلاس کی بنا پر سرزد ہوتے ہیں، خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ اور وہ تمام فسادات جو دولت کی زیادتی سے پیدا ہوتے ہیں، مٹ جائیں گے۔ نشۂ قوت کی بدمستیاں کافور ہو جائیں گی اور محکومیت و زیردستی کا پیدا شدہ جذام نابود ہو جائے گا۔ گھروں کے اندر سکون و اطمینان کی جنت ابھر آئے گی۔ بازاروں میں اعتماد اور بھروسہ کی تسکین بخش فضا عام ہو جائے گی۔ کاروبار میں دیانت اور امانت کی فردوس آفریں طمانیت نکھر کر سامنے آجائے گی ہر فرد معاشرہ قوانین خداوندی کی اطاعت کا سودا سر میں اور دیگر افراد انسانیہ کی بہبودی اور خیرسگالی کا جذبہ دل میں لئے ہو گا۔ اور اس طرح یہ ساری زمین جنت بداماں ہو جائے گی۔

یاد رکھئے! یہ محض ایک شاعر کا حسین تخیل اور ایک تصوراتی کا سنہرا خواب نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے جو واقعہ ہو کر رہے گی۔ یہ ایک انقلاب ہے جو برپا ہو کر رہے گا۔

اے خنک قومے کہ..... زمانہ کی آنکھیں اُبھر اُبھر کر دیکھ رہی ہیں کہ وہ خوش بخت قوم کونسی ہے جس کے ہاتھوں قرآن کا یہ انقلاب ظہور میں آئے گا اور دنیا میں خدا کا نظامِ ربوبیتِ عامہ عملاً قائم ہو جائے گا۔ یہی وہ قوم ہو گی جس کے حصے میں تمام نوعِ انسان کی امامت آئے گی اور جو عالمگیر انسانیت کو اُس جنت کی طرف لے جائے گی۔ جس کے لئے جنت سے نکلا ہوا آدم اس قدر مضطرب اور پریشان ہے۔ اور جو انسانی آرزوؤں کی منتہیٰ اور کاروانِ انسانیت کی منزلِ حُسنیٰ ہے۔

طُوبیٰ لَهُمْ وَحُسْنُ مَآبٍ (۱۳/۲۹)